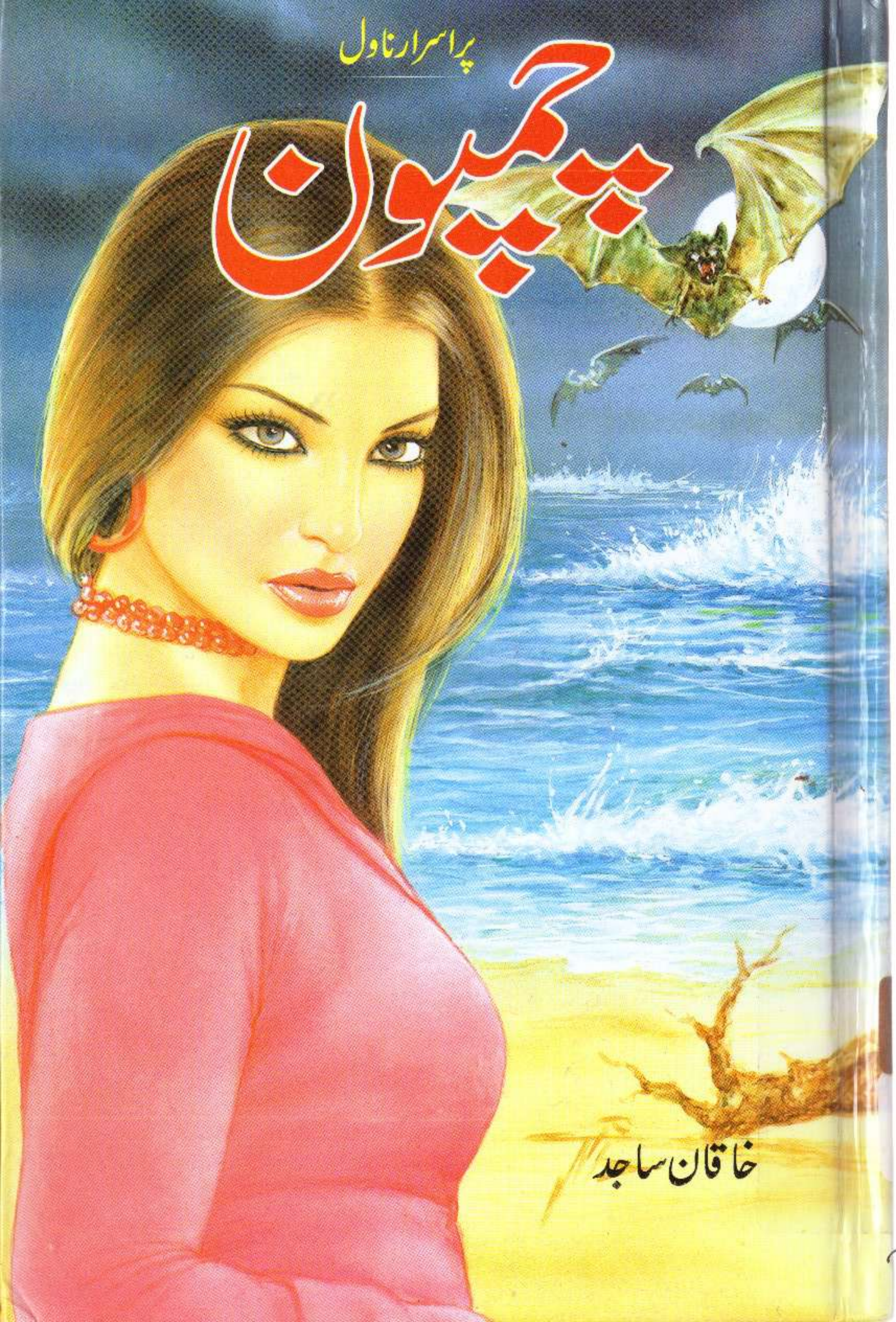


پراسرارناول

# چمکیوں



خاقان ساجد



# چپوون

خاقان ساجد

ہبوط آدم سے کہانی سننا، کہانی بننا انسان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کارواں سراؤں، کتھامنڈلیوں اور دادیوں نانیوں کی محافل سے یہ روایت کتابوں اور ویڈیو ڈیز تک آ پہنچی ہے۔ ماورائی طاقتوں اور مافوق الفطرت کرداروں پر مبنی کہانیاں شائقین کو ہمیشہ مرغوب رہی ہیں۔ سبب واضح ہے۔ انسان اپنی تشنہ خواہشوں اور محرومیوں کو لاشعوری طور پر کسی پراسرار طاقت کے توسط سے حاصل کرنے کے خواب دیکھتا آیا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد ”طلسم ہوشربا“ کے جنوں بھوتوں کے اسیر تھے۔ اب کنگ کنگ، سپر مین، سپائیڈر مین اور ہیری پوٹرز کے کرداروں کا سکھ چلتا ہے۔

ہمارے یہاں ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی پراسرار داستانیں انکا، اقبال، صدیوں کا بیٹا، کالا جادو، خالی گھر اور دیوتا عوام میں از حد مقبول ہوئیں مگر سقہ بند ادباء نے انہیں درخور اعتناء نہ جانا۔ اس نوع کی کہانیاں ہمارے یہاں عرصہ ہوا دائرۂ ادب سے خارج کر دی گئی ہیں۔ ہمارے ادبی کرتا دھرتا امریکی کہانی کا رائیڈ گراہیلن پوکو بہت بڑا ادیب مانتے ہیں۔ جدید افسانے کا یہ بانی محض خوف ناک اور پراسرار کہانیاں ہی لکھتا تھا۔ فرانس کے شہرہ آفاق کہانی کار موپاساں نے بھی ان گنت پراسرار کہانیاں تخلیق کیں۔ اسٹیفن کنگ، امریکہ کے میٹ سیلر ناول نگار کو اس کے اسرار آگیں اور خوف ناک ناولوں اور کہانیوں کے بل بوتے پر عظیم اور بے بدل ادیب مانا جا رہا ہے۔ ہیری پوٹرز کی مصنفہ جے کے رولنگ کو عالمی سطح پر قابل رشک عزت و شہرت نصیب ہوئی۔ اس پردھن دولت کی ایسی بارش ہوئی جس کا کوئی بھی کہانی کار بس خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ وہ لوگ میڈیا پر اجارہ داری اور اپنے لوگوں کو پروجیکٹ کرنے کی روش پر چل رہے ہیں۔ ادھر یہ حالت ہے کہ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچی جا رہی ہیں۔ ہمارے یہاں ہمت افزائی کا قرینہ کم، حوصلہ شکنی کی خوام عام ہے۔ آج تک ادبی حلقوں نے ایشیا کے بلاشبہ سب سے بڑے ناول نگار ابن صفی کو باقاعدہ ادیب تسلیم نہیں کیا۔ محض اس لیے کہ وہ ڈائجسٹوں میں لکھتے تھے کسی ادبی گروہ سے وابستہ نہ تھے۔ ”صدیوں کا بیٹا“ کا خالق اور سینکڑوں کتابوں کا مصنف ایم۔ اے راحت ان کے کاغذوں میں کسی شمار قطار ہی میں نہیں۔ ”انکا“ اور ”اقبال“ لکھنے والا انوار صدیقی..... اگر یہ شخص امریکہ یا یورپ میں ہوتا تو اسٹیفن کنگ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوتا۔ تلخ نوائی مقصود نہیں، عرض یہ کرنا ہے کہ ادب کو لگے بندھے موضوعات اور دائروں میں مقید کر دینے کی روش نے ہمیں اس حال کو پہنچایا ہے۔ ادبی پرچے مسلسل بند ہو رہے ہیں اور اہل ادب کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اپنی اور

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے لیکن حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ آج کا قاری جو کیبل اور انٹرنیٹ سے استفادہ کرتا ہے بے حد باشعور ہو چکا ہے۔ وہ اپنے فیصلے خود صادر کرتا ہے اور رد و قبول کی کسوٹی اپنے پاس رکھتا ہے۔

”چمپون“..... یہ پراسرار سرگزشت جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، ایک نوجوان کی زندگی کا بھیا نک باب ہے جسے ایک ماورائی ہستی سے سابقہ پڑا۔ بلاشبہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی داستان نہیں ہے۔ ایسی پراسرار کہانیاں ہمارے معروف ڈائجسٹوں میں شائع ہوتی رہی ہیں اب بھی ہو رہی ہیں۔ ایسی طرزِ فغان کبھی شاذ ہی ایجاد ہوتی ہے کہ اس جیسی کوئی آواز شش جہات عالم میں پھر نہ چمکے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اپنی طرز کی کہانیوں میں یہ ایک الگ سحر آفریں اور دل نشیں تحریر ہے۔ یہ دعویٰ ہمارا نہیں کہ یہاں تو جبین نیاز بہ صد عجز و انکسار جھکی ہوئی ہے۔ یہ ان لالہ رُخوں کا فیصلہ ہے جن کے سامنے اطلس و حریر کے تھان کے تھان کھلتے جائیں تو کسی ایک آدھ شے کو دیکھ کر ہی ان کی غزالی آنکھوں میں چمک اور مرمریں ہاتھوں میں لپک پیدا ہوتی ہے۔

یہ خونچکاں سرگزشت اوائل ۱۹۹۶ء میں لاہور کے ایک ڈائجسٹ کے لیے لکھنا شروع کی تھی مگر بوجہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ بعد ازاں اعجاز احمد نواب کے مسٹر میگزین میں ۲۰۰۳ء-۲۰۰۱ء کے دورانیے میں سلسلہ وار شائع ہوئی اور اب خاصی تاخیر سے کتابی شکل میں سامنے آئی ہے۔ تاخیر کے اسباب شمار کرتے ہوئے احقر کی تساہل پسندی سرفہرست رکھی جائے۔

جن دنوں اس کہانی کے مسودے کی نوک پلک درست کی جا رہی تھی، چمپون کے عشاق کی بے شمار ای میلز اور فون کا لز موصول ہوئیں جس میں باقاعدہ ناراضی کا اظہار کیا گیا کہ تاخیر کا ارتکاب کر کے دانستہ ان کے صبر کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ دوستو! یہ فقیر محبت کرنے والوں کا امتحان لینے کا ہرگز قائل نہیں۔ مگر کیا یہ بھی سچ نہیں کہ محبوب کا التفات ارزاں ہو جائے تو عشق میں بھی شوریدہ سری کی وہ کیفیت ہرگز نہیں ہوتی۔ عشق کی کونپلیں بھی وہیں پھوٹی ہیں جہاں زمین سخت اور موسم نامہربان ہو۔ بہر کیف انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ وہ سر لپا ناز عروسہ دل نواز جس کے آپ شدت سے منتظر تھے اب آپ کے سامنے ہے۔ دست شوق بڑھائیے اور گھونگھٹ الٹ دیجئے۔ میں رخصت لیتا ہوں۔

بہ خلوص فراواں

خاقان ساجد

15 مارچ 2007ء

راولپنڈی



وہ پورن ماشی کی رات تھی اور سمندر کی بھری ہوئی موجوں کا نظارہ کرنے میں اس رات خلاف معمول ایک سنسان ساحل کی طرف نکل گیا تھا۔

چودھویں کی رات ساحل پر جانا میرا معمول تھا۔ یہ عادت دادا جان مرحوم سے مجھے ورثے میں ملی تھی۔ جب میں چھوٹا تھا تو وہ مجھے اکثر اپنے ساتھ سمندر کی سیر پر لے جایا کرتے تھے۔ اس رات آندھی آئے یا طوفان، وہ سمندر کا رخ ضرور کرتے تھے۔ میں ان سے بہت مانوس تھا اور بچپن میں بلا کا ضدی بھی تھا۔ وہ جو نہی باہر نکلنے کا ارادہ کرتے میں بھی ان کے ساتھ ہولیتا۔ دادی جان نہ جانے کیوں مجھے ساتھ جانے سے روکتی تھیں۔ مگر میں بری طرح رونے اور پچھاڑیں کھانے لگتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ مجبور اور بے بس ہو کر دادا جان کی طرف دیکھتیں اور کہتیں۔

”رئیس احمد کیوں اس بچے کو جانتے بوجھتے آگ میں دھکیلتے ہو؟ کیوں اس کی زندگی خراب کرنے کے درپے ہو؟ تم تو سب کچھ جانتے ہو!“

میں دادی جان کی ان باتوں کا کبھی کوئی مفہوم نہ سمجھ سکا تھا۔ میرے لئے یہ باتیں بالکل لایعنی تھیں۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے دادا جان کی طرف دیکھتا تو ان کے ہونٹوں پر ایک بھٹی مسکراہٹ دکھائی دیتی۔ وہ عجیب پراسرار نظروں سے دادی جان کی طرف دیکھتے اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کے مجھے ساتھ لئے پورچ میں آجاتے جہاں ہمارا خاندانی ڈرائیور مضو چا چا گاڑی اشارت کئے ہمارا منتظر ہوتا۔

یہ معمول کئی برس جاری رہا۔ جب دادا جان انتقال فرما گئے تو میں نے یہ مشغلہ ترک کر دیا۔ میری عمر اس وقت صرف دس برس تھی۔ اتنی کم عمری میں اکیلے سمندر کی سیر کو جانا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ پھر جب میں بڑا ہو گیا اور کالج جانے لگا تو یہ شوق میرے اندر پھر عود کر آیا۔ اب میں خود گاڑی چلا سکتا تھا اور جہاں جی چاہے آ جاسکتا تھا۔

ممکن ہے میری اس عادت کو معمولی سمجھ کر آپ کوئی اہمیت نہ دیں کیونکہ سمندر کے کنارے چاند کا نظارہ کرنا ایک عام بات ہے۔ لیکن جب کوئی شوق حد اعتدال سے متجاوز ہو کر جنون کی شکل اختیار کر



حقیقت یہ ہے کہ سمندر اور چاند سے مجھے عشق تھا۔ خصوصاً جب پورا چاند طلوع ہوتا اور اس کی ٹھنڈی اور فرحت بخش کرنیں میری آنکھوں میں اترتیں اور میرے وجود سے ٹکراتیں تو مجھ پر ایک دیوانگی سی طاری ہو جاتی تھی۔ میرا حال سمندر کی ان پھری ہوئی موجوں جیسا ہو جاتا جو پورے چاند کو دیکھتے ہی کسی وحشیانہ جذبے سے مغلوب ہو کر ساحل سے سر پٹنے لگتی ہیں۔ سمندر کی لہروں چاند کی کرنوں اور میرے وجود کے درمیان یہ جو عجیب سا رشتہ تھا میں اسے کبھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

میں نے چاند اور چڑھتے ہوئے سمندر کی بے تاب موجوں سے اپنے والہانہ عشق کا ذکر کیا ہے۔ آپ کو یہ دیوانگی عجیب لگتی ہوگی۔ مگر اس سے عجیب تر بات تھی کہ مجھے ہر چاند چہرے اور ہر چڑھتی ہوئی جوانی کی بے تاب اداؤں سے بھی ایسا ہی عشق تھا۔ حسن مجھے کسی مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتا تھا۔

میں جس دور کا ذکر کر رہا ہوں وہ میرے عین شباب کے دن تھے۔ ان دنوں حسین چہروں کا تعاقب اور مہوشوں کے مرمیوں کا طواف میرا واحد مقصد حیات تھا۔ میں نازک اندام شوخ و شنگ اور جمال پیکر دوشیزاؤں سے دوستیاں گانٹھتا اور ان کے معطر جسموں سے حظ اٹھاتا تھا۔ میں ایک بھنورا تھا جسے شاخ شاخ گھومنے، ہر چمن اور گلستان کی سیر کرنے اور کلی کلی غنچے غنچے کا رس چوسنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ میں نے کتنی کلیوں کو روندنا مجھے کچھ یاد نہیں۔ کتنے گلزار بدن میری آغوش سے آسودہ ہوئے کوئی شمار نہیں۔

اپنی داستان سنانے سے پہلے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ سے اپنا مختصر تعارف کروادوں۔ میرا نام محبوب احمد خان ہے۔ میرے والد نذیر احمد خان کراچی کے ایک امیر کبیر تاجر تھے۔ جبکہ آباء کا تعلق ممبئی سے ہے۔ تقسیم کے بعد دادا جان نے اپنے دو بیٹوں نذیر احمد خان اور منیر احمد خان کے ہمراہ ہجرت کی اور کراچی میں آ بسے۔ منیر احمد خان ان کے بڑے بیٹے تھے۔ ہجرت کے وقت میرے ابو اور تایا جان دونوں شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے۔ تایا جان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی جن کے نام بالترتیب رفیق احمد، شفیق احمد اور ناہید تھے۔ جبکہ ہم دو بہن بھائی تھے، یعنی میں اور میری چھوٹی بہن نوشین۔ بعد میں ہماری دو بہنیں اور ایک بھائی یہاں پاکستان میں پیدا ہوئے جن کے نام مہرین، عنبرین اور تو صیف رکھے گئے۔ ہم سب لوگ کراچی صدر میں ایک بڑی سی کوٹھی میں رہتے تھے جو دادا جان کو کلیم میں الاٹ ہوئی تھی۔

ممبئی میں دادا جان اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ یہاں آ کر بھی انہوں نے یہی کاروبار شروع کر دیا جو تھوڑے ہی عرصے میں چل نکلا۔ دو چار برسوں ہی میں وہ ایک

کے بعد تایا جان کے دونوں بیٹے بھی اس کاروبار میں شریک ہو گئے۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہم لوگ بہت مالدار تھے اور گھر میں دولت کی فراوانی تھی۔ دولت کی مثال ندی کے پانی سے دی جاسکتی ہے۔ جو خود بخود بہاؤ کے راستے تلاش کر لیتا ہے۔ ہمارے گھرانے میں بھی دولت کے پانی نے بہاؤ کے کئی راستے تلاش کر لئے تھے اور اس معاملے میں ہر فرد کا انداز جدا گانہ تھا۔

دادی جان نے ایک چلتا پھرتا خیراتی ادارہ کھول رکھا تھا۔ وہ غریبوں اور ناداروں کی مدد کرتیں اور یتیم بچیوں کی شادیاں کرتی تھیں۔ تائی جان اور امی جان پارٹیوں کا اہتمام کرتیں اور سوشل ورک میں مصروف رہتیں۔ تایا جان، ابو اور میرے دنوں کزن کلب جاتے، ادبی و ثقافتی تقریبات کو سپانسر کرتے اور کاروباری ڈنر دیتے۔ جبکہ ناہید، نوشین، مہرین، اور عنبرین نئے نئے ملبوسات بنواتیں، خوشبویات اور بناؤ سنگھار کے سامان خریدتیں، گھر سجانے سنوارنے میں لگتی رہتیں یا پارٹیاں اور فنکشنز منعقد کرتیں اور سہیلیوں کو تحفے تحائف دیتی رہتیں۔ رہا میں تو میرے جوشوق تھے ان کے متعلق آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔

میں ان دنوں بہت صحت مند اور خوبرونو جوان تھا۔ قد اونچا تھا، جسم متناسب اور رنگ سرخی مائل سفید۔ چہرے پر دلکشی اور وقار تھا، جیسا کہ آسودہ حال گھرانوں کے نوجوانوں کے چہروں پر ہوتا ہے۔ مزاج میں شگفتگی تھی اور طبیعت میں بے فکری۔ بے دریغ پیسہ خرچ کرتا تھا اور یاروں کا یار تھا۔ خصوصاً لڑکیوں کے ساتھ میرا برتاؤ خسروانہ تھا۔ جس سوسائٹی کی لڑکیوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان کی اکثریت عادات و اطوار اور اقدار و کردار کے لحاظ سے متوسط گھرانوں کی شریف النفس لڑکیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ حرص و ہوا کی بندیاں ہوتی ہیں۔ کسی اچھے سے ریسٹوران کے رومان پرور ماحول میں ڈنر، چمکتی ہوئی شاندار گاڑی میں ایک لمبی ڈرائیو اور کسی مہنگے ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے ایک دو قیمتی تحائف۔ اس کے بعد وہ پکے ہوئے آم کی طرح مرد کی جھولی میں آ گرتی ہیں۔ چونکہ میں با آسانی یہ اہتمام کر سکتا تھا اس لئے میری جھولی ان آموں سے بھری رہتی تھی!

میں بی اے کا اسٹوڈنٹ تھا اور ایک مقامی کالج میں پڑھتا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ درجے کا کالج تھا اور اس میں مخلوط تعلیم تھی۔ اپنی رنگین مزاجی کی بدولت میں یہاں پڑھتا تو کم ہی تھا البتہ دیگر مصروفیات بہت تھیں۔ میں نے درجن بھر حسین اور آزاد خیال لڑکیوں سے دوستی گانٹھ رکھی تھی جو شاموں کو طے شدہ مقامات پر مجھ سے ملتی تھیں۔ ابو کو میری ان مصروفیات کی کچھ نہ کچھ خبر ضرور تھی۔ غالباً دادی جان انہیں میری رات گئے تک گھر سے غائب رہنے کی عادت کی جانب متوجہ کر چکی تھیں چنانچہ ایک دو مرتبہ انہوں نے امی سے کہا تھا۔



سے گھر آنے لگے ہیں!“

جواب میں امی نے انہیں نرمی سے ٹالتے ہوئے کہا تھا۔

”ارے چھوڑیے بھی، میرا بوبی تو ابھی بچہ ہے۔ یہی تو دن ہیں اس کے کھیلنے کودنے کے۔ بی اے کر لے تو پھر اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لیجئے گا۔ خود ہی سدھر جائے گا۔“

اور میں نے امی کی یہ بات سن کر دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ کم از کم اگلے پانچ سال تک بی اے کا امتحان پاس نہیں کروں گا!

یوں زندگی کیف و نشاط اور مسرت و انبساط میں گزر رہی تھی کہ میری زندگی میں وہ رات آئی جس کے بعد میں پے در پے مسائل و حوادث کے گرداب میں پھنس کر رہ گیا۔

آئیے اب میں اس رات کے واقعے سے اپنی کہانی کا آغاز کرتا ہوں۔

وہ پورن ماشی کی رات تھی اور میں خلاف معمول ایک ویران سے ساحلی علاقے کی طرف نکل آیا تھا۔ عام طور پر میں کلفٹن کی طرف جایا کرتا تھا جہاں اس وقت خاصی رونق ہوتی تھی۔ طبعیتاً مجھے یہ رونق میلہ پسند تھا۔ خصوصاً رنگ برنگی چمکدار گاڑیوں میں بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکیاں، ان کے ٹھنڈی ہوا میں لہراتے آنچل، مہکتی زلفیں، کھلتی چوڑیاں اور نفرتی قہقہے میرے دل میں ایک تلاطم برپا کر دیتے تھے۔ میں اس دلکش نظارے میں کھوسا جاتا تھا۔ اس عالم میں بسا اوقات میں اپنے پہلو میں موجود اس گل پیر ہن اور خوش ادا و شیزہ کو بھی بھول جاتا تھا جو اس شام میرے ساتھ ہوتی۔ میری کیفیت اس وقت بالکل اس بچے جیسی ہو جاتی تھی جو کھلونوں کی دکان میں جا گھسا ہوا اور پچھی پھٹی، لپجائی ہوئی نظروں سے کبھی ایک کھلونے کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہو اور کبھی دوسرے کی طرف۔ لیکن آج عجیب بات تھی کہ میں کلفٹن جانے کی بجائے بے اختیار اس ویران ساحل کی طرف چلا آیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ طاقت مجھے از خود اس طرف کھینچ لائی ہے۔ ایک اور انہونی یہ تھی کہ میں تنہا تھا۔ آج رات میرے پہلو میں کوئی خوبصورت و شیزہ نہیں تھی۔

میں نے گاڑی ساحل سے کچھ دور کھڑی کر دی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ریتلے ساحل پر آ گیا۔

ٹھنڈی، خوش گوار ہوا چل رہی تھی اور سامنے سمندر کی سطح سے پورا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔ سمندر پر عجیب ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ بھری ہوئی موجیں شور مچاتی، جھاگ اڑاتی، بیتابی سے آسمان کی جانب بلند ہوتیں اور پھر اپنے ہی زور سے تھپڑوں کی صورت میں سطح آب سے ٹکرا جاتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے محبوب پورنما سے ہم آغوش نہ ہو سکنے پر سینہ کو بی کر رہی ہوں۔ پھر یہ لہریں اسی رو میں بہتی ہوئی ساحلی چٹانوں کا رخ کرتیں اور ان سے ایک مہیب آواز

میرے دل کی کیفیت بھی اس وقت سمندر سے مختلف نہیں تھی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھا سحر زدہ اور مہبوت ہو کر چاند اور سمندر کی لہروں کا یہ ابدی کھیل دیکھ رہا تھا۔ میں کتنی دیر عالم بے خودی میں یہ فرحت اثر نظارہ دیکھتا رہا اور جب رات بھگنے لگی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جواب تک لطف دے رہے تھے بدن میں کپکپاہٹ پیدا کرنے لگے تو مجھے واپسی کا خیال آیا۔

میں گیلی ریت پر آہستگی سے قدم رکھتا گاڑی کی طرف قدم بڑھا رہا تھا کہ دفعتاً پچاس ساٹھ گز دور لب ساحل مجھے کسی انسانی وجود کا احساس ہوا۔ کوئی ساحل کی ریت پر بے سدھ پڑا تھا۔

میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ ہر طرف ویرانی تھی اور دور دور تک کسی آدم زاد کا نام و نشان تک نہ تھا۔ میں کئی گھنٹے سے وہاں بیٹھا تھا اور اس دوران آس پاس کسی بشر کا سایہ تک نہ دیکھا تھا۔ پھر بھلا مجھ سے اس قدر قریب یہ انسانی وجود اچانک کہاں سے نمودار ہو گیا تھا؟ اتنی رات گئے اس ویران ساحل پر اپنے علاوہ کسی دوسرے وجود کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خوف کی ایک سرد لہر پورے وجود میں دوڑ گئی۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی مگر ریت نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ میں نے چیخنا چاہا مگر میری آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔ لمحہ بھر کے لئے میں بالکل مفلوج ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ انسانی وجود بالکل بے حس و حرکت ہے۔ تب میرے ذہن میں خیال آیا کہ وہ جو کوئی بھی ہے ممکن ہے حادثاتی طور پر سمندر میں گر گیا ہو اور وحشی لہروں نے اسے لاکر یہاں ساحل کی ریت پر پھینک دیا ہو۔ ممکن ہے وہ ابھی زندہ ہو۔ مجھے اس کی مدد کرنی چاہئے۔ یہ خیال ایک کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ایک پری چہرہ نرم و نازک و شیزہ تھی جو ساحل کی ریت پر بے ہوش پڑی تھی!

میں گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے زندگی میں بہت حسن دیکھا تھا۔ ہر رنگ اور ہر روپ کی حسیناؤں کے جمال کا نظارہ کیا تھا، مگر ایسا حسن ایسی جوانی اور ایسی من موہنی صورت آج تک نہیں دیکھی تھی۔ چاند اس وقت پورے جوہن پر تھا جس کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کا جسم سونے کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا جسے ابھی ابھی بھٹی سے نکالا گیا ہو۔ میں سحر زدہ اور مہبوت ہو کر اس کا سراپا دیکھنے لگا۔ اس کی عمر بیس بائیس برس ہوگی۔ اس کے جسم پر ایک مہین میکسی نما لبادہ تھا جو بھیگ کر اس کے بدن سے چپک گیا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے لمبے سیاہ بال گیلے ہو کر اس کی صراحی دار گردن اور خوبصورت جسم سے چپک گئے تھے اور ان میں پانی اور ریت کے ننھے ننھے ذرے اٹکے ہوئے تھے۔

اس لڑکی کو دیکھ کر مجھ پر عجیب سے احساسات طاری ہو گئے۔ یوں لگا جیسے سپنے میں کوئی شے تڑپنے لگی ہو۔ جی چاہا اسے اسی وقت اٹھا کر گھر لے جاؤں اور شیشے کی اس الماری میں سجادوں جہاں کرٹل



وہ دیورین پیں رہے ہوں۔ اس نے اس کی نبض ٹولی۔ وہ بہت آہستہ چل رہی تھی۔ سانس بھی بہت سست روی سے جاری تھا۔ جسم کو ہاتھ لگایا تو وہ برف کی طرح سرد تھا۔ وہ بری طرح بھیگی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ سمندر کے پانی میں گھنٹوں رہی ہے اور پھر لہروں نے اسے ساحل پر لا پھینکا ہے۔ اگر میرا اندازہ درست تھا تو اس کا زندہ بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا میں نے اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کے پیٹ میں پانی چلا گیا ہے۔

میں کلب میں اکثر سوئمنگ کرنے جاتا تھا اور میں نے سوئمنگ پول کے محافظ سے کسی ڈوبنے والے شخص کے جسم سے پانی نکالنے اور اس کے نظام تنفس کو بحال کرنے کا طریقہ سیکھ رکھا تھا۔ میں نے بجلت اس طریقے پر عمل کیا اور اسے الٹا لٹا کر اس کے پیٹ کے نیچے اپنا دایاں گھٹنا رکھ کر اس کی کمر پر اپنے جسم کا پورا دباؤ ڈالا۔ اس کے منہ سے پانی ایک فوارے کی شکل میں ابل کر باہر آ گیا۔ ایک دودھ جی بھی عمل دہرانے سے جب میری تسلی ہو گئی کہ اب اس کے جسم سے پانی نکل چکا ہے تو میں نے اسے سیدھا کر کے اس کا سراپے زانو پر رکھا اور اس کے منہ پر اپنا منہ رکھ کر اس کا تنفس بحال کرنے لگا۔ کسی لڑکی کے بدن کو چھونا میرے لئے کوئی انوکھا تجربہ ہرگز نہ تھا۔ نہ ہی کسی کے ہونٹوں کا لمس کوئی نئی بات تھی۔ مگر اس لڑکی کو چھوتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ مس کرتے ہوئے مجھ پر نہ جانے کیوں کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں اس کا پاکیزہ اور نرم و نازک بدن چھو کر کوئی بہت بڑا جرم اور گناہ کر رہا ہوں۔

میری تنفس بحال کرنے کی کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ اس نے کچھ دیر بعد ایک گہری سانس لی اور پھر اس کا نظام تنفس معمول پر آ گیا۔ میں نے اب اس کے پاؤں کے تلوے اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں تیزی سے ملنی شروع کیں۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ ریت بہت ٹھنڈی ہے فضا میں بھی خنکی ہے اور اس کا بدن بھی بری طرح بھیگا ہوا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ میں اسے اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤں۔ گھر میں ضرورت کی ہر شے تھی اور پھر ہمارے ساتھ والی کوٹھی میں امی کی سہیلی ڈاکٹر فرزانہ رہائش پذیر تھیں۔ بوقت ضرورت انہیں بلوایا جاسکتا تھا۔

یہ سوچ کر میں نے اس کے نرم و نازک جسم کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھالیا اور اسے گاڑی تک لایا۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر میں نے احتیاط سے اسے پچھلی نشست پر لٹا دیا اور پھر نہایت تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اڑھائی بجے کا وقت تھا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں کہیں کہیں سڑک کنارے بنی ہوئی دکانوں کے سامنے پٹھان چوکیدار ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ٹارچیں لئے گھوم رہے تھے اور پتھر اٹھا کر ان کتوں کو بھگا رہے تھے جو بند ہوٹلوں کے باہر چوڑی ہوئی ہڈیوں پر آپس میں لڑ مر

تقریباً بیس منٹ کے بعد میں اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے تھا۔ گیٹ بند تھا۔ میں نے ہارن بجایا تو کچھ دیر بعد ہمارے نئے ملازم نے آنکھیں ملتے ہوئے گیٹ کھولا۔ مجھے گاڑی ڈرائیو سے پر ہی کھڑی کرنا پڑی کیونکہ آگے پورچ میں تایا جان اور ابو کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

میں نے گاڑی سے نکل کر تھوڑی دیر انتظار کیا تا کہ ملازم گیٹ بند کر کے اپنے کوارٹر میں چلا جائے جو کوٹھی کی پچھلی جانب واقع تھا۔ مجھے گاڑی سے ایک اجنبی بے ہوش لڑکی نکالتے دیکھ کر وہ کسی شے میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی نوکروں کو ہر بات آس پڑوس کے گھروں کے ملازموں سے کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ فی الحال یہ بات گھر تک ہی محدود رہے۔

جب وہ کوٹھی کے عقبی حصے میں چلا گیا تو میں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اس پری پیکر کو دیکھا۔ وہ اسی طرح بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر گھر کے اندر لے جانے کا ارادہ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ دروازہ بند کر کے میں اگلی دو گاڑیوں کے پاس سے گذر کر گھر کے صدر دروازے تک آیا۔ اس پر ذرا سادہ باؤ ڈالا تو اسے کھلا ہوا پایا۔

اندر لاؤنج میں ہلکی سی روشنی تھی میں نے اوپر جانے کے لئے زینے کا رخ کیا ہی تھا کہ کسی نے ہولے سے کھنکھار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ میرا دل یکدم زور سے سے دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ نوشین تھی میری بہن۔ میں نے اسے دیکھ کر ایک گہری سانس لی اور پھر اس کی نیند سے بوجھل آنکھوں کو دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”نوشی تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟ کیا سوئی نہیں؟“

”نہیں.....“ اس نے مختصر جواب دیا

”کیوں؟“

”نیند کیسے آئے؟ جب تم تین تین بجے تک گھر سے غائب رہو گے تو ہمیں کیسے نیند آئے گی؟“ اس کی آنکھوں کے گوشے بھینکنے لگے۔

”آئی ایم سوری نوشی“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہوں گا۔ تم پلیز یہ رونا بند کرو۔“

”نہیں میں روتی نہیں رہی۔“ اس نے اپنی آنکھیں دوپٹے سے پونچھیں۔ ”دراصل امی بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ ابو آج تمہاری وجہ سے ان سے بہت خفا ہوئے ہیں۔“

”امی کدھر ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اوپر کمرے میں ہیں۔ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔“ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر



اس کی نظر میری جینز کے گھٹنوں پر پڑی تو وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

”بوی تمہارے گھٹنوں پر یہ ریت اور کچڑ کے نشان کیسے ہیں؟ اور یہ تمہارے شوز بھی اتنے گندے ہو رہے ہیں کیوں؟“

”میں آج سمندر پر گیا تھا نوشی۔“ میں نے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”لیٹ بھی اسی لئے آیا ہوں کہ وہاں ایک مسئلہ ہو گیا تھا۔“

”مسئلہ؟ کیسا مسئلہ؟“ وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔

میں نے اسے ساحل سمندر پر پیش آنے والے واقعہ سے آگاہ کیا۔ جب اسے یہ پتہ چلا کہ وہ لڑکی باہر گاڑی میں بے ہوش پڑی ہے تو وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ اس کے انداز میں جوش تھا اور کسی انجانے جذبے کے زیر اثر اس کا چہرہ متمنا لگا تھا۔

”تم نے آج بہت نیکی کا کام کیا ہے بوی۔ جانتے ہو ایک انسان کی جان بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے؟“

میں حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ مجھے سے تین سال چھوٹی تھی اور فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔ میں اسے چوڑیوں، کھسوں اور کڑھائی والے سندھی لباسوں کی شوقین ایک کھلنڈری لا پروا اور ناسمجھ لڑکی سمجھتا تھا جسے زندگی کے سنجیدہ موضوعات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر اب محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تو بہت دانائی کی باتیں کرنے لگی ہے۔ میں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تو اس نے آگے بڑھ کر گاڑی کی اندرونی لائٹ جلائی اور تجسس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر پیچھے ہٹ کر بولی۔

”ہائے اللہ بوی بھائی! یہ تو کوئی حور معلوم ہوتی ہے! ضرور کسی اعلیٰ گھرانے کی ہے۔“ پھر قدرے رک کر اس نے شوخی سے کہا۔ ”بوی بھائی جیسے فلموں میں ہوتا ہے کہ ہیرو ہیروئن کو ڈوبنے سے بچاتا ہے تو بعد میں ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ تو کیا یہ ہماری بھابھی بن سکتی؟ ایمان سے میں نے اپنے لئے ہمیشہ ایسے ہی بھابھی کے خواب دیکھے ہیں۔“

”ارے ہٹو۔ آگئیں فوراً اپنی اوقات پر!“ میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ”ابھی حکیم لقمان بنی ہوئی تھیں اور دو منٹ بعد ہی اتر آئیں دانش و حکمت کی سیڑھی سے! پہلے اسے اندر لے چلو اس کی مالش والش کرو کچھ کھلاؤ پلاؤ پھر بنا لینا بھابھی بھی!“

”اچھا میں اپنا کمرہ ٹھیک کرتی ہوں اور امی کو بلاتی ہوں تم اسے اٹھا کر اوپر لے آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ واپس بھاگی۔

”ٹھہرو!“ میں نے اسے روکا۔ ”اوپر ڈھنڈورانہ پیٹ دینا۔ امی کے علاوہ کسی کو پتہ نہ چلے خاص طور پر ابو کو خبر نہیں ہونی چاہیے ورنہ سخت گڑبڑ ہو جائے گی۔“

”گڑبڑ؟ کیسی گڑبڑ؟“ اس نے بھنویں اچکائیں۔ ”کیا ابو ہمیں ایک معصوم اور مصیبت زدہ لڑکی کی مدد سے روک دیں گے؟“

”اوہو ایک تو تم فضول بحث میں بڑا وقت ضائع کرتی ہو۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ ”اب جاؤ بھی۔“ وہ اندر بھاگ گئی۔

میں نے کچھ دیر انتظار کے بعد اسے بازوؤں میں اٹھالیا۔ وہ تھوڑا سا کسمسائی۔ میرا دل ڈولنے لگا۔ وہ پھولوں سے زیادہ نازک اور خوشبو سے زیادہ لطیف تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے پھولوں کی ایک نازک سی ٹوکری اٹھا رکھی ہے۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی اور ایک عجیب سا سکون جیسا منزل پر پہنچنے کسی مسافر کے چہرے پر ہوتا ہے۔ لمحہ بھر کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے میرے لئے بنایا گیا ہے۔ دل نے کہا۔ ”یہ پرستان میں کہیں پیدا ہوئی ہوگی اور وہاں پھولوں رنگوں اور تلیوں کے درمیان اس نے تیرے تصور میں روز و شب گزارے ہوں گے۔ اسے ایک روز تمہارے پاس آنا تھا اور آج سمندر کی لہروں کے دوش پر سفر کرتی یہ تجھ تک پہنچ گئی ہے اب اسے کبھی خود سے جدا نہ کرنا۔“

میں نے عشق و محبت پر کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ میں ایسی باتوں کو فریب سمجھتا تھا۔ خود میرے دل میں آج تک کسی لڑکی کے لئے ایسے سچے جذبات پیدا نہیں ہوئے تھے جنہیں محبت یا عشق کا نام دیا جاسکے۔ وقتی حیوانی اور نفسانی خواہشات کا محبت جیسے جذبے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر آج معلوم ہوا تھا کہ ایسے سچے جذبے واقعی وجود رکھتے ہیں۔ ان چند ہی ساعتوں میں مجھے سسی پنو، ہیرا، نجھا اور لیلیٰ مجنوں کے قصے ایک دم سچے اور حقیقی لگنے لگے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ فرہاد نے شیریں کے لئے سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر دودھ کی نہر نکالی تھی میں یہ بات سن کر ہنسا کرتا تھا، مگر آج مجھے یہ بات صد فی صد درست محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے اپنے اندر ایک عجیب سا جذبہ بیدار ہوتے دیکھا تھا جو مجھے اس ناز پرورد و شیرہ کی خاطر پہاڑوں سے ٹکرانے کا درس دے رہا تھا!

میں اسے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے گھر میں داخل ہوا اور آہستگی سے سیڑھیاں چڑھتا، اوپر آ گیا۔ نوشین کا کمرہ کھلا ہوا تھا مگر اندر کوئی نہ تھا۔ میں نے اسے نہایت احتیاط سے بستر پر لٹا دیا۔ کمرہ خوب روشن تھا۔ میں نے اسے پوری روشنی میں دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ اس کا حسن اور رنگ و روپ ایسا تھا کہ لفظوں میں اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ میں سحر زدہ سا ہو کر بستر پر اس کے پاس بیٹھ گیا اور نمٹکی باندھ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ میں اسے دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ مجھے کمرے میں امی اور نوشین کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ میں اس وقت چونکا جب امی نے مجھے مخاطب کیا۔

”بوی!“



”جی امی!“ میں نے گڑبڑا کر کہا اور کھڑا ہو گیا۔

امی کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ بہت خفا نظر آتی تھیں۔ انہوں نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔  
”تم اب تک کہاں تھے؟“

اُن کا یہ سوال میرے لئے غیر متوقع تھا۔ میں نے پیچھے کھڑی نوشین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور امی سے کہا۔

”نوشین نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟“

”ہاں بتایا ہے مگر ضروری نہیں کہ میں اسے جوں کا توں قبول کر لوں۔“ انہوں نے تلخی سے کہا۔

”میں حیرت زدہ ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ مجھ پر شک کر رہی تھیں۔“

”آپ کیا سمجھ رہی ہیں میں نے جھوٹ بولا ہے؟“ میں نے ناراضی سے پوچھا۔ میرا لہجہ خاصا گستاخانہ ہو گیا تھا اور آواز بھی قدرے بلند تھی۔

”اونچا بولنے اور بدتمیزی کی کوئی ضرورت نہیں!“ انہوں نے مجھے گھورا۔ ”رات رات بھر گھر سے غائب رہنے والی اولاد کی نگاہیں جھکی ہوئیں اور آواز پست ہی رہے تو بہتر ہوتا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو تمہاری آوارہ گردیوں کی یہاں کسی کو کوئی خبر نہیں؟“ انہوں نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

میرے کانوں کی لویں شرم سے سرخ ہو گئیں۔ میں نے سر جھکا کر آہستگی سے کہا۔ ”امی یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ پیچھے نوشین کھڑی ہے اور کمرے میں اس وقت ایک اجنبی لڑکی موجود ہے جسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ میں اسی لئے اسے یہاں اٹھالایا تھا۔“

”ہاں ہاں شہر میں ایک تم ہی تو مسیحا ہو!“ انہوں نے بدستور غصے میں کہا۔ ”جانتے بھی ہو اس حماقت کا کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے؟ تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے یہ لڑکی کون ہے کہاں سے آئی ہے اور اس کا گھر ٹھکانہ کہاں ہے؟ کیا تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر اسے ہمارے گھر میں کچھ ہو گیا تو ہم کتنی بڑی مصیبت میں پھنس سکتے ہیں؟ کیا بعید ہے کہ اسے کسی نے کسی بری نیت سے اغوا کیا ہو اور پامال کر کے سمندر کے کنارے پھینک دیا ہو۔ کیا خبر یہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہو یا اس نے خودکشی کی کوشش کی ہو۔ یہ سب کچھ سوچا ہے تم نے؟ شکر کرو راستے میں کسی پولیس والے نے اسے تمہاری گاڑی میں بے ہوش پڑی نہیں دیکھ لیا ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔“

میں نے امی کی بات پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ عام حالات میں مجھے بلا سوچے سمجھے یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں زندگی میں اس نظریے کا قائل تھا کہ انسان کو چند کام فائدہ اور نقصان سوچے بغیر بھی کر لینے چاہئیں۔ خصوصاً جب کسی کی زندگی بچانے کا معاملہ ہو۔ میں نے امی کو منانے کے لئے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھاما اور اسے آنکھوں سے لگاتے اور چومتے ہوئے کہا۔

”امی مجھے معاف کر دیجئے۔ آپ جو کہہ رہی ہیں مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ میں نے ان پہلوؤں پر غور نہیں کیا تھا۔ مگر اب اس بے چاری کو اس ابتر حالت میں گھر لے ہی آیا ہوں تو اسے سنبھال لیں۔ آپ تو سوشل ورکر ہیں اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتی ہیں!“

انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر خفگی بھلا کر مادرانہ شفقت اور پیار سے مجھے گلے سے لگا لیا۔ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔ ”ماں باپ کو اپنی اولاد کی حماقتیں اور غلطیاں بھی بسا اوقات اون کرنی پڑتی ہیں۔ بہر حال تم فکر نہ کرو۔ اب مجھ پر چھوڑ دو۔“ پھر انہوں نے مجھے ایک طرف ہٹایا اور بولیں۔ ”اچھا ہٹو ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ کتنی حور پری ہے نوشین نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی!“

میں مسکراتے ہوئے ایک طرف ہو گیا۔ امی بستر کی جانب بڑھیں اور پھر جیسے کہیں کھو گئیں وہ اس قدر سحر زدہ ہو گئیں تھیں کہ ان کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔

”خوبصورت ہے نا؟“ نوشین نے پوچھا۔

”بہت زیادہ۔“ امی نے لب کھولے اور پھر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے گال تھپتھپانے لگیں۔  
نوٹی نے تپائی پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور امی کی طرف بڑھایا۔ امی نے پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پر ڈالے۔ میں پاس کھڑا ہو کر اس کے ہوش میں آنے کی دعائیں کرنے لگا۔ پانی کے چھینٹوں سے اس نے تھوڑی سی آنکھیں بھینچی تھیں مگر پھر اس کا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ امی نے اس کی گردن قدرے اٹھا کر پانی کا گلاس اس کے گلابی ہونٹوں سے لگایا مگر سارا پانی اس کی صراحی دار گردن پر بہہ گیا۔ امی نے ایک نظر وال کلاک پر ڈالی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ وہ گرمیوں کے دن تھے اذانیں چار بجے ہوتی تھیں اور ساڑھے چار بجے اچھی خاصی روشنی ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ میں نے اندازہ لگایا تھا وہ ڈاکٹر فرزانہ کو بلانے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ انہوں نے نوشین کو اس کا جسم دبانے اور پاؤں کے تلوے اور ہتھیلیاں ملنے کی ہدایت کی اور مجھ سے بولیں۔ ”تم جا کر کپڑے بدلوا اور آرام کرو۔ میں ڈاکٹر فرزانہ کو بلانے جا رہی ہوں۔“

”میں بلاتا ہوں۔“ میں نے ان کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے کہا۔

”نہیں تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ انہوں نے مجھے ہدایت کی اور سیڑھیوں کی طرف چل دیں۔  
میرا ارادہ واپس نوشین کے کمرے میں جانے کا تھا مگر ان کی تنبیہی نظروں نے مجھے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ کمرے میں آ کر میں نے آئینے میں اپنا حلیہ دیکھا۔ میرے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر تھکاوٹ کے نمایاں اثرات تھے۔ کپڑوں پر کچھ اور ریت محسوس ہو رہی تھی اور جلد پر پسینے اور نمک کی چپچھاہٹ تھی۔ میں نے الماری سے شلوار قمیض نکالی اور باتھ روم میں گھس گیا۔ جسم پر پانی کی



پھوار پڑی تو جیسے تھکن میل کے ساتھ بدن سے دور ہونے لگی۔ میں کتنی ہی دیر شاور کے نیچے کھڑا رہا اور جسم پر صابن ملتا رہا۔ باہر نکلا تو میں بالکل نیا آدمی تھا۔

مجھے کہیں دور سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ میرے دل میں نماز پڑھنے کا خیال آیا۔ میں نماز شاذو نادر ہی پڑھتا تھا سوائے جمعہ اور عیدین کے میں نے کبھی اپنے خالق کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ مگر اس روز اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہونے کے لئے میرا دل بے تاب ہو گیا۔ میں نے دادی جان کو گھر میں نماز پڑھتے دیکھا تھا اس لئے قبلہ کا تعین کرنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ اس روز میں نے ایک طویل نماز پڑھی اور لمبی لمبی دعائیں مانگیں۔

ڈاکٹر فرزانہ آچکی تھیں۔ میرے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے امی اور ان کے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ میں قالین سے اٹھ کر بستر پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ نیند کیسے آسکتی تھی؟ اس کا چہرہ تھا جو نظروں میں سمایا رہا۔ چھت پر بار بار اس کی شبیہ نمودار ہو جاتی تھی۔ میں بے چینی سے اٹھ بیٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پنچوں کے بل چلتا ہوا نوشین کے کمرے تک آیا۔ اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کی مگر اندر سے ملی جلی مدھم آوازیں آرہی تھیں جن سے کچھ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نہایت احتیاط سے چلتا ہوا آگے بڑھا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔

باہر لان میں صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے صبح کی ٹھنڈی ہوا میں گہرے گہرے سانس لئے۔ شبنم میں بھیکے پھولوں کی خوشبو لان کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔ لیکن میرا دل اپنے پھول اور اس کی خوشبو میں اڑکا ہوا تھا۔ کیا پتہ اس کو ہوش آگیا ہو۔ نہ جانے ہوش آنے پر اس کے تاثرات کیا ہوئے ہوں گے؟ وہ خود کو اس گھر میں اجنبی لوگوں کے درمیان دیکھ کر حیران تو ہوئی ہوگی۔ امی نے اسے ساری بات بتائی ہوگی۔ امی نے میرا ذکر بھی کیا ہوگا۔ اس نے میرے متعلق ضرور سوچا ہوگا۔ اس کے دل میں اپنے اس محسن کو دیکھنے کی خواہش ضرور پیدا ہوئی ہوگی جو اسے موت کے منہ سے واپس زندگی کی طرف کھینچ لایا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے غصہ آیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے بے زار ہو چکی ہو۔ ہر دو صورتوں میں میں اسے بتاتا کہ اسے زندہ رہنا چاہیے۔ اس جیسی پیاری لڑکی کو مرنے کوئی حق نہیں تھا۔ مجھے اس وقت اس کے پاس ہونا چاہیے تھا مگر امی! ایک تو امی کی باتوں کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔ نہ جانے ان کے دل میں کیا سمائی تھی کہ مجھے کمرے سے باہر بھیج دیا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں لان میں ٹہلتا رہا یہاں تک کہ اچھی خاصی روشنی ہو گئی۔

میں لان کے ایک کونے میں موتیے کے پھول دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر فرزانہ اور امی مجھے گھر سے باہر

تو میں ان کے پاس پہنچ گیا۔

”امی اسے ہوش آئی؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”ہاں وہ ہوش میں آگئی ہے۔ مگر ڈاکٹر نے اسے دوا پلا کر سلا دیا ہے۔ ابھی اسے آرام کی ضرورت ہے۔“

”اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا؟“

”نہیں بیٹے!“ امی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا! ”اس کی یادداشت کھو چکی ہے!“

میری زبان میں لکنت آگئی۔ ”یادداشت..... کھو چکی ہے؟“

”ہاں بیٹے!“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اب بتاؤ ہمیں اس کا آگاہ کیا کیسے معلوم ہوگا؟ ہم اسے یہاں تو رکھ نہیں سکتے۔“ انہوں نے فکر مندی سے کہا۔

”لیکن امی ہم اسے گھر سے نکال بھی تو نہیں سکتے۔ وہ یہاں سے کہاں جائے گی؟“

انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولیں۔

”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ دارالامان والوں سے رابطہ کروں گی اور پولیس کو بھی مطلع کروں گی۔ یہی مناسب راستہ ہے۔“

”لیکن امی.....“

”بحث نہیں!“ انہوں نے میری بات کاٹی۔ ”اب جا کر کچھ دیر آرام کرو اور کالج جانے کی تیاری کرو۔“

”آج تو چھٹی ہے۔“ میں نے انہیں یاد دلایا۔ اس روز اتوار تھا۔

”ٹھیک ہے فی الحال اپنے کمرے میں آرام کرو اور ہاں نوشین کے کمرے میں مت جانا دونوں سوئی ہوئی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئیں۔

میں بجھے ہوئے دل کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور کمرے میں آ کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

مجھے اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں بستر میں لیٹے لیٹے امی کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ وہ

اس پھول جیسی لڑکی کو دارالامان بھیجنے کی باتیں کر رہی تھیں اور پولیس کو مطلع کرنا چاہتی تھیں۔ تھانوں

اور دارالامان کے متعلق میں نے بہت سے قصے سن رکھے تھے۔ یہ جگہیں ایسی نہیں تھیں کہ اس جیسی نفیس

اور معصوم لڑکی کو وہاں بھیجا جائے۔ وہ کسی اچھے گھرانے کی لگتی تھی۔ پولیس اسٹیشن میں ایک رات کا قیام

اس کا مستقبل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تباہ کر سکتا تھا۔ ہمارے ملک میں تھانوں کے اندر کیا نہیں ہوتا؟

پولیس خواتین کے ساتھ جو ظلم روارکھتی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اخبارات تھانوں اور

دارالامان میں لائی جانے والی خواتین کے متعلق جھوٹی سچی خبریں خوب مریج مصالحہ لگا کر شائع کرتے

ہیں اور لوگ انہیں مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ ایسی خواتین کو خواہ وہ بے گناہ اور معصوم ہوں ہمارا



معاشرہ کبھی قبول نہیں کرتا۔ میرے ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ ایک دو روز انتظار کر لیا جائے، ہو سکتا ہے اس کی یادداشت واپس آجائے۔ بسا اوقات کسی وقتی خوف یا ذہنی دھچکے کی وجہ سے بھی عارضی طور پر یادداشت چلی جاتی ہے۔ ایسے شخص کو تحفظ کا احساس دلایا جائے۔ اس سے محبت کا برتاؤ کیا جائے تو اس کی یادداشت کچھ دیر میں واپس آ جاتی ہے۔ اگر یوں ہو جاتا تو ہم اسے باعزت طور پر اس کے گھر بھیج سکتے تھے۔ یہ بھی امکان تھا کہ اس کے لواحقین اخبار میں کمشدگی کا اشتہار دے دیتے اور ہم ان سے رابطہ کر لیتے۔ دارالامان یا پولیس والے سارا کیس بگاڑ سکتے تھے۔ ویسے بھی اس حالت میں جب کہ اس کی یادداشت کھو چکی تھی وہ ان کے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے معذور تھی۔

میں نے سوچا میں امی کو قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے بھی وہ سوشل ورکر ہیں اور وکلاء پولیس والوں اور اخبارات کے ساتھ ان کے خصوصی تعلقات ہیں۔ وہ اگر اسے دو تین روز کے لئے اپنے پاس رکھنا چاہیں تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ مگر مسئلہ صرف امی کی مرضی کا نہیں تھا۔ گھر میں دادی جان، تایا جان اور ابو بھی تھے۔ ان تینوں کی مرضی کے بغیر گھر میں پتہ بھی نہ ہلتا تھا۔ انہی سوچوں میں غلطاں نہ جانے کس وقت میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ آنکھ کھلی تو سورج بلند ہو چکا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ تھوڑی دیر یونہی بستر میں لیٹا رہا اور پھر اٹھ کر باہر آ گیا۔ امی اور ابو کے کمرے کی جانب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ غالباً وہ سو رہے تھے۔ میں نے نشین کے کمرے کی طرف جا کر دیکھا تو اندر سے روشنی آتی محسوس ہوئی۔ میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا! میں نے پہلے جھانک کر دیکھا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ نشین جاگی ہوئی تھی اور اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوا الیمپ روشن کر رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں آہستگی سے بچوں کے بل چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔ ”سورہی ہے؟“ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

”ظاہر ہے! تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟“ اس نے بھی سرگوشی کی۔ میں خفیف ہو گیا۔ مجھے کوئی بات نہیں سوچ رہی تھی۔ میں ایک ٹک اسے دیکھے جارہا تھا۔ سوئی ہوئی وہ کسی شہزادی کی مانند نظر آ رہی تھی۔ نشین نے اس کا لباس بدل دیا تھا۔ اب اس کے جسم پر نشین کا گلابی رنگ کا کرتا پا جامہ تھا۔ دونوں کی جسامت تقریباً ایک جیسی تھی۔ عمروں میں دو سال کا فرق ہوگا۔ اس لباس میں وہ پہلے سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

”بوبی مجھے سب معلوم ہے تم بار بار ادھر کیوں آتے ہو؟“ نشین نے مجھے محو دیکھ کر سرگوشی کی۔

”کیوں آتا ہوں؟“ میں نے مصنوعی سنجیدگی سے پوچھا۔

”اچھا ہٹو تم تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہو۔“ میں نے اس سے اپنا بازو چھڑایا۔

”جناب اب تو میں اسے تمہارے لئے محفوظ کروا کے ہی چھوڑوں گی۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”دیکھو تو کس قدر ڈسینٹ اور پیاری ہے۔“ اس نے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات امی سے کر کے دیکھو۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”وہ اسے دارالامان بھجوانے والی ہیں!“

”دارالامان وہ کس لیے؟“

”کہہ رہی تھیں کہ ہمیں اس کا آگاہ پیچھا کچھ معلوم نہیں۔ پتہ نہیں کون ہے اور اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا ہے۔ ہمیں اسے یہاں نہیں رکھنا چاہیے۔“

”اوہو ایک تو امی بھی حد کرتی ہیں۔ ابھی تو دن چڑھا ہے۔ ہو سکتا ہے اخبار وغیرہ سے اس کی کمشدگی کے متعلق ہمیں کچھ معلوم ہو جائے اور اس طرح اس کے گھر والوں سے ہم رابطہ کر لیں!“ پھر وہ میری اور اس کی طرف ایک ادا سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ویسے بوبی بھائی اس کے گھر والوں سے رابطہ تو اب ضروری ہو گیا ہے۔ مجھے تو یہ لڑکی پسند آ گئی ہے!“

میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

ابھی ہم دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ دفعتاً اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ ہم دونوں فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں، روشنی سے بچنے کے لیے اپنا خوبصورت ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھا اور ہمیں غور سے دیکھنے لگی۔ پہلے اس کی نظر نشین پر پڑی اور پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ جھینپ سی گئی۔ میرے دل میں پھول کھل اٹھے۔

”یہ بوبی ہے۔ میرا بھائی۔“ نشین نے جلدی سے کہا۔ ”پورا نام محبوب احمد ہے۔ تمہیں ساحل سے اٹھا کر یہی لایا تھا۔“

”آداب.....“ اس نے ہاتھ اٹھا کر مہذب طریقے سے مجھے سلام کیا۔ میرے کانوں میں جیسے پیتل کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ اس کی آواز میں ایک عجیب سحر تھا۔

”آداب.....“ میں نے جواب میں کہا اور پر شوق نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ میری نگاہوں کی تپش محسوس کر کے اس نے اپنی گھنی سیاہ پلکیں جھکا دیں۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ میری زبان کو تو جیسے گرہ لگ گئی تھی۔ حسن کا رعب طاری ہو جاتا ہے یہ میں نے سن رکھا تھا مگر تجربہ آج پہلی بار ہو رہا تھا۔ میں نے بارہا حسین اور خوبصورت لڑکیوں سے بات کی تھی ان سے متاثر بھی ہوا تھا لیکن آج تک کسی لڑکی کے حسن کا رعب مجھ پر طاری نہیں ہوتا تھا۔ میں تو انہیں محض ایک کھلونا سمجھتا تھا۔ کھلونا کتنا ہی متاثر کن اور خوبصورت کیوں نہ ہو انسان اس سے



نے اس لڑکی کو گھیر لیا اور میں کچھ دیر کے لئے باہر آ گیا۔ مجھے اپنے ایک دوست کو ضروری فون کرنا تھا۔ نیچے لاؤنج میں جا کر فون کیا اور ایک دو ضروری کام پٹائے۔ واپس آیا تو کمرے میں ہنوز لڑکیوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ نوشین اور عنبرین نے تو اسے چوڑیاں بھی پہنا دی تھیں۔ سب اس سے یوں بے تکلف ہو گئی تھیں جیسے وہ ان کی پرانی سہیلی ہو۔ دفعتاً دروازے پر کھٹکا ہوا اور دادی جان لاٹھی ٹیکتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے اپنی عینک ناک پر جماتے ہوئے سب کو غور سے دیکھا اور پھر ان کی نگاہیں اس لڑکی پر جم گئیں۔ ان کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ بلند ہوئی اور انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”چمپون!“  
یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

مربوب نہیں ہوتا۔ میرا اس لڑکی کا معاملہ ہی جدا تھا۔  
نوشین کو شاید کچھ کام یاد آ گیا تھا۔ اس نے معذرت کی اور اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ہم دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے۔ اسے اپنے قریب تنہائی میں دیکھ کر میرا جسم سنسنانے لگا۔ وہ میری جانب دیکھ رہی تھی اور میرے وجود کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ ایسی گھبراہٹ سے مجھے زندگی میں کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ چند لمحے میں یونہی گم سم بیٹھا رہا۔ کچھ کہنے کی کوشش کی مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔  
”آپ نے میرے لئے بہت زحمت کی۔“ بالآخر اس نے پہل کی۔  
”نہیں نہیں یہ تو میرا اخلاقی اور انسانی فرض تھا۔“ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ”میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی کرتا۔“

”کوئی اور کیسے ہو سکتا تھا؟“ اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

”جی؟“ میں گڑبڑا گیا۔ ”میں سمجھا نہیں!“

”سمجھ جائیں گے!“ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی اردو خاصی صاف تھی مگر لہجہ کچھ اجنبی سا لگتا تھا میں نے اس کے جملے کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

”اردو آپ اچھی بولتی ہیں مگر لب و لہجہ کچھ اجنبی سا ہے۔ آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟“

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ اس کی تو یادداشت ہی کھو چکی ہے۔ پھر بھلا وہ اس سوال کا جواب کیسے دے سکتی ہے؟ یہ سوچ کر میں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا:

”معاف کیجئے گا میں نے غلط سوال کر دیا۔ مجھے امی اور نوشین سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں آ رہا۔ شاید..... شاید آپ کی..... یادداشت کھو گئی ہے؟“

”جی ہاں۔“ اس نے اپنی دہنی کینٹی پر آہستگی سے اپنی دو انگلیاں رکھیں اور کینٹی دباتے ہوئے بولی۔ ”مجھے واقعی کچھ یاد نہیں آ رہا۔“

”کوئی بات نہیں آپ اپنے ذہن پر غیر ضروری بوجھ نہ ڈالیں۔“ میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”خدا نے چاہا تو جلد ہی آپ نارمل ہو جائیں گی۔“

اس نے جواب میں ایسی محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میرا انگ انگ جھوم اٹھا۔  
”آپ بہت پر خلوص اور اچھے انسان ہیں۔ بہت پیار کرنے والے اور خیال رکھنے والے۔“ اس نے دھیرے سے کہا اور پھر خود ہی شرما کر سر جھکا لیا۔ میرے دل میں سینکڑوں پھول کھل اٹھے۔

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور نوشین اپنے ہمراہ عنبرین، مہرین اور توصیف کو لئے اندر داخل ہوئی۔ ان کے پیچھے ناہید بھی تھی میرے تایا جان کی بیٹی۔ آتے ہی سب





دوبارہ پر۔ وہ پریشان اور بے یقینی نظر کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر بے ہوشی اور غم تھا۔ وہ ایک معصوم و بے ضرر لڑکی تھی۔ حقیقتاً وہ اتنی اچھی اور پیاری تھی کہ دل یہ ماننے کو آمادہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس قدر دلنشین اور خوبصورت دوشیزہ بھی کسی کو اس حد تک خوفزدہ کر سکتی ہے کہ وہ بے ہوش ہو جائے۔ وہ تو ایسی تھی کہ کوئی دائمی مریض اسے دیکھتا تو بستر علالت سے اٹھ بیٹھتا۔ کوئی قریب المرگ شخص اس کی ایک جھلک دیکھ کر زندگی کی طرف واپس لوٹ آتا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

”محبوب احمد خان تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ دادی جان کو یقیناً کوئی دورہ پڑا ہے۔ بسا اوقات دورے کے اثر سے لوگ ہذیان میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کو وہی وجود نظر آنے لگتے ہیں۔ دادی جان کا چیخنا اور چپوں جیسا لفظ بولنا دورے کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس معصوم کا ساری بات سے کیا تعلق؟“

یہ سوچ کر دل نے اطمینان پکڑا اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی۔ معلوم ہوتا تھا اس نے میری آنکھوں کا پیغام پڑھ لیا ہے۔ کیونکہ اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک واضح ہونے لگی تھی۔ میں نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا لیں اور دادی جان کو لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ پیچھے پیچھے گھر والوں کا مجمع تھا۔

پورچ میں گاڑی تیار کھڑی تھی۔ میں نے پچھلی سیٹ پر دادی جان کو لٹا دیا اور ان کا سر گود میں لے کر ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اگلی نشست تایا جان نے سنبھال لی تھی۔ جبکہ ابو خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ڈرائیور کو انہوں نے نیچے اتار دیا تھا۔ ہم نہایت تیزی سے بندر روڈ پر واقع ایک بڑے اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ابو اور تایا جان نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ اس لڑکی کے بارے میں انہوں نے کوئی استفسار نہیں کیا۔ شاید امی نے ابو کو ساری بات بتا دی تھی۔ تایا جان کو بھی اس واقعہ کا علم ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ نیچے خبر نہ پہنچی ہوتی تو ناہید اوپر نشین کے کمرے میں اس لڑکی کو دیکھنے نہ آتی۔ میرے خیال میں ان کی خاموشی ان کی گہری پریشانی کی غماز تھی۔ ان کی پریشانی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابو نے جو حد درجہ محتاط ڈرائیور تھے کئی جگہ ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کی۔ ایک جگہ تو وہ اشارہ بند ہونے کے باوجود گزر گئے تھے۔ جبکہ تایا جان گاڑی سے جو اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے سامنے پوری طرح رکی بھی نہیں تھی اترنے کی کوشش میں لڑھکتے لڑھکتے نیچے تھے۔ ان کی حالت قابل رحم تھی۔

ایمرجنسی وارڈ کے باہر تایا جان کے دوست ڈاکٹر افتخار ترین دوزخوں کے ساتھ اسٹریچر لئے پہلے ہی منتظر تھے۔ چلنے سے پہلے تایا جان نے اپنے بڑے بیٹے شفیق احمد کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ڈاکٹر ترین کو فون پر اطلاع دے دے۔ انہوں نے گاڑی رکتے ہی نرسوں کی مدد سے دادی جان کو اسٹریچر پر منتقل کیا اور تیزی

کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔

یوں لگتا تھا جیسے فرشتہ اجل نے یکبارگی سب کی روح قبض کر لی ہو۔ پھر جیسے کسی نے چٹکی بھر کے سب کو جگا دیا۔

ایک ساتھ میں، نوشین، ناہید، عنبرین اور تو صیف دادی جان کی طرف لپکے۔ ایک شور مچ گیا۔ کوئی ان کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگا۔ کسی نے پانی کا جگ اٹھا کر ان کے چہرے پر چھینٹے مارنے شروع کر دیے۔ کوئی ان کے گال تھپتھپاتے ہوئے انہیں آوازیں دینے لگا۔ لیکن ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

ادھر کسی نے بھاگ بھاگ امی اور ابو کو خبر کر دی۔ وہ دوڑے آئے۔ تائی جان اور تایا جان بھی پہنچ گئے۔ میں نے اس اثناء میں انہیں اٹھا کر بستر پر ڈال دیا تھا۔ وہ لڑکی گھبرائی اور سمٹی ہوئی بستر کے ایک کونے پر بیٹھی تھی، لیکن اس کی طرف توجہ دینے کی کسی کو اس وقت فرصت نہیں تھی۔ ابوائی، تایا جان اور تائی جان ایک ساتھ ہم سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا؟ نوشین اور ناہید انہیں جلدی جلدی بتا رہی تھیں کہ دادی جان کو اچانک دورہ پڑ گیا تھا اور وہ چیختے ہوئے قالین پر گر گئی تھیں۔ مہرین، عنبرین اور تو صیف بھی ان دونوں کی تائید کر رہے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ دادی جان اس لڑکی کو دیکھ کر چیخی تھیں۔ کسی نے اس پر اسرار لفظ ”چپوں“ کا تذکرہ تک نہیں کیا تھا جو میں نے واضح طور پر ان کے منہ سے ادا ہوتے سنا تھا۔

اگرچہ میرا ذہن ابھی تک اس پر اسرار اور نامانوس لفظ میں الجھا ہوا تھا اور لڑکی کو دیکھ کر دادی جان کی حالت جس طرح متغیر ہوئی تھی اس کا نقشہ بھی ہنوز میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا مگر میں نے مصلحتاً چپ سادھ لی اور ان کے استفسار کے جواب میں وہی کچھ کہا جو بچیاں کہہ رہی تھیں۔ دادی جان کی حالت اچھی نہیں تھی۔ فی الحال ہماری ساری توجہ انہی کی طرف مرکوز ہونی چاہیے تھی۔ ابو نے مجھے دادی جان کو اٹھا کر نیچے پورچ میں لانے کو کہا اور خود بجلت نیچے جانے کے لئے باہر کی طرف لپکے تو میں نے دادی جان کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھالیا۔ ان کا جسم دبلا پتلا اور کمزور تھا۔ انہیں اٹھاتے ہوئے میری نظر اس لڑکی پر



سے انہیں اندر لے گئے۔ ہم میوں کی ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ اسہوں نے، میں اندر لے سے میں روکا۔ اندر جا کر انہوں نے جلدی جلدی ان کی نبضیں ٹٹولیں اور ایک نرس کو گلوکوز کی بوتل لگانے کی ہدایت کرتے ہوئے خود آکسیجن ماسک کی طرف لپکے۔ میں اس لمحے دادی جان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے سانس کا سلسلہ رک سا گیا ہے۔ دفعتاً ان کے جسم نے عجیب انداز میں ایک جھٹکا سا کھایا اور پھر ان کا جسم ساکت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے لپک کر ان کی نبض دیکھی اور پھر گھبرا کر اسٹیٹھسکوپ ان کے سینے سے لگایا اور کچھ محسوس کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اسٹیٹھسکوپ کانوں سے اتار کر گلے میں ڈال لیا اور مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بتایا جان سے کہا۔

”مجھے افسوس ہے خان صاحب۔ آپ کی والدہ وفات پا گئی ہیں!“

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے زمین کی بساط میرے پاؤں کے نیچے سے کھینچ لی ہے اور میں نیچے ہی نیچے کسی گہری کھائی میں گر جا چلا جا رہا ہوں۔ میرا سر چکرانے لگا تھا اور کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے دیوار کا سہارا نہ لیا ہوتا تو یقیناً فرش پر آ رہتا۔ بتایا جان اور ابو کی حالت مجھ سے دگرگوں تھی۔ وہ دونوں چکرا کر ایک بستر پر گر گئے تھے اور دادی جان کو پکارتے ہوئے پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے دو قدم آگے بڑھا اور دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دادی جان کا چہرہ دیکھا۔ ان کے چہرے پر اب ایک ابدی سکون اور نور تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا کے تمام دکھوں سے بے نیاز ہو کر وہ گہری نیند سو رہی ہیں۔ میری آنکھیں یک لخت اند پڑیں اور میں ان کی نعش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بتایا جان اور ابو ان کے سینے میں منہ چھپا کر اتار روئے کہ ڈاکٹر ترین اور نرسوں کی آنکھیں بھی اشک بار ہو گئیں۔

مجھے اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی موت کا ذمہ دار میں ہوں۔ گودل یہ ماننے کو آمادہ نہیں تھا کہ وہ معصوم صورت لڑکی کسی طرح ان کی بے ہوشی کا محرک ہو سکتی ہے۔ مگر ذہن میں یہ واہمہ اب بھی کسی سنبولے کی طرح ریگ رہا تھا کہ دادی جان اسی کو دیکھ کر خوف سے چیختی تھیں۔ اگر یہ شبہ درست تھا تو چونکہ لڑکی کو ساحل سمندر سے اٹھا کر میں ہی گھر لایا تھا اس لئے دادی جان کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کی ذمہ داری مجھ ہی پر عائد ہوتی تھی۔ لیکن دل نے جلد ہی اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔

مجھے وہ وقت یاد آیا جب دادی جان دادا جان کو مجھے ساحل پر لے جانے سے روکا کرتی تھی اور جواب میں وہ معنی خیز انداز میں مسکرا دیتے تھے۔ مجھے وہ دن بھی یاد آئے جب میں چاندنی راتوں میں اکیلا بھری ہوئی موجوں کا نظارہ کرنے سمندر کا رخ کرتا اور دادی جان کو اس کا علم ہو جاتا تو وہ مجھ سے سخت خفا ہوتی تھیں۔ مجھے ان کی نصیحتوں سے بے حد الجھن ہوتی تھی۔ میں نے کبھی ان کی باتوں اور نصیحتوں کو

درخور اعتناء نہ سمجھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ چاندنی راتوں میں ساحل پر جن بھوت، چڑیلیں اور پریاں اترتی ہیں۔ اگر جوان بچے بچیاں اچھے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر ایسے وقت ساحل پر جائیں تو ان پر آسیب کا سایہ ہو جاتا ہے۔ سارا گھرانہ کی اس توہم پرستی پر ہنستا تھا۔ خود میں ان پند و نصائح پر بس مسکرا کر رہ جاتا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال آ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے لڑکیوں سے یہ بات سن کر مجھے وہ لڑکی رات کے وقت چاندنی میں ساحل سمندر پر بے ہوش پڑی ملی تھی ان کی توہم پرستانہ طبیعت نے ان کے ذہن پر اثر کیا ہو اور وہ کسی واہمے یا ذہنی خوف کے زیر اثر اس سے ڈر گئی ہوں۔

ڈاکٹر ترین نے مجھے ابو اور تایا جان کو دادی جان کی لاش سے علیحدہ کر دیا تھا اور خدا کی رضا پر راضی ہونے اور صبر کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں انہوں نے یہ بھی بتایا کہ دادی جان کو ایک طرح کا دورہ پڑا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکی تھیں۔ ڈاکٹر نے اس بیماری کا اپنی طبی زبان میں ایک مشکل سا نام بتایا تھا۔ ڈاکٹر ترین کی تشخیص کے بعد اب شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ میرے ذہن میں اٹھنے والا ہر شبہ زائل ہو گیا۔

ہم اسپتال سے گھر کیسے پہنچے اور گھر میں یہ اطلاع پا کر سب کا کیا حال ہوا یہ ایک تکلیف دہ اور دکھ بھری کہانی ہے۔ ہر طرف کہرام مچ گیا تھا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی اور دیوار و در سے نالہ و فریاد کی آوازیں پھوٹی محسوس ہو رہی تھیں۔ دادا جان کی وفات کے بعد گھر میں برسوں بعد یہ پہلی موت وقوع پذیر ہوئی تھی اس لئے یہ دکھ کسی پہاڑ کی طرح سب پر بھاری ہو گیا تھا۔ پھر وہ عملاً گھر کی کرتا دھرتا اور بزرگ ہستی تھیں۔ ان کے دم قدم سے دونوں گھروں میں سلوک و اتفاق قائم تھا۔ اور سب ایک لڑی میں پروئے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سارا گھر بکھرا بکھرا اور منتشر سا لگنے لگا تھا۔ بتایا جان جوان کے بعد گھر میں سب سے بڑے تھے ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی والدہ کی وفات کا بے حد اثر لیا تھا۔

دادی جان کو لحد میں اتارنے تک مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ پوری کوٹھی تعزیت کے لئے آنے والے مردوں اور عورتوں سے بھری ہوئی تھی۔ دوست، عزیز، رشتہ دار، اہل محلہ ابو اور تایا جان کے کاروباری تعلق کے لوگ نہ جانے کون کون تعزیت کرنے کے لئے آیا تھا۔ جنازے میں اتنے زیادہ لوگ شریک تھے کہ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ ہماری فیملی کا اس علاقے میں کیا مقام تھا۔

رات گئے لوگوں کا رش کم ہوا تو میں لاؤنج میں ایک صوفے پر زرادیر کے لئے کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ بمشکل آنکھ لگی ہوگی کہ کسی نے مجھے ہلا کر اٹھا دیا۔ وہ نوشین تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”بوی امی کہہ رہی ہیں تھوڑا سا کھانا کھا لو۔“ اس نے میز پر پڑی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں اور بال الجھے ہوئے تھے۔ لباس میلا اور شکن آلود تھا۔



م لے کھانا کھایا؟ میں نے اس سے استفسار کیا۔  
”نہیں۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

”کیوں؟“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور سر ہولے ہولے ہلنے لگا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ رونے لگی ہے۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج سارا دن میں مردوں کے ساتھ باہر شامیانوں میں مصروف رہا تھا۔ عورتیں اندر گھر میں تھیں اس لئے بہت کم اندر آنا ہوا تھا۔ جب دادی جان کا جنازہ عصر کے بعد عورتوں کے کمرے سے نکالا گیا تھا تو میں خود ابوتایا جان شفیق بھائی اور رفیق بھائی کے ساتھ اندر گیا تھا مگر نوشین سے نہیں مل سکا تھا۔ وہ یقیناً بہت روئی ہوگی۔ دادی جان سے اسے بے حد پیار تھا۔ مگر مجھے یقین تھا جب تک وہ میرے سینے میں منہ چھپا کر نہ روئے گی اس کا غبار نہ چھٹے گا۔ وہ کافی دیر روتی رہی۔ میں اس کی خاطر بیٹھا رہا۔ وہ خاموش ہوئی تو میں نے نوالے توڑ توڑ کر زبردستی اس کے منہ میں ٹھونسے شروع کر دیئے۔ میں نے خود صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ بھوک جیسے مری گئی تھی۔ کھانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر اس کے خیال سے میں بھی ہاتھ چلاتا رہا۔ وہ اٹھنے لگی تو معاً اس لڑکی کا خیال آیا۔ اس سارے عرصہ میں اس کا سراپا اگرچہ میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا، لیکن دن بھر کی مصروفیات اور کیفیت غم نے اس کے تصور کو دھندلا ضرور دیا تھا۔ اب کچھ ہوش آیا تھا تو اس کا نقش خود بخود ذہن کے پردے پر ابھرا آیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

”نوشین! وہ لڑکی کدھر ہے؟“

”اوپر کمرے میں ہے۔“ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا وہ سارا دن اوپر کمرے ہی میں رہی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”نہیں! وہ بیچاری تو سارا دن ہمارے ساتھ ساتھ رہی ہے۔ دادی جان کی وفات پر اس طرح رورہی تھی جیسے اس کا کوئی قریبی عزیز فوت ہو گیا ہو۔ بوبی یہ لڑکی بہت ہمدرد اور اچھی ہے۔“

”میں تم سے متفق ہوں!“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا اوپر آ گیا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ سارے دن کی تھکاوٹ، نیند کی صورت میں آنکھوں میں اترنے لگی تھی۔ میں نے نوشین کو خدا حافظ کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ دل میں ایک خیال آیا تھا کہ نوشین کے کمرے میں جا کر اس بے چاری سے ہمدردی کے دو لفظ بولوں۔ اس نے اگر یہ غم اسی طرح محسوس کیا تھا جس طرح گھر کے دیگر افراد نے کیا تھا تو وہ بھی ہمدردی اور اس سے بڑھ کر تشکر کی مستحق تھی۔ مگر پھر کچھ سوچ کر میں آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز دن چڑھے میری آنکھ کھلی۔ کھڑکی کے پردے سے دھوپ چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ کچھ دیر میں کسٹمندی سے بستر میں کروٹیں بدلتا رہا اور پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر کپڑے بدلے۔ شیو کرنے کا موقع نہیں تھا بالوں میں کنگھی کر کے باہر نکلا۔ چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ سوچا نوشین کے ساتھ چائے پیتا ہوں۔ نوشین کا خیال آیا تو ذہن میں اس سراپا ناز کا تصور بھی عود کر آیا۔ لیکن اس کا تصور ذہن سے محکوب ہوا تھا۔ رات خوابوں میں وہ ہر جگہ میرے ساتھ تھی۔ میری دلجوئی کر رہی تھی، میرا غم بٹا رہی تھی، پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی، میرا سرد بارہی تھی۔ میں نے اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا تھا۔

میں نے نوشین کے کمرے کے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اسے متوجہ کرنے کے لئے دوبارہ دستک دی۔ اس نے اجازت دی تو میں اندر داخل ہوا۔ نوشین کمرے میں اکیلی تھی اور اپنی سیاہ چادر پر استری کر رہی تھی۔ وہ شاید نیچے جانے کی تیاری کر رہی تھی جہاں عورتیں تعزیت کے لئے جمع تھیں۔ میں نے متحس نگا ہوں سے کمرے کا جائزہ لیا اور پوچھا۔

”نوشین وہ کدھر ہے؟“

”وہ؟ وہ امی کے ساتھ مسز شاہد درانی کے گھر گئی ہے۔“ اس نے چادر کندھوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”مسز شاہد درانی کے گھر؟ یہ کون ہیں؟“ میں نے استفسار کیا۔

”امی کی دوست ہیں ان کے ساتھ امی سوشل ورک کرتی ہیں۔ امی کہہ رہی تھیں کہ وہ اس لڑکی کے والدین یا لواحقین کو تلاش کرنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ ان کے توسط سے امی اسے دارالامان بھجوانے کا ذکر بھی کر رہی تھیں۔ وہ ایک دارالامان کی انتظامیہ میں شامل ہیں۔“ اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بے دلی سے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا دل نوچ کر اپنے پاؤں تلے مسل ڈالا ہے۔ امی نے بالا خروہی کیا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ میں نے بے قرار ہو کر نوشین سے کہا۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ وہ کب اسے لے کر گئی ہیں؟“

”تقریباً گھنٹہ بھر پہلے۔ دراصل انہیں ابو نے کہا تھا۔ میں نے تو التجا کی تھی کہ اسے یہیں رہنے دیں لیکن.....“

”تم نے مجھے کم از کم بتانا تو تھا۔“ میں نے احتجاج کیا۔ ”ہو سکتا ہے میں انہیں روک دیتا۔“

”نہیں بوبی!“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کل تعزیت کے لئے آنے والی خواتین بھی اس کے

بارے میں استفسار کر رہی تھیں۔ ہم نے کسی کو کچھ بتایا اور کسی کو کچھ۔ امی کے لئے اس معاملے کو سنبھالنا



بہت مشکل تھا۔ وہ تمہاری بات کبھی نہ مانتیں۔ پھر ابو بھی تو یہی چاہتے تھے۔ تم کیا کر سکتے تھے؟“  
میں نے اس سے مزید کوئی بات نہیں کی، جھنجھلاہٹ سے دروازہ بند کیا اور پاؤں پٹختا باہر آ گیا۔  
میں بے حد بے چین اور رنجیدہ تھا۔

نیچے ڈرائنگ روم میں دس بارہ افراد تعزیت کے لئے بیٹھے تھے۔ ابوتایا جان اور شفیق بھائی ان کے ساتھ فاتحہ پڑھنے میں مشغول تھے۔ میں بھی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ لیکن میرا ذہن بھٹکا ہوا تھا۔ دوپہر تک میں وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا اور آنے والے لوگوں سے ملتا تعزیت و ہمدردی کے روایتی جملے سنتا اور ان کے استفسار پر دادی جان کی وفات کا واقعہ دہراتا رہا۔ ہر کوئی ایک طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی طرح کے سوال تھے۔

دوپہر کا کھانا لایا گیا۔ میں نے جیسے تیسے چند نوالے زہر مار کئے اور اوپر آ گیا۔ امی جان کافی دیر پہلے واپس آ گئی تھیں۔ وہ مجھے کمرے میں مل گئیں۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ میرے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بستر پر بٹھایا اور سمجھانے لگیں۔ میرے استفسارات کے جواب میں ان کے پاس وہی دلائل اور جواز تھے جو میں اس سے پہلے سن چکا تھا۔ وہ اسے مسز شاہد درانی کے توسط سے دارالامان چھوڑ آئی تھیں۔ میں نے اس معاملے میں اپنی ناراضی اور دل گرفتگی کا اظہار کرنے میں کسی طرح کے بخل سے کام نہیں لیا۔ میں نے انہیں یہ بتانے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی کہ میں اپنے دل میں اس کے لئے کیسے جذبات محسوس کرنے لگا تھا اور یہ کہ میں اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔  
امی نے میرے منہ سے یہ بات سن کر حیرت سے میری طرف دیکھا اور افسوس سے گردن ہلاتے ہوئے بولیں۔

”میں سمجھتی تھی تم کچھ سمجھ دار ہو گئے ہو۔ تم ایسی بچکانہ بات کرو گے میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ لگتا ہے تم فلمیں کچھ زیادہ ہی دیکھنے لگے ہو۔ میاں صاحبزادے حقیقی زندگی کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اونٹ جتنا قد ہو گیا اور باتیں دیکھو! کیا رشتے نا طے یوں طے ہوتے ہیں؟ محبتیں یوں کی جاتی ہیں؟ نہ جانے کون حرافہ تھی اور کہاں سے آئی تھی.....؟“

”بس! بس کیجئے..... بہت ہو گئی!“ میں نے ان کی بات کاٹی۔ ”ایک معصوم لڑکی کو ایسے القابات سے نوازنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ آپ بہت جہاندیدہ ہوں گی مگر چہرے پڑھنا کچھ نہ کچھ میں بھی سیکھ گیا ہوں۔ میرے خیال میں آپ نے اسے غور سے نہیں دیکھا۔ اگر چہرہ کسی کے باطن کا آئینہ دار ہوتا ہے تو اس کا چہرہ اس کی شرافت اور کسی اچھے خاندان سے اس کے تعلق کو خوب اچھی طرح ظاہر کر رہا تھا۔ آپ نے اسے یوں دارالامان بھجوا دیا جیسے وہ کوئی عام گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہو۔“

”یہ تم نہیں اس کا عشق سرچڑھ کر بول رہا ہے۔“ انہوں نے غصے سے کہا۔ ”کان کھول کر سن لو میں

تمہارے منہ سے آئندہ اس کے متعلق ایک لفظ نہیں سننا چاہتی۔ اور ہاں اب اپنا کھلنڈراپن بھی قدرے کم کرو۔ تمہاری دادی جان مرحومہ نے چند روز پہلے تمہارا اور ناہید کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ وہ وفات نہ پاتیں تو اسی ماہ ہم تم دونوں کی منگنی کر دیتے۔ تمہیں اب زیادہ ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔“

”چلو!“ میں نے بے زاری سے منہ بنایا۔ ”یہ بھی خوب رہی۔ آپ لوگوں نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا اور مجھے خبر تک نہیں۔ اب آپ نے ذکر کر ہی دیا ہے تو سن لیجئے۔ میں ناہید سے کبھی شادی نہیں کر سکتا۔ میرے ذہن میں جیون ساتھی کا ایک اپنا تصور ہے اور ناہید اس پر پوری نہیں اترتی۔ ویسے بھی میں آپ کو اپنی پسند سے آگاہ کر چکا ہوں۔“

”تمہارا دماغ چل گیا ہے۔“ وہ خفگی سے بولیں۔ ”کبھی اس طرح بھی ہوا ہے؟ کسی راہ جاتی لڑکی کو ہم بہو بنا کر کیسے گھر لاسکتے ہیں؟“

”آپ نے کسی کو گھر لانا سیکھا ہی نہیں۔“ میں نے تنک کر کہا۔ ”آپ کو صرف گھر سے نکالنا آتا ہے۔“

”بے وقوف لڑکے تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا ہم اسے یونہی اپنے گھر میں رکھ لیتے؟ دارالامان نہ بھیجتے؟“

”اگر وہ عام لڑکی ہوتی تو ضرور بھیج دیتیں۔ آپ نے اسے دیکھا نہیں کیسی معصوم اور نازک سی لڑکی تھی۔ آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہاں جا کر اس کا دم گھٹ جائے گا۔ پہلے اس کا اتنا خیال کیا اور پھر اسے دارالامان چھوڑ آئیں۔ وہ ہمارے بارے میں کیا سوچتی ہوگی؟“

”کچھ بھی سوچے اب تو میں اسے وہاں چھوڑ آئی ہوں۔“ انہوں نے بے زار ہو کر کہا۔ ”اتنا بہت ہے کہ تم نے اس کی جان بچائی اور ہم نے ایک دن اور دو راتیں اسے اپنے ہاں پناہ دی۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو بوبی بیٹی! ہم اسے مزید کچھ دن یہاں رکھتے تو ہمارے لئے بہت پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ گھر میں آنے والی تمام عورتیں اس کے متعلق استفسار کر رہی تھیں۔“

”چلیں آپ کی مشکلیں اب آسان ہو گئی ہیں۔ آپ پیچیدگیوں سے بچ گئیں خدا کا شکر ادا کریں اور چین کی نیند سوئیں۔ مجھے خوشی ہے آپ اپنے سوشل ورک میں سرخرو ہوئیں۔ اخبار میں آپ کا نام چھپ جائے گا!“

انہوں نے آنکھوں میں غصہ بھر کے مجھے دیکھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور بیشتر اس کے کہ وہ کوئی بات کرتیں کمرے سے باہر نکل آیا۔

میرا وہ دن بہت بے چینی میں گزرا۔ بار بار اس کا سراپا میری نظروں کے سامنے آتا تھا اور دل سے ایک آہ نکلتی تھی کہ اسے یقیناً پولیس نے پریشان کر رکھا ہوگا۔ اس سے طرح طرح کے سوالات کئے جا



رہے ہوں گے۔ اخباری نمائندوں نے کرید کرید کر اس سے جی زندگی کے متعلق پوچھا ہوگا۔ وہ اس کی باتوں کو اپنی مرضی کے معانی پہنارہے ہوں گے۔ اس سے بے سروپا باتیں منسوب کر رہے ہوں گے۔ وہ تو تھی بھی حد درجہ خوبصورت اور حسین۔ خوب روخواتین کے متعلق ہیجان خیز فضول اور لچر باتیں پھیلا نا تو یوں بھی ان اخبارات کا عام وطیرہ ہوتا ہے۔ اس سے ان کے پرچے خوب بکتے ہیں۔ لوگ ایسی خبروں کو مزے لے کر پڑھتے ہیں اور یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کے اپنے گھروں میں بھی بہو بیٹیاں ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ کوئی ان کے متعلق ایسی باتیں کرے تو ان کے دل پر کیا گزرے گی؟

اگلے روز کے اخبارات نے میرے خدشات کی تائید کر دی۔ اس خبر کو خوب اچھالا گیا تھا۔ خبروں کا انداز کچھ اس طرح کا تھا:

”ساحل سمندر پر کھیلا جانے والا سنسنی خیز ڈرامہ۔ رات گئے ویران ساحل پر حسین و جمیل دو شیرہ بے ہوشی کی حالت میں پائی گئی..... مجرمانہ حملہ، اغواء یا محبت میں ناکامی کی بنا پر خودکشی؟ حسینہ سے پولیس پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ یادداشت کھوجانے کی اداکاری، سنسنی خیز انکشافات کی توقع۔“

اخبارات میں ایک تصویر بھی تھی جس میں اس لڑکی کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ اس نے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ اس کے نیچے لکھا تھا۔

”اخباری فوٹو گرافروں کے کیمرے سے بچنے کے لئے خوبرو حسینہ کا ایک انداز!“

لیکن میرے اندازے کے مطابق وہ تصویر اس کی نہیں تھی۔ اخباری نمائندوں نے تصویر کے حصول میں ناکامی کے بعد کسی اور لڑکی کی تصویر اس انداز میں شائع کر دی تھی۔ اخبارات میں خبر کی جو تفصیل چھپی تھی اس میں اصل حقائق میں بوجہ تبدیلی کی گئی تھی۔ اخبارات نے دارالامان کی نگران کے حوالے سے لکھا تھا کہ ساحل سمندر پر چہل قدمی کے دوران وہ لڑکی میں نے اور امی نے ایک ساتھ دیکھی تھی اور سوشل ورکر ہونے کے ناطے امی اسے اٹھا کر گھر لے آئی تھیں۔ اخبارات نے ان کے جذبہ خدمت کی تعریف کی تھی۔ امی نے غالباً مجھے اس معاملے کی پیچیدگیوں سے بچانے کے لئے واقعات کو نیا رخ دیا تھا۔ اخبارات سے مجھے دارالامان کے نام اور پتے کا علم ہو گیا تھا۔ میرا دل بے چین ہو رہا تھا۔ میں اس سے فوراً ملنا چاہتا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا میں اسی وقت جاؤں اور کسی نہ کسی طرح سے اسے اس جہنم کدے سے نکال لاؤں۔ وہ ایک نرم و نازک لڑکی تھی۔ وہ ایسے حالات میں ذہنی دباؤ کا شکار ہو سکتی تھی۔ وہ بیچاری تو پہلے ہی پریشان تھی۔ اسے حوصلے اور دلجوئی کی ضرورت تھی نہ کہ تفتیش اور پوچھ گچھ کی۔

شام کے وقت مجھے گھر سے نکلنے کا موقع مل ہی گیا۔ میں نے گاڑی نکالی اور سٹی ریلوے اسٹیشن کی طرف نکل گیا۔ دارالامان ریلوے روڈ کی ایک پرانی کوٹھی میں واقع تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو مغرب کی

اور میں ہوں میں باہر گھر پر دروازہ کھول دیا۔ صبح پر ایک کون سا پھل ہوا تھا۔ صبح کی فرحت اثر ہوا میں پام کے پیڑ ہوئے ہوئے جھوم رہے تھے۔ میں نے کوٹھی کی دیوار پر لگے ہوئے بورڈ پر نگاہ ڈالی۔ اس پر ”آغوش..... بے سہارا اور مظلوم خواتین کا مددگار ادارہ!“ کے الفاظ جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی ایک طرف پارک کی اور آہستگی سے چلتا ہوا کوٹھی کے سیاہ آہنی گیٹ کے قریب پہنچا۔ مجھے دیکھ کر درمیانی عمر کا ایک گٹھے ہوئے جسم اور سیاہ مونچھوں والا سرخ و سپید پٹھان چوکیدار گیٹ کے اندر بنے ہوئے چھوٹے دروازے سے جھک کر باہر نکلا اور اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اکھڑ لہجے میں بولا۔

”خوچہ کیا بات اے!“

میں اس کے لب و لہجے سے گڑبڑا گیا۔ تھوک نکل کر جلدی سے کہا۔ ”خان صاحب..... وہ وہ ایک لڑکی، میری والدہ بیگم عشرت خان صاحبہ کل ادھر چھوڑ گئی تھیں۔ میں اس سے ذرا کچھ..... بات کرنا چاہتا ہوں۔“

چوکیدار نے مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھورا اور کرخت لہجے میں کہا: ”چلو چلو ایدر کوئی لڑکی مڑکی نہیں اے۔ جسے دیکھو خانہ خراب کا بچہ اس لڑکی سے ملنے آ رہا ہے۔ تم خوچہ کون اے؟ اخبار والا ہے؟ ایدر بیگم صاحب نے ام کو بولا ہے کوئی خانہ خراب کا بچہ ایدر آئے تو اس کی ایسی ٹھکانی کرو کہ پھر ایدر آنے کا نام نہ لے۔“

”نہیں خان صاحب“ میں اخبار والا نہیں ہوں۔“ میں نے مسکین صورت بنا کر کہا۔ ”میں نے بتایا نا کہ میں بیگم عشرت خان کا بیٹا ہوں، جنہوں نے اس لڑکی کو مسز شاہد درانی کے ذریعے یہاں بھجوایا ہے۔ میں وہی لڑکا ہوں جو اسے ساحل سے اٹھا کر لایا تھا.....“

اس بار چوکیدار نے سر سے پاؤں تک میرا اچھی طرح جائزہ لیا اور بولا۔ ”اچا اچا وہ تم تی“ پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا: ”لیکن یا راجی ام مجبور اے۔ ام کو بیگم شاہد درانی نے خود بولا ہے کہ کسی آدمی کو اس لڑکی سے..... کیا نام ہے اس کا.....؟ ہاں نیلم بی بی سے ملنے کا اجازت نہیں اے!“

”خان صاحب مہربانی کرو۔“ میں نے پچاس روپے کا نوٹ اس کی مٹھی میں دبا دیا۔ ”بس تھوڑی دیر کے لئے اس سے ملنے دو۔ مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ اس سے کہنا بوبی صاحب ملنے آئے ہیں۔“

پچاس روپے کے نوٹ کی تاثیر اچھی تھی۔ چوکیدار فوراً نرم پڑ گیا۔ اس نے نوٹ شلوار کے نیفے میں اڑسا اور ادھر ادھر دیکھ کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ گیٹ کے دائیں جانب ملاقاتیوں کا کمرہ تھا جس میں ایک پرانا سا صوفہ پڑا تھا۔ چوکیدار نے مجھے اس صوفے پر بٹھا دیا۔ سامنے لان تھا اور اس سے آگے ایک



برآمدہ جس میں اوپر کی منزل کی طرف جانے والی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہاں اسٹول پر ایک عمر رسیدہ عورت بیٹھی بے زاری سے جمائیاں لے رہی تھی۔ چوکیدار نے اس سے کچھ دیر بات کی اور پھر چند روپے اس کی ہتھیلی پر رکھے جنہیں دیکھ کر عورت کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا اور تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

انتظار کے لمحے بے حد اذیت ناک تھے۔ ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ عورت نے واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس کے پیچھے وہ زہرہ جیس تھی جو چپکے سے میرے دل پر قابض ہو گئی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو جیسے ایک ساتھ کئی قمقمے روشن ہو گئے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور حسین نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ تھی اور مجھے دیکھ کر اس کی نگاہوں میں ایک خاص طرح کی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

”بیٹھے!“ اس نے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی تھی۔ کئی لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”آپ کیسی ہیں نیلم؟“ میرے منہ سے اپنا نام سن کر جو غالباً مسز درانی نے اسے دیا تھا وہ مسکرائی۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ میں نے الفاظ تول کر ذہن میں اپنے خیالات کو ترتیب دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے شرمندگی ہے امی نے آپ کو یہاں بھجوا دیا۔ یقین کیجئے یہ سب میری لاعلمی میں ہوا۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں آپ کو کبھی یہاں نہ آنے دیتا۔“

”مجھے معلوم ہے!“ اس نے اپنی غزالی آنکھوں کے چلمن اٹھا کر میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں گھائل ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے اعتماد کا سمندر موجزن تھا۔ میں سرشار ہو گیا۔ میرے دل میں ایک دم اس کے لئے بے کراں محبت اور پیارا اُٹھ آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بھی میرے قریب سمٹ آئی۔ اس کے جسم کی مسحور کن خوشبو نے مجھ پر دیوانگی طاری کر دی۔ ”میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔“ میں نے جذباتی انداز میں اس کا خوبصورت چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھامتے ہوئے کہا۔ ”میں میں میں..... تم سے..... تم سے بے حد محبت کرنے لگا ہوں۔ میں تمہارے بغیر اب نہیں رہ سکتا!“

”مجھے معلوم ہے!“ اس نے ایک بار پھر اپنے مخصوص انداز میں کہا اور میرے سینے سے چمٹ گئی۔ اس کی دھڑکنیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ اس کے بدن کے لمس نے میرے جسم میں کرنٹ دوڑا دیا تھا۔ میں نے اسے شدت سے بھینچ لیا۔ ”مسز درانی اچھی خاتون ہیں مگر میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔“ اس نے میرے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”بوی مجھے یہاں سے کہیں دور لے چلو ورنہ یہاں میرا دم گھٹ جائے گا..... طرح طرح کے لوگ یہاں مجھ سے پوچھ گچھ

کرنے آرہے ہیں۔ رنگ رنگ کی عورتیں ہر وقت مجھ سے اُلٹے سیدھے سوال کرتی رہتی ہیں۔ میں کسی سے نہیں ملنا چاہتی کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ میرے پاس ان کی کسی بات کا جواب نہیں ہے!“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”میری جان تم بالکل فکر نہ کرو۔“ میں نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”خدا نے چاہا تو ایک آدھ دن میں کوئی مناسب انتظام ہو جائے گا۔“

اس نے تشکر بھری نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے سے کتنی ہی دیر پیار بھری باتیں کرتے رہے۔ چوکیدار نے دروازہ کھٹکھٹا کر ہمیں چونکا نہ دیا ہوتا تو ہمیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ ہم بادل خواستہ کمرے سے باہر نکل آئے۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے جدا ہونے سے پہلے اسے آنکھوں آنکھوں میں جلد ہی دوبارہ آنے کا یقین دلایا اور چوکیدار کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔

رات بمشکل کٹی۔ اگلے روز کے اخبارات میں اس بیچاری کے متعلق مزید ہرزہ سرائی کی گئی تھی۔ بعض اخبارات نے اس کے غیر مانوس اردو بولنے کے انداز سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ کوئی اینگلو انڈین لڑکی ہے۔ اخبارات نے خدشہ ظاہر کیا تھا اسے بھارتی خفیہ ایجنسی رانے جاسوسی کی غرض سے بذریعہ لائچ ساحل پر اتارا تھا۔ انہوں نے چند ماہ پرانی ایک خبر کا حوالہ بھی دیا تھا جس کی رو سے بھارتی خفیہ ایجنسی نے پچاس کے لگ بھگ تربیت یافتہ حسینا میں جاسوسی کی غرض سے دارالحکومت کراچی میں داخل کر دی تھیں۔ یہ لڑکیاں امیر کبیر لڑکوں، نوجوان سرکاری افسروں اور عیاش سرکاری ملازموں سے تعلقات استوار کرتی تھیں اور ان کے توسط سے خفیہ معلومات اور راز ہائے سرکاری تک رسائی حاصل کرتی تھیں۔ نیلم کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا تھا محض قیاس آرائی ہی تو تھی۔ میرا دل بہت دکھی ہوا۔ اخبارات میں مجھے اس کے والدین یا لواحقین کے حوالے سے کوئی خبر نظر نہ آئی۔ ایک روز پہلے کے اخبارات میں جس قدر تفصیل سے اس کے متعلق لکھا گیا تھا وہ ہرگز اس کے گھر والوں کی نظر سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ یہ سب کچھ پڑھ کر ضرور دارالامان کی انتظامیہ سے رابطہ کرتے۔ معلوم ہوتا تھا اس کے والدین یا سرپرست کراچی میں نہیں رہتے۔ میں سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے وہ لڑکی کسی دور دراز علاقے سے بہہ کرا دھر آ گئی ہو۔ ممکن ہے وہ کسی غیر ملکی بحری جہاز سے سمندر میں گر گئی ہو۔ وہ کوئی سیاح بھی ہو سکتی تھی۔

میں یہ سوچنے لگا کہ اگر اس کے لواحقین نے دارالامان سے رابطہ نہیں کیا تو اس کے ساتھ کیا ہوگا؟ اخبار میں شائع ہونے والی ایک اور خبر نے مجھے اس کے مستقبل کی ایک جھلک دکھا دی تھی۔ اخبار نے لکھا تھا کہ محمد حنیف نامی ایک نوجوان وکیل جو مسز درانی کا شناسا ہے اس حسینہ پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ اس نے اخباری نمائندوں سے خاصی بدتمیزی بھی کی تھی۔ اخبارات نے اس کی حرکات کو خوب اچھالا تھا اور لکھا تھا



لہ وہ جوان و میں ہر وقت دارالامان میں پھرنا سزا ہے۔ میں یہ خبر پڑھ کر انگاروں پر لوٹنے لگا۔ اگرچہ نیلم نے مجھ سے ایسی کسی بات کا تذکرہ نہیں کیا تھا مگر مجھے خدشہ تھا کہ اس جیسی خوبصورت لادارث لڑکی کو دیکھ کر کئی شوقین حضرات کی رال ٹپکی ہوگی۔ بہت سے ”معززین“ اسے اپنے ہاں ”پناہ“ دینے کے لئے آگے بڑھے ہوں گے۔ میرا خدشہ ایسا غلط نہیں تھا۔ جی چاہا اسی وقت اس وکیل کا پتہ چلاؤں اور اسے نیلم کی طرف ہوس ناک نظروں سے دیکھنے کا مزہ چکھاؤں۔ مگر پھر کچھ سوچ کر میں اپنا غصہ پی گیا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ نیلم کو آج ہی اس دارالامان سے نکال کر ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں کوئی بدنیت شخص اسے میلی نظر سے نہ دیکھ سکے۔

دن کے دس بجے میں نے گاڑی نکالی اور دارالامان کی طرف روانہ ہوا۔ دارالامان کی عمارت دن کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ باہر کل والے چوکیدار کی بجائے سانولے رنگ کا بھاری بھر کم چوکیدار کھڑا تھا۔ رات والا چوکیدار کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ گیٹ کے پاس میں نے دو تین اخباری نمائندوں کو منڈلاتے دیکھا۔ وہ لوگ کسی ”خبر“ کی تلاش میں تاک جھانک کر رہے تھے۔ ایک فوٹو گرافر عمارت کی تصویر لینے میں مصروف تھا۔ میں نے گاڑی کچھ دور ایک درخت کے نیچے پارک کر دی اور گاڑی میں بیٹھ کر عمارت کے باہر کھڑے فوٹو گرافروں اور اخباری نمائندوں کا جائزہ لینے لگا۔ جی چاہ رہا تھا آگے بڑھ کر ان کے کیمرے چھین لوں اور گھونسلوں اور تھپڑوں سے ان کے منہ لال کر دوں لیکن مصلحتاً میں نے خود کو روک رکھا۔ ایک پولیس والا بغلی گلی سے نمودار ہوا اور میری طرف غور سے دیکھتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں چوکیدار سے رات والے پٹھان کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا لیکن ان حالات میں گیٹ کی طرف جانا ٹھیک نہیں تھا۔ اس لئے میں نے گاڑی واپس موڑی اور بغلی گلی سے گزر کر کوٹھی کی پشت کی طرف روانہ ہو گیا۔ پیچھے ایک بڑا سا خالی پلاٹ تھا جس میں جگہ جگہ درخت اُگے ہوئے تھے۔ پلاٹ میں بکریاں چر رہی تھیں اور قریب ہی چار پائی پر ایک نو دس سالہ پٹھان بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ایک خالی جگہ گاڑی کھڑی کر کے اسے اپنے پاس بلایا تو وہ جھجکتا ہوا اٹھ کر گاڑی کے پاس آ گیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے اسے چمکارتے ہوئے پوچھا۔

”خاستہ گل!“ اس نے متوحش نظروں سے گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ نجانے کیوں سہم گیا تھا۔ میں نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ بچے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے بے یقینی سے نوٹ کی طرف دیکھا اور ہچکچاتے ہوئے یوں میری طرف دیکھنے لگا جیسے میرا مطلب جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”رکھ لو بیٹا رکھ او۔ خوشی سے دے رہا ہوں۔“ اس نے جھجکتے ہوئے نوٹ پکڑ لیا۔

”تم یہاں رہتا ہے؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

One Urdu Forum . Com

اس نے اس بات میں سر ہلایا اور پھر پچھ دور حالی پلاٹ کے سرے پر بے پتے بھوپڑی نما گھروں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس سے دارالامان کے چوکیدار کے متعلق پوچھا۔

”وہ بھی ایدر رہتا ہے!“ اس نے جلدی سے کہا اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر یہ کہہ کر ان گھروں کی طرف بھاگا۔ ”ام ابھی اس کو بلاتی ہے۔“

میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور انتظار کرنے لگا۔ بچہ ایک ایسے گھر میں داخل ہو گیا تھا جس کی چھت ٹین کی چادروں سے بنی ہوئی تھی اور اس پر بے شمار پرانے ٹائر، لکڑی کے ٹکڑے اور اینٹیں رکھی ہوئی تھیں مبادا ہوا کے زور سے چھت اڑ نہ جائے۔ دروازے پر ایک پرانا ٹاٹ لٹکا ہوا تھا جو نیچے سے پھٹا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد پھٹے ہوئے پردے سے مجھے ایک دوشیزہ کے گورے گورے ننگے پاؤں نظر آئے اور پھر اس نے پردے کے پیچھے سے مجھے جھانکا۔ اس نے سبز رنگ کا گھاگھا اور سرخ رنگ کی گھیردار شلوار پہن رکھی تھی۔ سر پر جامنی چنری تھی۔ بچے نے مجھے دور سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ چوکیدار گھر پر نہیں ہے۔

میں گاڑی سے باہر نکل آیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مکان کی طرف بڑھا۔ اس جگہ بہت گندگی تھی۔ کوارٹروں کے باہر کوڑے کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر تھے جہاں مرغیاں روڑی کریدنے میں مشغول تھیں۔ ایک کتا جو قریب ہی بندھا ہوا تھا مجھے دیکھ کر غرایا اور پھر بھونکنے لگا۔ میں بری طرح نزوس ہو گیا۔ آس پاس کے مکانوں سے کئی عورتیں مجھے جھانک رہی تھیں۔ باہر لگے میونسپلٹی کے نل کے پاس گھڑوں اور بالٹیوں کی لمبی قطار تھی جس کے قریب کھڑی ایک سانولی سی مہاجر لڑکی مجھے دیکھ کر نہ جانے کیوں ہنسنے لگی تھی۔ میں جیسے تیسے آگے بڑھا اور چوکیدار کے دروازے کے ایک طرف کھڑا ہو کر پٹھان دوشیزہ سے مخاطب ہوا۔

”کیا یہ دارالامان کے چوکیدار کا گھر ہے؟“

”ہاں مگر وہ گھر پر نہیں ہے۔“ دوشیزہ نے پردے کی اوٹ سے جواب دیا۔ میں سخت مایوس ہوا۔

”وہ کدھر ہے؟ مجھے اس سے ضروری کام ہے۔“

”وہ بازار گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”صدر میں قالین بیچتا ہے نا۔“

”کتنے بجے تک واپس آ جاتا ہے؟“

”چار بجے واپس آتا ہے پھر مغرب کے بعد ڈپٹی (ڈیوٹی) پر جاتا ہے۔“

میں واپس جانے کے لئے پلٹا تو دوشیزہ نے مجھے پکارا۔ ”نام بتا دو تو میں اس کو بتا دوں گی۔“

میں نے کچھ سوچ کر صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا۔ ”اسے بولنا وہ صاب آیا تھا جو کل شام نیلم بی بی سے ملا تھا۔“ یہ کہہ کر میں واپس پلٹا۔ معاً مجھے ایک خیال آیا اور میں نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔



صدر میں وہ قایلین کی دکان یا اڈے پر پہنچا ہے یا پل پھر رہا؟

”اڈہ تو کوئی نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کندھے پر قایلین ڈال کر پھیری لگاتا ہے۔“

”اچھی بات ہے میں اس سے ادھر ہی مل لوں گا۔“ میں نے جواب دیا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں صدر پہنچ چکا تھا۔ اس وقت گیارہ بجے تھے۔ صدر میں زیادہ رش نہیں تھا۔ میں نے ایک جگہ سڑک کے کنارے گاڑی پارک کی اور باہر نکل کر متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

قریب ہی کئی پٹھان نوجوان لنڈے کے کوٹوں سے بنے واسکٹ گھڑیاں اور پرانے جوتے بیچتے دکھائی دے رہے تھے لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ مجھے اپنی نالائقی پر افسوس ہوا۔ مجھے کم از کم اس لڑکی سے چوکیدار کا نام ہی پوچھ لینا چاہیے تھا۔ نام معلوم ہوتا تو میں ان نوجوانوں سے اس کا اتہ پتہ پوچھ سکتا تھا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر پورے بازار کا چکر لگایا۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ مایوس ہو کر واپس لوٹنے کا ارادہ باندھ رہا تھا کہ دفعتاً ایک گاڑی کی چھت پر مجھے سرخ رنگ کا ایک قایلین پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ میں گاڑی ایک جگہ پارک کر کے بجلت اس جگہ پہنچا۔ قایلین بیچنے والا پٹھان ہی تھا مگر وہ کوئی اور آدمی تھا۔

”خان صاحب ادھر صدر میں کوئی اور آدمی بھی قایلین بیچتا ہے؟“

خان نے میرا مطلب نہ سمجھتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”صاب! قایلین صرف ام بیچتا ہے۔“

باقی سب ایدرناٹ بیچتا ہے۔ بولو کیا لینا ہے؟ کوئی ایرانی افغانی غالیچہ دکائے؟ ایک دم سستا دے گا!“

میں نے بیزاری سے آنکھیں بند کر کے نفی میں گردن ہلائی اور خان سے کہا۔ ”خان صاحب مجھے قایلین نہیں چاہیے۔ میں ایک آدمی کو ڈھونڈ رہا ہوں جو ریلوے اسٹیشن کے پاس دارالامان کا چوکیدار ہے اور دن کے وقت وہ صدر میں قایلین بیچتا ہے۔“

خان نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑی دیر سوچا اور پھر مجھ سے پوچھا۔ ”نام نہیں آتا ہے؟“

”نہیں، نام تو نہیں معلوم۔ وہ ریلوے روڈ پر کچی بستی میں رہتا ہے۔ گٹھے ہوئے جسم والا خاصا صحت مند آدمی ہے۔“

”امارا خیال ہے تم رئیس خان کے متعلق پوچھتا ہے۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تم ایسا کرو یہاں سے اگلے چوک کی طرف چلے جاؤ۔ اودر بنک کا بلڈنگ ہے۔ اس کے سامنے وہ تمہیں مل جائے گا۔“

میں نے خان کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر اگلے چوک میں پہنچ گیا۔ اس بار مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ وہی چوکیدار بنک کے سامنے ایک کٹے ہوئے بالوں والی بھاری بھر کم خاتون کو قایلین دکھا رہا تھا! میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔

میں نے گاڑی کھڑی کی تو اس نے میری طرف دیکھا۔ خاتون شاید قایلین خریدنے میں کوئی دلچسپی

میں رہی سی۔ وہ قایلین پور کر رہے تھے۔ بھاری بھر کم خاتون کی ایک طرف پس پڑی سی۔ خان نے اپنی بھائی ہوئی قیمت کم کر کے اسے پیچھے سے کئی آوازیں دیں مگر وہ سنی ان سنی کر کے تیزی سے ہجوم کا حصہ بن گئی۔

خان نے بڑبڑاتے ہوئے قایلین سمیٹا اور اسے کندھے پر ڈال کر دوبارہ میری طرف دیکھا۔ دفعتاً اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہوئی اور وہ مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھا۔

”صاحب قایلین لینا ہے؟ آپ کے لئے صرف دو سو روپے ایک دانہ بچا ہے۔“

”ٹھیک ہے خرید لیا!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا اور پتلون کی جیب سے بٹو نکال کر دو سو روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور پھولی ہوئی سانسوں سے بولا۔

”خرید لیا! ایک دم خرید لیا؟“

”ہاں ہاں خرید لیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اسے قایلین اندر رکھنے اور خود بھی ساتھ بیٹھنے کو کہا۔

”مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے؟“ میں نے اس سے بہت بے تکلفی سے کہا۔ ”کل کی طرح..... مجھے دوبارہ نیلم بی بی سے ملنا ہے!“

وہ بلا جھجک گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے میری بات سن کر لمحہ بھر کا توقف کیا اور پھر کہنے لگا۔

”صاب آج رہنے دو..... بہت مشکل ہوگا..... امارا نوکری کا سوال ہے۔ بیگم درانی کو پتہ چل گیا تو امارا شامت آجائے گا۔ وہ ام کو ایک دم نوکری سے نکال دے گا۔“

”اس نوکری کی تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟“ میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”صاب ایک سو بیس روپیہ ملتا ہے۔ مغرب سے صبح فجر کی نماز تک ڈپٹی (ڈیوٹی) ہوتا ہے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔ ”مولا کریم کا بہت شکر ہے۔ پانچ سال سے ام یہ نوکری کر رہا ہے۔“

میں نے صدر سے باہر نکلتے ہوئے ایک متروک عمارت کے سامنے گاڑی کھڑی کر دی اور کہا:

”رئیس خان ہم تم کو اتنا پیسہ دے گا کہ تم نوکری سے بے فکر ہو جائے گا۔ لیکن تم کو ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔ فی الحال تم یہ قایلین بھی رکھو اور دو سو روپیہ بھی رکھو..... بولو ہمارا کام کرے گا؟“

غریب چوکیدار لمحہ بھر کے لئے گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ آگے جھک کر ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

”صاب کام کیا ہے؟ لڑکی سے ملنا ہے یا کوئی اور بات ہے؟“

”اور بات ہے“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”اسے بنگلے سے نکالنا ہے!“

چوکیدار کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے میری ذہنی صحت پر شبہ کر رہا ہو۔



نکلنا ہے؟ اس نے میرت اور فیصد رتاسف سے کہا۔۔۔ یہ تم کیا لہہ رہی ہے! ام ایسا کام نہیں کرتا۔“

”خان تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں اسے کسی غلط مقصد کے لئے نہیں لے جا رہا بلکہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک بے سہارا لڑکی ہے۔ تم اس نیک کام میں میری مدد کرو گے تو خدا تم سے خوش ہوگا۔“

”وہ تو ٹیک ہے لیکن۔۔۔۔۔“

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوہ نکالا اور سو سو کے دس نوٹ اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں واضح طور پر لرزش آ گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں تمہیں پانچ ہزار روپے دوں گا۔“ میں نے اس کے متوحش چہرے پر نظریں جما کر آہستگی سے کہا۔ ”یہ ایک ہزار روپیہ ایڈوانس ہے۔ تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ آج رات دس بجے نیلم بی بی کو میرے حوالے کر دو۔ میں اسے گیٹ پر لینے آؤں گا!“

وہ گنگ ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے جو رقم بتائی تھی یا تو وہ اس کے تصور سے کہیں زیادہ تھی اور یا پھر جو کام میں نے بتایا تھا وہ اس کے مضمرات کے متعلق سوچ کر پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ مخاطب کیا تو وہ چونک پڑا۔

”صاب بہت مشکل ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پولیس ام کو نہیں چھوڑے گا۔“

”دیکھ لو خان!“ میں نے اس کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی۔ ”تم ساری رات ڈیوٹی دیتا ہے اور دن کے وقت قالین بیچتا ہے مگر پھر بھی تمہارا گزارہ مشکل سے ہوتا ہے۔ میں نے تمہارا گھر بھی آج دیکھا ہے۔ بہت خستہ ہے۔ پانچ ہزار سے تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ اپنی بچی کی شادی کر سکتے ہو۔ اپنا کاروبار شروع کر سکتے ہو۔ چوکیداری میں کیا رکھا ہے؟“

تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ چوکیدار نرم پڑ گیا۔ ”ٹیک ہے ام تمہارا کام کر دے گا مگر پیسہ چھ ہزار سے کم نہیں لے گا۔ وہ جو اندر ایک عورت ہے جس سے کل ام نے بات کیا تھا اسے بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا۔“

میں نے فوراً حامی بھر لی۔

”ٹھیک ہے رئیس خان! اب میں پورے دس بجے گاڑی لے کر گیٹ کے پاس آؤں گا۔ باقی تمام رقم تمہیں اس وقت مل جائے گی۔ شام کو ڈیوٹی پر جاؤ تو نیلم کو بتا دینا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ قالین میں نے اسے واپس دے دیا تھا۔

شام تک میں نے سارے انتظامات کر لئے۔ نوشین سے آنکھ بچا کر میں نے اس کے دو جوڑے ایک بیگ میں ڈالے۔ اپنے ضروری کپڑوں کے علاوہ امی کی ایک سندھی چادر بھی رکھ لی اور بیگ ڈنگی میں رکھ دیا۔ پیسوں کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ ویسے تو بینک میں میرا ذاتی اکاؤنٹ بھی تھا مگر سر دست اس میں دو اڑھائی ہزار سے زیادہ رقم نہیں تھی۔ بہر حال میں نے یہ پیسے نکلوا لئے اور مزید رقم کے لئے گھر میں ادھر ادھر تاک جھانک شروع کر دی۔ دادی جان کی وفات کی وجہ سے مہمان داری کے فوری اخراجات کے لئے ابو نے رقم نکلوائی تھی۔ میں نے اس کے متعلق سن گن لی تو مجھے معلوم ہوا کہ ابو نے رقم ایک بریف کیس میں اپنی الماری میں رکھی ہوئی ہے۔ الماری کو تالا لگا ہوا تھا۔ تالے کو توڑنا چنداں دشوار نہیں تھا۔ لیکن ابو کو تالا ٹوٹنے کی خبر فوراً ہو جاتی۔ اس لیے بہت سوچ بچار کے بعد میں بازار سے بالکل ویسا ہی تالا لے آیا۔ ابو اور امی نیچے تھے۔ کمرہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر گھس کر چٹخنی چڑھالی۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ آج تک میں نے چوری نہیں کی تھی۔ مجھے جو کچھ چاہیے ہوتا بس ایک مرتبہ منہ ہلانے سے مل جاتا تھا۔ ہزار بارہ سو کی بات ہوتی تو میں امی یا ابو سے مانگ لیتا مگر میری ضرورت اب چند ہزار روپوں سے پوری نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے رات ساڑھے گیارہ بجے کی فلائٹ سے ڈھاکہ جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ جہاں مجھے نیلم کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ ڈھاکہ میں میرا ایک گہرا دوست اور کلاس فیلو طاہر مسعود رہتا تھا۔ اسے میں نے فون پر یہ بتایا تھا کہ میں نے والدین سے بغاوت کر کے پسند کی شادی کی ہے جس کی وجہ سے مجھے اور میری بیوی نیلم کو خاندان بھر کی مخالفت کا سامنا ہے۔ اندریں حالات میرے لئے کراچی میں رہنا ممکن نہیں رہا، جس کی وجہ سے میں نے کراچی سے دور کسی گوشہ عافیت میں سکونت پذیر ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ غلط بیانی تھی مگر ایسا کرنا مجبوری تھی۔ اگر میں اسے سچ بتاتا تو ممکن ہے وہ میری مدد کرتے ہوئے ذہنی تحفظ کا شکار ہو جاتا۔ مگر میری گھڑی ہوئی کہانی سن کر اس نے میری مدد کرنے پر فوری آمادگی ظاہر کر دی تھی اور مجھے یقین دلایا تھا کہ ڈھاکہ یا کسی اور مقام پر سیٹل ہونے میں وہ میری پوری مدد کرے گا۔ وہ میرے جملہ اخراجات کا بار اٹھانے پر بھی تیار تھا۔ مگر میں اس پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں اپنا خرچ خود اٹھانا چاہتا تھا۔ میرے پاس جو رقم تھی وہ میں نے اپنے اور نیلم کے ٹکٹ پر خرچ کر دی تھی۔ مزید رقم کے لئے مجھے ابو کے بریف کیس پر ہاتھ صاف کرنا تھے۔

میں اپنے ساتھ لوہے کا ایک راڈ پلاس اور پیچ کس لایا تھا۔ تالا توڑنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ اندر ابو کا بریف کیس پڑا تھا جس پر نمبروں والا تالا لگا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے معلوم تھا کہ ابو ہمارے گھر کے ٹیلی فون نمبر کے پہلے تین ہندسے بریف کیس کے تالے کو بند کرنے کے لئے بطور کوڈ استعمال کرتے ہیں۔ میں نے یہ تینوں ہندسے لگائے تو تالا کھل گیا۔ بریف کیس نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے



پہلے چہرہ ہر طرف سے لگا ہوا تھا۔ وہ لڑکی نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ کمرے کو اندر سے بند کر کے میں نے بریف کیس خالی کیا اور رقم ایک دستی بیگ میں ڈال لی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں نے نوشین کے نام مندرجہ ذیل مضمون کا خط تحریر کیا:

”پیاری نوشی!

میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ امی نے جسے اپنے گھر سے نکال کر دارالامان بھجوا دیا تھا، وہ لڑکی میرے لئے کتنی اہم بن چکی ہے اس سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ میں نے یہاں سے بہت دور جا کر اس سے شادی کر لینے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس طرح ایک تو وہ اس ماحول سے نکل آئے گی۔ دوسرا یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ امی اور ابو ناہید سے میری شادی کرنے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ تمہیں معلوم ہے مجھے ناہید سے کوئی دلچسپی نہیں۔ گو وہ اچھی لڑکی ہے لیکن جیون ساتھی کے متعلق میرے اپنے کچھ تصورات ہیں۔ ان تصورات پر صرف اور صرف نیلم پوری اترتی ہے۔ اور نیلم میری بیوی بنے امی کو قطعاً پسند نہیں۔ ظاہر ہے ابو تایا جان اور تائی جان بھی یہ بات پسند نہیں کریں گے۔ ان حالات میں میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں اسے لے کر کہیں دور چلا جاؤں۔ امی اور ابو کو یہ خط پڑھا دینا۔

خدا حافظ

تمہارا بھائی، بوبی

خط تمہ کر کے میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا اور نیچے آ گیا۔ اب بھی چند لوگ تعزیت کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ ابو اور تایا جان کو وہاں بیٹھے دیکھ کر میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا اور فاتحہ میں شریک ہوتا رہا۔ نوبت کے میں نے ابو سے ایک ضروری کام سے باہر جانے کی اجازت لی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ان کا بیٹا انہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ لمحہ بھر کے لئے میرا دل اُمنڈا مگر میں نے بالجبر اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔

اوپر آ کر میں نے دستی بیگ اٹھایا اور نوشین کے کمرے میں جھانکا۔ وہ نیچے تھی۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر جیب سے رقعہ نکالا اور اس کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے نوشین سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اوپر کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ میرا دل ایک دم زور سے دھڑکا۔ اس نے میرے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر اچنبھے سے پوچھا۔

”بوبی! یہ بیگ لے کر کدھر جا رہے ہو؟“

میں گڑبڑا گیا۔ سوال بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔

”نوشی! بات سنو.....“ میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”ذرا نیچے چلو مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔“

اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر اوپر جانے لگی۔

”کیا بات کرنی ہے؟“ وہ بھنویں اچکاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”یہیں کر لو مجھے کمرے سے ایک چیز لینی ہے۔“

”یہاں وہ بات نہیں ہو سکتی۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے کھینچتے ہوئے کہا اور اسے ساتھ لئے نیچے پورچ میں آ گیا۔ میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ گاڑی کو چابی لگا کر میں نے بیگ اندر رکھا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ گاڑی کے پاس کھڑی ہو کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔

”ہاں کیا بات تھی؟“ اس نے استفسار کیا۔

”کچھ نہیں!“ میں نے مسکراتے ہوئے کی کوشش کی۔ ”بس کچھ دیر تم سے یونہی باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ان دونوں میں تو تم آدھی ہو گئی ہو!“

”ہاں بوبی بھائی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ”آپ کا دوست کدھر ہے جو بیگ لینے آیا ہے؟“

”اوہ.....!“ میں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بات بنائی۔ ”وہ لینے نہیں آیا، میں اسے دینے جا رہا ہوں..... قریب ہی رہتا ہے۔“

میرے انداز میں بوکھلاہٹ تھی۔ وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے گاڑی ریورس کی اور گیٹ سے باہر آ گیا۔ وہ نہ جانے کیوں ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ میرا جی چاہا، واپس ہولوں۔ اسے اپنے سینے میں بھر لوں۔ وہ میری سب سے پیاری بہن تھی۔ مگر میں نے فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور گھر پر ایک اچھٹی ہوئی نگاہ ڈال کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ میری پلکوں پر اس سے آنسو لرز رہے تھے۔

جب میں دارالامان کے سامنے پہنچا تو تقریباً دس بجے ہوں گے۔ فلائٹ کی روانگی میں صرف پونے دو گھنٹے باقی تھے۔ مجھے اگلے پندرہ بیس منٹ میں سب کام نمٹانا تھا۔ گاڑی درخت کے نیچے کھڑی کر کے میں گیٹ کے قریب آیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت دوروز دیک کوئی آدم زاد نہیں تھا۔ گیٹ کے پاس جا کر میں نے آہستگی سے سیٹی بنائی۔ اگلے ہی لمحے رئیس خان چوکیدار باہر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے چھوٹا



”وقت کم ہے رئیس خان!“ میں نے اسے رقم تھماتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”اب جلدی سے نیلم بی بی کو بلواؤ۔“

اس نے رقم گنتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور مجھے انتظار گاہ میں جانے کو کہا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ چوری کے بعد اب میں اغواء کا جرم کرنے جا رہا تھا لیکن میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھایا۔

”یہ اغواء نہیں ہے۔ وہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ جانا چاہ رہی ہے۔ وہ میری محبت ہے اپنی محبت کو حاصل کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔“

میں انتظار گاہ میں داخل تو ہو گیا لیکن دروازے کے قریب چوکنہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ رئیس خان چوکیدار پر اعتماد کرنا میری مجبوری تھی لیکن اس پر اندھا اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسی خیال سے میں نے گھر سے نکلتے ہوئے اپنا بھرا ہوا پستول اپنی جیب میں رکھ لیا تھا تاکہ کسی بھی ہنگامی صورت حال سے بچنا جاسکے۔

چوکیدار تھوڑی ہی دیر میں واپس پلٹ آیا۔ نیلم اس کے ساتھ تھی۔ میرا دل مسرت اور ہیجان سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر نیلم کا ہاتھ تھام لیا اور باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ رئیس خان نے مجھے ذرا دیر ٹھہرنے کو کہا اور دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی ایک رسی اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

”صاحب! اس رسی سے ام کو کرسی پر باندھ دو اور منہ میں رومال ٹونس دو۔۔۔ تاکہ ام کہہ سکے کہ اغواء کرنے والا لوگ ام کو کرسی کے ساتھ باندھ کر نیلم بی بی کو زبردستی لے گیا ہے۔“

میں نے دل ہی دل میں چوکیدار کی ذہانت کی داد دی اور نیلم کی مدد سے جلدی جلدی اسے رسی سے باندھ کر رومال اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

”وہ عورت کدھر ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

نیلم ہنسنے لگی اور پھر فوراً منہ پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے بولی۔ ”بیچارے کا منہ تو ہم نے بند کر دیا ہے۔ پھر بھلا وہ جواب کیسے دے سکتا ہے؟“ پھر خود ہی بتانے لگی۔ ”اب اسے اس چوکیدار نے اوپر کے باتھ روم میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی ہے بڑا ڈرامے باز ہے۔“

”واقعی!“ میں نے آہستگی سے کہا اور اسے لے کر باہر آ گیا۔ میں بے حد خوش تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس خوشی پر اوس پڑ گئی۔ ابھی ہم باہر نکلے ہی تھے کہ گیٹ کے سامنے ایک کار کے بریک چرچرائے اور اس کی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اگلے ہی لمحے گاڑی کا دروازہ کھلا اور ایک شخص تیزی سے ہماری طرف لپکا۔

☆.....☆.....☆



لمحہ بھر کے لئے میں حواس باختہ ہو گیا۔ نیلم بھی گھبرا گئی ہم دونوں ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ وہ آدمی تیزی سے نیلم کی طرف بڑھا اور اس کا بازو تھام کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”نیلم تم کہاں جا رہی ہو؟ یہ نو جوان کون ہے؟“ وہ اس سے یوں بات کر رہا تھا جیسے اس کا پرانا شناسا ہو اور اس سے حد درجہ قریب ہو۔ نیلم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو اس نے درشتی سے مجھے مخاطب کیا۔

”اوائے کون ہو تم اور اسے کدھر لے جا رہے ہو؟“

اس کی اوائے کا جواب میں نے ایک زوردار گھونسنے سے دیا۔ وہ اپنی کار سے ٹکرا کر زمین پر آ رہا۔ میں نے لپک کر اسے دوبارہ اٹھالیا اور تھپڑوں اور گھونسوں سے اس کا منہ لال کر دیا۔ میرے وجدان نے مجھ پر یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ محمد حنیف نامی وہی وکیل ہے جو نیلم پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ نیلم کا حسن زہد شکن کسی بھی مرد کو متزلزل کر سکتا تھا مگر میرے لئے کسی رقیب کا تصور ہی سوہان روح تھا۔ میں کسی کو نیلم کا نام لیتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ جسمانی لحاظ سے وہ مجھ سے ہر گز کم تر نہیں تھا مگر میرے پاس جو جذبہ تھا، وہ اسے چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ میں نیلم کے عشق کی آگ میں جل رہا تھا۔ میرے دل میں اس کی محبت کا شعلہ فروزاں تھا۔ اس کے پاس کیا تھا، ہوس؟..... ہوس کبھی محبت کی طاقت کو سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ وہ بھی میرے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ لیکن اس کے ترکش میں ابھی ایک تیر باقی تھا۔ میں اسے چپت کر کے نیلم کا ہاتھ تھامے اپنی گاڑی کی طرف بھاگا ہی تھا کہ عقب سے ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور میری ٹانگوں سے گزرتی ہوئی سامنے دیوار میں پیوست ہو گئی۔ میں نیلم کو اپنے ساتھ چمٹا کر سڑک کنارے اُگی ہوئی گھاس پر لوٹ گیا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر جیب سے اپنا پستول نکالا اور نیلم کو اپنی گاڑی کی طرف جانے کا اشارہ کر کے اندازے سے گولی چلائی۔ میرا دمقابل یا تو کوئی بے وقوف شخص تھا یا اس کے سر پر ایسی دھن سوار تھی جس نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دی تھیں۔ ادھر میں نے گولی چلائی، ادھر وہ اپنی دانست میں مجھے زخمی کر کے میری گاڑی کی طرف لپکا۔ اس نے نیلم کو گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی گاڑی کی اوٹ سے نکلا ہی تھا کہ میرے پستول کی گولی نے اسے جالیا۔ اس نے ایک بھیا نک چیخ ماری اور کسی تناور درخت کی طرح



پہلے میری زندگی میں ایک ڈرائی بس ایک لہری سانس تھی پتھر وادے کی۔ یہ دھڑکا پچھ غلط بھی نہیں تھا۔ میں نے چند گھنٹوں میں کئی جرم کئے تھے۔ میں نے اپنے ابو کی الماری سے ہزاروں روپے نکالے تھے، قانون شکنی کرتے ہوئے دارالامان سے نیلم کو نکال لایا تھا اور ایک وکیل کو قتل کر کے شہر سے فرار ہو رہا تھا۔ پولیس مستعدی دکھاتی تو مجھ تک پہنچنا ایسا دشوار نہیں تھا۔ کئی لوگوں نے میری سفید رنگ کی فورڈ کار کو جائے واردات سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ گو میں نے وہ گاڑی ایک ویران جگہ پر چھوڑ دی تھی مگر کوئی بھی ذہین افسر اسے دیکھ کر میرے فرار کی سمت اور ذرائع کا اندازہ لگا سکتا تھا کیونکہ گاڑی جہاں کھڑی تھی اس مقام سے ایئر پورٹ کا فاصلہ خاص کم تھا۔ شہر سے فرار کے صرف چار طریقے ہو سکتے تھے۔ ریل، ہوائی جہاز، بحری سفر یا سڑک کا راستہ! ریلوے اسٹیشن دارالامان کے پہلو میں واقع تھا۔ اگر اغواء کنندہ بذریعہ ریل فرار ہونے کا ارادہ کرتا تو اس کی گاڑی ریلوے اسٹیشن کے قریب کھڑی ملتی۔ اگر سمندر کا رخ کرتا تو گاڑی بندرگاہ کے قریب میں پائی جاتی۔ اگر وہ سڑک کے راستے فرار ہونا چاہتا تو شہر کے اندر گاڑی بدلنے کی کوشش نہ کرتا۔ اس صورت میں وہ گاڑی شہر سے باہر کسی ویران مقام پر چھوڑ دیتا۔ گاڑی شہر کے اندر ایئر پورٹ سے قریب ملنے کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ یا تو اغواء کنندہ مغویہ سمیت کسی قریبی مقام پر چھپا بیٹھا ہے اور یا پھر ایئر پورٹ کی جانب روانہ ہوا ہے۔

میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ پولیس کا دھیان ایئر پورٹ کی طرف نہ جائے۔ میں نے نیلم کی جانب دیکھا وہ میرے پہلو میں بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دینے کیلئے اس کا ہاتھ دبایا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ آس پاس بے شمار لوگ بیٹھے تھے۔ ہر کوئی اپنی ذات میں مگن تھا۔ کئی جوڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور کوئلڈ ڈرنکس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے ارد گرد کئی دلکش چہرے دیکھے مگر نیلم جیسا کوئی نہ تھا۔ سب حسیناؤں کا حسن اس کے سامنے گہنا گیا تھا۔ مجھے اس حقیقت کا احساس تھا کہ میرے ساتھ ایک نہایت خوبصورت لڑکی ہے جس کی جانب ہر نگاہ اٹھے گی اور بار بار اٹھے گی۔ میں خود بھی کم خوبرو اور وجہ نہیں تھا۔ محفل میں لوگ فوراً میری طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اسی لئے لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لئے میں نے خود ایک معمولی لباس پہن رکھا تھا جبکہ نیلم کو امی کی سندھی چادر اوڑھادی تھی۔ اس انتظام کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ بہت کم لوگوں نے ہماری طرف توجہ دی۔

خدا خدا کر کے جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا۔ میں نیلم کو ساتھ لے کر فوراً قطار میں جا کھڑا ہوا۔ عملے نے ہمارے بورڈنگ کارڈ دیکھے اور باہر کھڑی بس کی طرف رہنمائی کی جو ہمیں جہاز تک پہنچانے کیلئے تیار کھڑی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ہم جہاز کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

جب ہم سیٹوں پر بیٹھ گئے تو دل نے اطمینان پکڑا۔ نیلم میرے ساتھ بیٹھی تھی اور پیار بھری نظروں

مجھے اب اپنی گاڑی کی طرف دوڑ لگا دینی چاہیے تھی مگر زمین نے جیسے میرے وجود کو جکڑ لیا۔ مجھ پر ایک دم خوف طاری ہو گیا۔ پستول پر گرفت کمزور پڑ گئی اور وہ میرے بے جان ہاتھ سے پھسل کر لمبی لمبی گھاس میں گر گیا۔ اپنے ہاتھوں ایک جیتے جاگنے انسان کے قتل نے مجھے لرزادیا تھا۔ میرا پورا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں اسے صرف زخمی کرنا چاہتا تھا۔ مارنا ہرگز نہ چاہتا تھا۔

نیلم چیخ چیخ کر مجھے بلا رہی تھی۔ میں نے بمشکل اپنی ہمت مجتمع کی اور اٹھ کر گاڑی کی طرف دوڑ لگا دی۔ میرا پورا وجود اسپینے میں نہا گیا تھا۔ میں نے گاڑی کھلی چھوڑ دی تھی۔ چابی البتہ جیب میں ڈال لی تھی۔ انکیشن میں چابی لگا کر میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے گاڑی اسٹارٹ کی اور نہایت تیزی سے ایک بڑی سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔ بغلی گلی سے جہاں کچی آبادی تھی میں نے کچھ آدمیوں کو بھاگتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ انہوں نے یقیناً گولیاں چلنے کی آوازیں سنی ہوگی۔ ان میں سے ایک نے میری گاڑی کو دیکھ کر چلا تے ہوئے کچھ کہا مگر میں برق رفتاری سے آگے نکل گیا تھا۔

میں نے دانستہ ایک دوسرے کوں پر اپنا رخ بدلا جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ میرے تعاقب میں کوئی نہیں آ رہا تو میں نے سکون کا سانس لیا اور ایئر پورٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ نیلم میرے پہلو میں خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے تصدیق کی کہ وہ محمد حنیف وکیل ہی تھا۔ میں نے اس موضوع پر مزید بات چیت نہیں کی۔

جب ایئر پورٹ قریب آ گیا تو میں نے گاڑی ایک اندھیری گلی میں زیر تعمیر عمارت کے پہلو میں کھڑی کی اور نیلم کا ہاتھ تھامے دوبارہ سڑک پر آ گیا۔ ہمارے پاس دو بیگوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک میں کپڑے تھے اور دوسرے میں رقم جو انسان کی بیساکھی ہے۔ اس کے بغیر انسان اپنا ج ہے بیکار ہے۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر اس بیساکھی کے بغیر دو قدم نہیں چل سکتا۔ ابھی وہاں کھڑے ہوئے بمشکل دو تین منٹ گزرے تھے کہ ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ دس منٹ بعد ہم ایئر پورٹ پہنچ چکے تھے۔ جہاز کی روانگی میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ بورڈنگ کارڈ لینے اور سامان کی چیکنگ وغیرہ میں آدھ گھنٹہ صرف ہوا۔ نوٹوں سے بھرے ہوئے دستی بیگ کے متعلق مجھے خدشہ تھا کہ اسے دیکھ کر ہم پر شبہ کیا جائے گا لیکن حیرت انگیز طور پر کسی نے استفسار نہیں کیا۔ چیکنگ کے عملے نے دونوں بیگ کنویئر بیلٹ پر رکھے اور انہیں میٹل ڈی ٹیکٹر مشین سے گزارا۔ چند لمحوں بعد بیگ دوسری طرف تھے۔ روپوں والا بیگ میں نے ہاتھ میں تھام لیا اور دوسرا جمع کروادیا۔ ہم دونوں اندر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ میرا دل اب بھی بڑی طرح دھڑک رہا تھا یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں نے چوری کی ہے پکڑے جانے کے خوف سے کسی اندھیرے کونے میں چھپا ہوا ہوں اور مجھے ڈھونڈنے والے میرے ارد گرد اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار



اس کے بالوں اور جسم سے اٹھنے والی خوشبو مجھے مدھوش کرنے لگی۔ جی چاہا اسے اپنے بازوؤں میں بھر لوں۔ اس کے قرب نے مجھ پر نشہ سا طاری کر دیا تھا۔ نیلم نے میری آنکھوں اور میرے چہرے سے میری اندرونی کیفیت بھانپ لی تھی۔ وہ شرارت سے آہستہ آہستہ کھنکھارنے لگی اور شریر آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا نے لگی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سنبھل کر بیٹھ گیا اور جہاز میں بیٹھے دوسرے مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دلکش نسوانی آواز نے حفاظتی بند باندھنے کی ہدایت کرتے ہوئے پرواز کی روانگی کا اعلان کیا۔

دوران پرواز ہم سرگوشیوں میں محو گفتگو رہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک دوسرے کو آموختہ محبت سناتے رہے۔ اس کی دلنشین باتوں کا رس میرے کانوں میں ٹپکتا رہا۔ اس کی خوبصورت مسکراہٹیں مجھے حیات نو بخشی رہیں۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی من موہنی شخصیت کا سحر میرے حواس پر گہرا مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔ ادھر میں نے بھی اپنے پاس کچھ باقی نہ رکھا۔ میں نے کتابوں میں محبت و الفت کے بارے میں جو کچھ پڑھا تھا، حسن و زیبائی اور جمال و رعنائی کی تعریف میں جو کچھ سنا تھا، اس کی نذر کر دیا۔ ہر شعر اور ہر فقرے پر اس کے گال مزید لال ہوتے گئے۔ اس کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔ میں نے اپنا دل چیر کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہم ایک دوسرے میں کھوئے رہے یہاں تک کہ جہاز ڈھا کہ کی فضاؤں میں داخل ہو گیا۔

ایئر پورٹ پر میرا دوست طاہر مسعود ہمیں لینے کے لئے آیا ہوا تھا۔ اسے میں پہلے ہی مطلع کر چکا تھا۔ طاہر نے کچھ عرصہ کالج میں میرے ساتھ پڑھا تھا اور تھوڑے ہی وقت میں میرا گہرا دوست بن گیا تھا۔ اس کے والد ایک سپورٹ اپورٹ کا کاروبار کرتے تھے اور کراچی میں مقیم تھے۔ انہوں نے سال بھر پہلے پہلے ڈھا کہ میں اپنے بزنس کی ایک شاخ قائم کی تھی اور اپنے نوجوان بیٹے طاہر مسعود کو اس کا انچارج بنایا تھا۔ وہ مشرقی پاکستان سے دستکاری اور پٹ سن کی مصنوعات بیرون ملک بھجواتا تھا اور وہاں سے ملکی مشینری درآمد کرتا تھا۔

طاہر نہایت گرم جوشی اور تپاک سے ملا۔ نیلم سے وہ بہت مہذب انداز میں پیش آیا۔ اس کی زبان اسے بھابی کہتے نہ تھکتی تھی۔ اس کے برتاؤ کو دیکھ کر میرے دل میں اس کی قدر پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ وہ ایک خاندانی آدمی تھا، شائستگی اور تہذیب سے عبارت! وہ بہت محبت سے ہمیں اپنی گاڑی تک لایا اور نیلم کے لئے آگے بڑھ کر خود دروازہ کھولا۔ میں اور نیلم پچھلی نشست پر بیٹھے جبکہ اس نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ سارا راستہ ہم اس کی دلچسپ باتوں اور لطیفوں سے محفوظ ہوتے رہے۔ نیلم بے حد خوش تھی، میں بھی مطمئن تھا۔ ہم دونوں تمام پریشانیوں کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

ہماری صفت سڑکوں پر بھاگ رہی اور پھر ایک عین عکاسی میں ڈال دی گئی۔ یہاں بڑے بڑے بنگلے تھے۔ ان بنگلوں میں سے ایک خوبصورت بنگلہ طاہر مسعود کی رہائش گاہ تھی۔ جہاں وہ تنہا رہتا تھا۔ گاڑی گیٹ کے سامنے رکی تو ایک بادب بنگالی ملازم نے گیٹ کھولا۔ گاڑی ڈرائیور سے گزر کر وسیع پورچ میں آ کر ٹھہر گئی۔ بنگلے کی تزئین و آرائش قابل دید تھی۔ پورچ میں بڑے بڑے پتوں والے سرسبز پودے رنگ برنگے گملوں میں سجے ہوئے تھے۔ لان میں موسمی پھولدار پودوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اندرونی حصے میں فرنیچر، قالین، پردے اور دیگر ڈیکوریشن پیمز گھر کے مکین کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کر رہے تھے۔ میں نے اور نیلم نے گھر کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ نیلم نے جملہ ہائے تحسین کے دوران جب یہ کہا کہ گھر میں صرف ایک کی محسوس ہو رہی ہے تو طاہر مسعود نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”آپ جیسا کوئی ملا تو یہ کی بھی دور ہو جائے گی“

اس کے اس برجستہ جملے نے نیلم کے گال سرخ کر دیئے اور میں اور طاہر مسعود کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ کچھ دیر ہم لاؤنج میں بیٹھے رہے اور چائے پیتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات بھی تھے مگر دوران پرواز اتنا کچھ کھایا تھا کہ مزید کچھ لینے کو جی ہی نہیں چاہا۔ گھڑیاں نے تین بجنے کا اعلان کیا تو ہم اٹھ گئے۔ ایک بوڑھی ملازمہ نے خواب گاہ کی طرف ہماری رہنمائی کی۔ طاہر مسعود کی نگاہ میں ہم دونوں شادی شدہ تھے اس لئے اس نے ہمارے لئے ایک ہی بیڈروم تیار کروایا تھا۔ بیڈروم کے دروازے پر بوڑھی ملازمہ نے مخصوص انداز میں نیلم کی بلائیں لیں جیسے بزرگ خواتین نئی نویلی دلہنوں کی لیتی ہیں۔ یہ دیکھ کر ہم دونوں مسکرا دیئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے نیلم کو چھیڑا۔

”دلہن! کیسی ہو.....؟“

”ٹھیک ہوں سرتاج.....“ اس نے بھی مسکراتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ایک دم شدت محبت سے میرے ساتھ لپٹ گئی۔ میں نے بھی بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ہم دونوں ظالم سماج کی دیواروں کو گرا کر اور خود کو ان کی دست برد سے بچا کر ایک محفوظ پناہ گاہ میں آ گئے تھے۔ تحفظ کے احساس نے ہمیں ایک دم ہر فکر سے آزاد کر دیا۔ اب ہمارے ذہن پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ ہم ایک دوسرے کی طرف بے تابانہ دیکھنے لگے۔ دونوں گنگ تھے۔ ہمارے منہ سے کوئی بات نہ نکل رہی تھی۔ چند لمحے ہم دونوں آنکھوں، سانسوں اور دھڑکنوں سے گفتگو کرتے رہے اور پھر ہونٹوں نے زبانوں کی کم مائیگی کی تلافی کر ڈالی۔ قریب تھا کہ ہم جذبات کی تلاطم خیز موجوں میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے کہ ایک پوتر خیال ہوا کے لطیف جھونکے کی طرح میرے ذہن میں در آیا۔ میں نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا:



ہوئے ہیں۔ تو را جھجھ جائے ہیں کہ لو جوان جوڑا لھر سے بھاگا ہوا ہے۔ رسک نہیں لیتے۔ عدالت کی راہ دکھاتے ہیں۔“

”ہاں مگر پانچ سو کا نوٹ تحفہ عقیدتاً الفتاً محبتاً اور ہدیہ پیش کیا جائے تو باا کراہ مان بھی جاتے ہیں۔“ میں نے خالص مولویانہ انداز میں کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

ہم تیار ہو کر نیچے اترے تو طاہر مسعود دفتر جا چکا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بوڑھی ملازمہ اور ملازم ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

ناشتے کی میز اشیائے خورد و نوش سے بھری ہوئی تھی۔ جام، توش، مکھن، انڈے، تلی ہوئی مچھلی، پراٹھے، چائے، انناس کا جوس اور نہ جانے کیا کیا۔ ہم ناشتہ کر رہے تھے کہ دفتر سے طاہر مسعود کا فون آ گیا۔ ملازم نے مجھے فون تھما دیا۔ دوسری طرف وہ چپک رہا تھا۔

”ہاں جناب ہو گئی صبح شب وصال!“ وہ مذاق کرنے لگا، پھر معذرت چاہتے ہوئے بولا ”مجھے ایک نہایت ضروری کام پٹانے کے لئے دفتر آنا پڑا، ورنہ چھٹی کا پروگرام تھا۔ بہر حال شام کو تم دونوں کی شادی کی خوشی میں میں نے دوستوں کو یہاں کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر پر مدعو کیا ہے، تیار رہنا۔ اور ہاں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تم دونوں کا اپنا گھر ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف ملازموں سے کہو۔

جہاں جی چاہے اٹھو بیٹھو۔ ملازموں کو خوب معلوم ہے کہ گھر میں میرے خاص مہمان آئے ہیں۔“

”اپنا گھر بھی کہتے ہو اور مہمان کا لفظ بھی استعمال کرتے ہو، یہ خوب ہے!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ارے یارا!“ وہ ہنسنے لگا ”الفاظ کے استعمال میں میں نے ہمیشہ مار کھائی ہے۔ مہمان کے لفظ کو

میری گفتگو سے حذف کر دو۔ یہ تمہارا اور نیلم بھابی کا اپنا گھر ہے بابا! جب تک چاہو یہاں رہو!“ وہ اسی

طرح اپنے خلوص کا اظہار کرتا رہا اور اس کے بعد اس نے ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

ناشتے کے بعد ملازم سے ٹیکسی لانے کو کہا۔ جب ٹیکسی آ گئی تو ہم دونوں شاپنگ کے بہانے گھر سے نکل

گئے۔ لالہ باغ قلعہ کے قریب ایک پرانی مسجد کے غریب امام سے میں نے بات کی تو نکاح کا مرحلہ

میرے اندازے سے بھی زیادہ آسانی کے ساتھ طے ہو گیا۔ اب ہم دونوں میاں بیوی تھے۔ اس دوران

ہم دونوں نے کرزن ہال سے ملحقہ بازار سے شاپنگ بھی کر لی اور تین گھنٹے کے اندر واپس گھر پہنچ گئے۔

اپنی خلوتوں کا تفصیلی حال کیا لکھوں؟ کمرے میں پہنچے تو ہماری بے تابیاں عروج پر تھیں۔ ہم ایک دوسرے

میں کھو گئے۔ اس کے بدن کا ریشم میرے ہاتھوں میں پھسلنے لگا۔ اس کے جسم کی خوشبو میرے ہر مسام میں

سرایت کر گئی۔ محبت اور چاہت کی آگ میں تپتے ہوئے دو بدن جذبات کے متلاطم سمندر میں اترے اور

بھرتی، شور مچاتی لہروں کے دوش پر نازک سی ناؤ کی مانند ہچکولے کھانے لگے۔ لمحہ بہ لمحہ یہ طوفان مزید

قیامت خیز ہوتا گیا۔ لڑکی جسے میں پھولوں کی طرح نرم و نازک اور خوشبو کے جھونکے کی طرح لطیف سمجھتا

نیلم..... میں خود کو ہانپنا چاہیے۔ اپنی ہماری سادی نہیں ہوتی!

”شادی کیا ہوتی ہے ایک مرد اور عورت کے درمیان باہمی ایجاب و قبول کی رسم۔“ وہ میری گردن میں اپنے مرمریں بازو جمائل کرتے ہوئے بولی۔ ”تم مجھے اپنا مانتے ہو اور میں بھی تمہیں اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں؟“

”نہیں نیلم..... دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول ضروری ہے۔“

”میں کب اس سے انکار کر رہی ہوں..... مگر سوچو اب تم کیسے اپنے دوست سے یہ بات کرو گے کہ ہم غیر شادی شدہ ہیں اور وہ ہمارے نکاح کا بندوبست کرے۔ تم اس سے کہہ چکے ہو کہ ہماری شادی ہو چکی ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ بظاہر وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، مگر میں اپنی تمام تر آزاد خیالی کے باوجود ایک پاک بندھن کی ابتداء بانداز دگر کرنے پر آمادہ نہ تھا..... نیلم نادان تھی۔ میں نے اسے پیار سے سمجھا بھجھا دیا اور قالین پر گدا بچھا کر لیٹ گیا۔

☆.....☆.....☆

دن چڑھے ملازمہ کی دستک سے میری آنکھ کھلی تو نیلم میرے سینے سے لپٹی کسمسار ہی تھی۔ رات کے کسی پہر وہ ڈر کر میرے پہلو میں آ لیٹی تھی۔ میں نے اسے بھینچ کر ماتھے پر بوسہ دیا اور کہا:

”نیلم اٹھو۔ میرے خیال میں ناشتے کے لئے بلایا جا رہا ہے۔ چلو پہلے تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو“

”اوہوں!“ اس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے لاڈ سے کہا ”میں نہیں اٹھ رہی۔

ناشتہ یہیں منگوالو.....“

”بری بات!“ میں نے پیار سے کہا ”یہ لوگ کیا سوچیں گے؟“

”کیا سوچیں گے؟ یہی سوچیں گے کہ نئے دولہا دلہن ہیں اور ہنی مون موڈ میں ہیں.....“

اس نے میری چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

میں ہنسنے لگا۔

”فکر نہ کرو ناشتے کے فوراً بعد نکاح کے مشن پر نکلتے ہیں تاکہ سوچنے والوں کی سوچیں حقیقی

ہو جائیں.....“

”تم کیا کرو گے؟“ وہ اچنبھے سے مجھے دیکھنے لگی۔

”تمہیں لے کر کسی امام مسجد کے پاس جاؤں گا۔ وہ مدر سے ہی سے دو گواہوں کا بندوبست کرے گا

اور زبانی ایجاب و قبول کروادے گا۔“

”چلو ٹھیک ہے!“ وہ مسکرائی۔ ”ویسے مولوی اس طرح تیار ہو جائے گا؟ یہ لوگ بڑے کانیاں



ہاں سرایا اس واقعہ کی تابیت ہوئی۔ میرا سبوت نام۔ اس پر مجھے بڑا مارا تھا اس لیے میں نے اس کی رخصتیوں کے مقابل کچی و کمتری محسوس کرنے لگا۔ بہت دیر بعد جب طوفان کا زور ٹوٹا تو میں تھک کر چور ہو چکا تھا لیکن نیلم بدستور میری طرف پیاسی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور..... رہنے دوا بھی ساغرو میں مارے آگے کی عملی تصویر بنی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈنر بے حد شاندار تھا۔ ہم دونوں نے فنکشن کی مناسبت سے خوبصورت اور دیدہ زیب ملبوسات زیب تن کئے۔ یہ سلعے سلائے لباس ہم نے صبح شاپنگ کے دوران خریدے تھے۔ میں نے نیلم کو سونے کا سیٹ بھی خرید دیا تھا تاکہ وہ دلہن ہی لگے۔ گولڈن کڑھائی کے نیلے کرتے پاجامے میں وہ بہت زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ سیاہ رنگ کے ڈنر سوٹ میں میری وجاہت کو بھی چار چاند لگ گئے تھے۔ محفل میں سب کی نظریں ہم پر مرکوز تھیں۔ لوگ برملا کہہ رہے تھے کہ انہوں نے آج تک ایسا خوبصورت جوڑا نہیں دیکھا.....! بہر کیف یہ فنکشن ہر لحاظ سے یادگار رہا۔

اگلے دو دن گھومنے پھرنے میں صرف ہوئے۔ مجھے ہر دم دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں پولیس ہمارے تعاقب میں ڈھا کہ نہ پہنچ جائے..... جہاز کے مسافروں کی لسٹ اگر چیک ہو جاتی تو پولیس کے لئے ہمارے پیچھے ڈھا کہ پہنچنا چنداں دشوار نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ڈھا کہ سے جلد از جلد کسی دوسرے شہر چلے جانے کا ارادہ باندھ لیا۔ تیسرے روز میں نے طاہر مسعود سے یہ اصرار کیا کہ وہ اب مجھے سیٹل ہونے میں مدد دے۔ میں زیادہ دیر اس کا مہمان بن کر رہنے پر آمادہ نہ تھا۔ میری ضد کو دیکھ کر اس نے مجھے آفر کی کہ میں چٹا گانگ میں واقع اس کے ذیلی دفتر کا انتظام سنبھال لوں۔ اس نے مجھے وہاں کا ایریا مینجر تعینات کر دیا اور یوں ہم دونوں چٹا گانگ آ گئے۔ یہاں میں طاہر کے لئے بندرگاہ سے مال چھڑواتا اور اسے ڈھا کہ روانہ کر دیتا تھا۔ اسی طرح بیرون ملک بذریعہ بحری جہاز مال کی ترسیل بھی میری ذمہ داری تھی۔

نیلم نے میری زندگی میں رنگ بھر دیئے تھے۔ وہ مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھی اور میرا بے حد خیال رکھتی تھی۔ میرے لباس، خوراک حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا بھی وہ خیال رکھتی۔ دفتر سے آتا تو میری ٹائی کی گرہ اور بوٹوں کے تسمے بھی وہ خود ہی کھولتی۔ میں اسے منع کرتا تو وہ مجھ سے خفا ہو جاتی۔ میرا دفتر جانا اسے پسند نہیں تھا۔ وہ مجھ سے لمحہ بھر کے لئے بھی جدا نہ ہونا چاہتی تھی۔ میں اس کے جذبات و احساسات سمجھتا تھا۔ کیسے نہ سمجھتا، خود میری بھی یہی حالت تھی لیکن میں اپنے دوست پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ کام کرنا میری مجبوری تھی۔

میں نے سن رکھا تھا کہ عورت جب کسی گھر میں آتی ہے تو اپنا رزق ساتھ لاتی ہے۔ اس کا عملی مشاہدہ

میں ایک اشتہار چھپا کہ بندرگاہ پر لاکھوں روپے مالیت کا لاوارث صنعتی مال پڑا ہے۔ چٹا گانگ کی بندرگاہ کی انتظامیہ اسے ”جہاں ہے جیسا ہے“ کی بنیاد پر بذریعہ نیلام فروخت کرنا چاہتی تھی۔ نیلم کی تحریک پر میں نے بھی ٹینڈر بھر دیا۔ خوش قسمتی سے سب سے بہتر بولی میری تھی۔ مجھے سات روز کے اندر مال اٹھوانے کی مہلت ملی لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ اگلے ہی روز ایک بنگالی سیٹھ کے ساتھ وہیں پڑے پڑے اس مال کا سوا ہو گیا۔ مجھے اس سودے میں کئی لاکھ کا فائدہ ہوا۔ میں چند روز میں لکھ پتی ہو گیا۔

ہم دونوں خوشی سے نہال ہو گئے۔ ابھی تک ہم دفتر کے ایک فلیٹ میں رہ رہے تھے جو دفتر سے ایک میل دور خاصے گنجان اور پر شور علاقے میں واقع تھا۔ ہاتھ میں دولت آئی تو ہم نے سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سا خوبصورت کالینج خرید لیا جسے نیلم نے پر تعیش اشیاء سے بھر دیا۔ یہ کالینج ایک پرسکون مقام پر واقع تھا۔ ہم دونوں گھنٹوں سمندر کے کنارے ٹہلتے اور پانی میں نہاتے رہتے۔ وہ بچوں کی طرح مجھ پر پانی کے چھینٹے اڑاتی اور اس کے فرتی قہقہے فضا میں سمندری پرندوں کی چہکار کی طرح گونجا کرتے۔ زندگی میں رنگ ہی رنگ تھے خوشیاں ہی خوشیاں تھیں، سرور ہی سرور تھا!

زندگی اسی رنگ میں رنگی رہتی تو تفکر و پریشانی مجھے چھو کر بھی نہ گزرتی لیکن نیلم کے ساتھ بارہ تیرہ روز گزارنے کے بعد میرے محسوسات کچھ عجیب سے ہونے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم اور شخصیت میں کچھ تبدیلیاں آتی جا رہی ہیں۔

اس احساس کی ابتداء ایک چھوٹے سے واقعہ سے ہوئی۔ ہوا یوں کہ میں نے شہر کی چند کاروباری شخصیات کو ایک بزنس ڈنر پر مدعو کیا۔ اس ڈنر کا اہتمام شہر کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ ڈنر کی شام میں نہایت اہتمام سے تیار ہوا اور اپنا بہترین سوٹ زیب تن کر کے ہوٹل پہنچا۔ ڈنر میں ابھی ایک گھنٹہ پڑا تھا۔ جن مہمانوں کو میں نے دعوت دی تھی وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ ہوٹل کی تیسری منزل پر واقع ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے اپنے ایک شناسا سے مل لوں چنانچہ میں اوپر جانے کے ارادے سے لفٹ میں داخل ہو گیا۔

لفٹ میں پہلے سے ایک دلکش نقوش اور سانولی رنگت والی نوجوان لڑکی موجود تھی۔ اس نے آسمانی رنگ کی ساٹھی پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں گہرے نیلے رنگ کا پرس تھام رکھا تھا۔ انداز میں نفاست اور ایک طرح کی نزاکت تھی۔ میں سمٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی شہادت کی نرم و نازک انگلی تیسری منزل کے بٹن پر رکھی۔ اس لمحے ہماری نگاہیں چار ہوئیں۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھا کہ مجھے کس منزل پر جانا ہے؟

”شکریہ! میری منزل اور آپ کی منزل ایک ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں کا سوال پڑھ کر مسکراتے



طرف بڑھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لفٹ روکنے کا بٹن دبایا۔ اس کوشش میں، میں لڑکی کے بالکل قریب ہو گیا تھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ لڑکی نے ناگواری سے منہ پھیر کر اپنے ناک پر بے اختیار ہاتھ رکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات یوں ہو گئے جیسے وہ کسی بدبودار شے سے بچنا چاہتی ہو۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے میرے جسم سے ناگواری ہو آئی ہے۔

میں خفیف سا ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور سوچنے لگا کہ ماجرا کیا ہے؟ میں آتے ہوئے اعلیٰ درجے کے صابن اور شیمپو سے نہا کر آیا تھا اور ڈرائی کلین شدہ سوٹ پہنا تھا۔ اس کے علاوہ حسب عادت ایک اچھا پرفیوم بھی استعمال کیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ لڑکی نے اس قدر برا منہ کیوں بنایا تھا؟ میں نے غیر محسوس انداز میں اپنا لباس سوگنھنے کی کوشش کی مگر مجھے کسی طرح کی بدبو کا احساس نہیں ہوا۔ منہ سے بدبو آنے کا بھی کوئی سوال نہ تھا، میں نے اچھی طرح برش کیا تھا اور ماؤتھ واش بھی استعمال کیا تھا۔

اسی الجھن میں لفٹ تیسری منزل پر پہنچ گئی۔ لفٹ رکتے ہی لڑکی تیزی سے باہر کی طرف لپکی اور باہر جاتے ہوئے بھی اس نے اپنے ہاتھ کو پٹکے کی طرح یوں بھلایا جیسے بدبو کا جھونکا بھگانا چاہتی ہو۔ لڑکی کی اس حرکت سے میں اس قدر کنفیوژ ہوا کہ لفٹ سے باہر ہی نہیں نکلا۔ میں نے اپنے شناسا سے ملنے کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا۔ اس کی بجائے اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ ڈنر سے پہلے کسی دکان سے اچھا سا پرفیوم خریدوں اور اپنے جسم اور لباس پر خوب سپرے کروں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے مہمان میرے قریب بیٹھتے ہوئے ناگواری محسوس کریں۔

جب لفٹ نے نیچے کی جانب دوبارہ سفر شروع کیا تو میں لفٹ میں اکیلا تھا۔ میں نے کوٹ اتار دیا اور اسے اچھی طرح سوگنا۔ اپنے جسم کو بھی لمبے لمبے سانس کھینچ کر سوگنھنے کی کوشش کی، مگر مجھے کسی طرح کی بدبو محسوس نہیں ہوئی۔ خیال آیا کہ وہ لڑکی مجھے الوبنا رہی ہوگی۔ اس نے مجھے پریشان کرنے کے لئے مذاقاً یہ حرکت کی ہوگی۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے ذہن میں جنم لینے والے واسے کو جھٹک دیا اور ایک لڑکی کے ہاتھوں بے وقوف بن جانے پر آپ ہی آپ مسکرانے لگا۔ میں نیچے پہنچا اور مہمانوں کی آمد کا وقت ہونے تک ہوٹل کی لابی میں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میرے مہمان آ پہنچے۔ میں نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور انہیں ساتھ لئے ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ مہمانوں کے علاوہ میرا نو جوان اسٹنٹ مینیجر فرخ بیگ بھی ڈنر میں مدعو تھا۔ وہ انہیں ایک دوسرے ہوٹل سے لے کر یہاں پہنچا تھا۔

جب ہم کھانے کے لئے بیٹھے تو میری دائیں جانب براجمان اسٹنٹ مینیجر کے چہرے پر بھی مجھے تقریباً ویسے ہی ناگواری تاثرات ابھرتے محسوس ہوئے جیسے اس لڑکی کے چہرے پر میں نے دیکھے تھے۔ اس نے اپنی کرسی تھوڑی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی نشست کا انداز ایسا تھا جیسے اسے

سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر پھر مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں نے ان سے ہاتھ روم جانے کا عذر تراشا اور اٹھ کر لابی میں آ گیا۔ لابی سے ملحقہ گیلری میں ہینڈی کرافٹ، جیولری اور کاسمیٹکس کی دکانیں تھیں۔ میں نے جلدی سے کاسمیٹکس کی دکان کا رخ کیا اور ایک اعلیٰ غیر ملکی پرفیوم خرید کر خوب اچھی طرح اپنے جسم اور لباس پر سپرے کیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرے جسم یا لباس کے ساتھ آج کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھا تو فرخ بیگ کا کھنچا ہوا چہرہ ہشاش بشاش ہو گیا۔ اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اگلے روز میں نے دفتر میں اس سے پوچھ ہی لیا۔

”کیوں بھی فرخ اکل کیا ماجرا تھا۔ تم مجھ سے دور دور کیوں بیٹھ رہے تھے؟“

”کچھ نہیں محبوب صاحب بس یونہی.....“ اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ”کوئی خاص بات نہیں تھی۔“

”چلو عام بات ہی سہی، کچھ تو ہوگا۔“ میں نے اصرار کیا۔

”آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟“ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔ مجھے بتاؤ۔ میں سخت الجھن میں ہوں۔“

”دراصل آپ کے پاس سے ایک عجیب ناگواری ہو آ رہی تھی۔“ اس نے جھکتے جھکتے کہا۔ ”یوں جیسے جانوروں کے کسی باڑے یا پرندوں کے بیٹ بھرے گھونسلے سے آتی ہے۔“

”اچھا!“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ پھر قدرے سوچ کر میں نے اسے اپنے قریب ہونے کو کہا اور پوچھا۔ ”کیا اب بھی ویسی ہی ہو آ رہی ہے؟“

وہ جونہی میرے قریب آیا، ایک دم ناگواری سے پیچھے ہٹا اور ناک پر ہاتھ رکھ کر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جی ہاں، اب بھی آ رہی ہے۔“

میں پریشان سا ہو کر کرسی پر گر گیا اور سر پکڑ کر سوچنے لگا کہ کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

مجھے پریشان دیکھ کر فرخ بیگ نے مجھ سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

”سر! آپ ماشاء اللہ صاف ستھرے آدمی ہیں۔ مجھے تو یہ کوئی میڈیکل پرابلم لگتا ہے۔ آپ کسی ڈرماٹالوجسٹ (جلدی امراض کا ڈاکٹر) سے مشورہ کریں۔ ہو سکتا ہے آپ کی جلد کے ساتھ یا پسینے کے غدودوں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا ہو۔“

”میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”میں ضرور کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔“

میں نے ارادہ تو کر لیا تھا مگر اس سوال کا جواب ہنوز میرے پاس نہیں تھا کہ خود مجھے اپنے جسم سے بدبو



کیوں نہیں آرہی تھی؟

رات میں بستر میں لیٹا تو نیلم میرے سینے کے بالوں سے کھیلنے لگی۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے کوئی تاثرات نہ تھے۔ میں نے اطمینان کی خاطر اس سے پوچھا۔

”نیلم! میرے جسم سے تمہیں بدبو تو نہیں آرہی؟“

”بدبو؟..... نہیں تو!“ اس نے حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”کیوں؟“

”بس ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”گرمی کے موسم میں پسینہ وغیرہ جوتا ہے۔“

”تمہارے پسینے کی بدبو مجھے اچھی لگتی ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”یوں لگتا ہے جیسے گرم دھرتی پر مینہ کے چھینٹے پڑنے سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی ہو۔“

”تمہاری ہر بات ہی نزالی ہے۔“ میں نے آہستہ سے ایک چپت اس کے سر پر رسید کی اور پیار سے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ میرے لئے یہ بات اطمینان بخش تھی کہ نیلم کو وہ ناگوار بو محسوس نہیں ہو رہی تھی شاید میرے قریب رہنے سے وہ اس کی عادی ہو گئی تھی۔ تاہم میں پریشان ضرور تھا کہ میرے جسم سے بدبو کیوں آنے لگی تھی؟

اگلے روز ایک اور عجیب بات ہوئی۔ میں عصر کے وقت کاٹیج سے ملحقہ لان میں باڑھٹیک کر رہا تھا کہ باڑ میں پوشیدہ شہد کے ایک چھتے سے سینکڑوں مکھیوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے گھبرا کر اندر کی جانب دوڑ لگا دی۔ مکھیوں کا غول میرے پیچھے لپکا۔ وہ تو شکر ہے کہ میں نے گھر میں داخل ہو کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا ورنہ ان زہریلی مکھیوں کے ہاتھوں میری ہلاکت یقینی تھی۔ پھر بھی اسی اثناء میں دس بارہ مکھیاں مجھے کاٹ چکی تھیں۔

میں نے اندر آ کر اپنے کپڑے جھاڑے۔ سر اور گردن کو جھٹکا، بالوں پر ہاتھ پھیرا تو درجنوں مکھیاں فرش پر گر گئیں۔ اگلے ہی لمحے مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ سب مکھیاں جنہوں نے مجھے کاٹا تھا، سامنے فرش پر مری پڑی تھیں۔ اس سے بھی حیران کن بات یہ تھی کہ ان زہریلی مکھیوں کے کاٹنے سے مجھے قطعاً کسی طرح کے درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس مجھے ایک عجیب طرح کی لذت محسوس ہو رہی تھی۔

میں عالم پریشانی میں لاؤنج میں رکھے صوفے پر گر گیا اور اپنے وجود کے اندر ہونے والی تبدیلیوں پر غور کرنے لگا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میرا ذہن سوچ سوچ کر تھک گیا۔ نیلم اس وقت گھر پر نہیں تھی۔ اسے ہماری ہمسائی ثریا مل والا شاپنگ کے لئے بازار لے گئی تھی۔ دراصل اس بیوہ صنعت کار کی بیٹی کی عنقریب شادی تھی۔ میں کچھ دیروہیں بیٹھا رہا اور پھر بیڈروم میں آ کر سو گیا۔ مکھیوں کے کاٹنے کے بعد مجھے حیرت انگیز طور پر نہایت آسودہ نیند آئی تھی۔

چند روز یوں ہی گزر گئے۔ اس دوران مجھ پر نئے نئے انکشافات کے دروازے کھلنے لگے۔ مثلاً میں نے یہ محسوس کیا کہ میری جنسی بھوک پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ میرے بدن میں ہر وقت ہیجان کی کیفیت رہنے لگی تھی اور جنسی تسکین کی خواہش رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرنے لگی تھی۔ میرا گلا خشک رہنے لگا تھا اور مجھے ہر وقت یوں لگتا جیسے مجھے ہلکا سا بخار ہو۔ پھر جب تک میں نیلم کے پاس نہ جاتا میری یہی کیفیت رہتی۔ میرا وجود بھی پہلے کی نسبت مضبوط اور بھاری ہو گیا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ جسم میں طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔

ایک شام ہم دونوں اپنی گاڑی میں شہر کے مضافاتی علاقے کی سیر کے لئے نکلے۔ یہ گاڑی ہم نے شو روم سے نئی نکلوائی تھی اور روزانہ اس میں بیٹھ کر کبھی سینما، کبھی تھیٹر اور کبھی کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے تھے۔ آج ہمارا صرف لمبی ڈرائیو کرنے کا موڈ تھا۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہم خاصی دور نکل گئے۔ آس پاس کیلے کے لدے پھندے ہرے بھرے درخت اور ناریل کے جھنڈ تھے یا دھان کی لہلہاتی فصلیں۔ کھیتوں میں اونچی لنگیوں اور بنیانوں میں ملبوس سیاہ بدن، نحیف و نزار بنگالی مرد کام کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ سانولی سلونی، بدرنگ ساڑھیوں میں لپٹی نیم برہنہ عورتیں تھیں جو کھیتی باڑی کے کاموں میں ان کی مدد کر رہی تھیں۔ گاڑی دیکھ کر مردوں اور عورتوں نے اپنے ہاتھ کام سے روک لئے اور اچھنبے کی کیفیت سے ہماری طرف ٹکڑ ٹکڑ دیکھنے لگے۔ ننگ دھڑنگ بچوں کی ایک فوج گھاس پھوس کے جھونپڑوں سے نکل کر گیلی پگڈنڈیوں پر ننگے پاؤں بگٹ بھاگتی ہماری طرف آتی دکھائی دی۔ ان کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور وہ سب پکار پکار کر ہم سے کپڑے کھانا اور پیسے مانگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں سب ہماری گاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔

ان کی غربت اور افلاس دیکھ کر میرا جی بھر آیا۔ میں نے اپنے بٹوے سے تمام رقم نکال کر ان بچوں میں بانٹ دینا چاہی۔ میرا پھولا ہوا بٹو ا دیکھ کر بچوں کا یہ ہجوم بے قابو ہو گیا۔ وہ سب کے سب شہد کی مکھیوں کی طرح گاڑی سے چمٹ گئے اور کھڑکی سے اچک اچک کر مجھ سے بٹو ا چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر میں نے شیشے چڑھا دیئے۔ مگر وہ اس طرح کہاں ٹلنے والے تھے۔ انہوں نے شیشے بجانے شروع کر دیئے۔ ان کے انداز میں آہستہ آہستہ جارحیت جھلکنے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر دفعتاً مجھے غصہ آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دماغ میں چنگاریاں لپکنے لگی ہوں۔ میں نے گاڑی گیر میں ڈال کر ایک سیلیٹر پر دباؤ بڑھانا شروع کیا۔ بچوں کو اگرچہ گاڑی کی حرکت محسوس ہو گئی تھی اور وہ کسی حد تک گاڑی کے سامنے سے چھٹنے لگے تھے لیکن گاڑی ان پر چڑھ دوڑے گی اس کا شاید انہیں اندازہ نہ تھا۔ میں نے حالت جنون میں گاڑی کو ریس دے دی۔ خوش قسمتی سے اس نیم پختہ سڑک پر ایک بڑا گڑھا تھا، میں نے ریس مچائی ہی تھی کہ گاڑی کا اگلا دایاں پہیہ گڑھے میں دھنس گیا اور تیزی سے اپنی جگہ



ٹھونسنے لگا۔ اجن تیز آواز میں کھوں کھوں کرنے لگا تھا۔

بچے ایک دوسرے کو دھکیلتے بھینٹوں کے خوفزدہ ریوڑ کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے اور دھان کے کھیتوں کے کنارے کھڑے ہو کر کیچڑ سے بھرے گڑھے میں ایک ہی جگہ گھومتے پہنچے کا تماشا دیکھنے لگے۔ جنون کی اس کیفیت میں، میں نے نیلم کی طرف دیکھا۔ وہ حسب عادت مسکرا رہی تھی۔ میں نے گاڑی بند کر دی اور اپنی اس اچانک غصے میں آ جانے والی کیفیت پر پریشان ہو کر سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ نیلم نے میری گردن میں اپنی گوری کلائی حائل کر دی اور مجھے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔

”میری جان بلا ضرورت غصے میں نہیں آتے۔“

”نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”اس سے پہلے تو مجھے کبھی ایسا غصہ نہیں آیا؟“

”کوئی بات نہیں، کبھی کبھی ایسے ہو جاتا ہے۔“ اس نے میرے بالوں میں اپنی لانی لانی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا، پھر پیار سے بولی۔ ”اچھا، اب گاڑی ریورس گیر میں ڈالو اور پیچھے کرو۔ امید ہے گاڑی گڑھے سے نکل آئے گی۔“

میں نے آہستگی سے سر ہلایا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے ریورس گیر میں ڈال دی۔ حیرت انگیز طور پر گاڑی فوراً باہر نکل آئی۔ حالانکہ دھکے کے بغیر اس طرح ہوتا نہیں۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور گڑھے سے بچ کر گاڑی ایک طرف کچے پرا تار کر آگے نکال لی۔ فرلانگ بھر دور ایک لمبی جھیل تھی۔ جس کے کنارے تنگ سی پکی سڑک شہر کی طرف جاتی تھی۔ میں نے گاڑی اس پر ڈالی اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ابھی اس واقعے کا اثر میرے ذہن سے محو نہ ہوا تھا کہ ایک اور واقعہ ہو گیا جس نے میری ذہنی کاپیا پلٹ کے بارے میں مجھے سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کر دیا۔

اگلے روز شام کے وقت میں اپنے اسٹنٹ فرخ بیگ اور دوستوں کے ساتھ سینما گیا۔ شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں تنہا سینما آیا تھا۔ نیلم اس شام ہمسائے میں ایک لان پارٹی میں مدعو تھی جو تریا مل والانے ”سونار لین“ میں مقیم بیگمات کے اعزاز میں دی تھی۔

جب میں سینما پہنچا تو فرخ بیگ اور دوسرے دوست ابھی تک نہیں آئے تھے۔ میں گاڑی پارک کر کے آتے جاتے لوگوں کا تماشا دیکھنے لگا۔ یہ شہر کا ایک بڑا سینما ہال تھا جس کی تزئین و آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس سینما میں نئی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ان دنوں ڈھاکہ کی فلمی صنعت نے کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی۔ سینماؤں میں یا تو لاہور میں تیار کی گئی اردو فلمیں دکھائی جاتی تھیں اور یا پھر بھارت سے درآ مد بنگالی فلمیں۔ مجھے یاد ہے وہ ایک بھارتی بنگالی فلم تھی جس کا ان دنوں خاصا چرچا تھا۔ سینما میں

کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ہر طرف شور برپا تھا۔ باہر ”بلیکے“ کھلے عام ٹکٹ بیچتے دکھائی دے رہے تھے جبکہ اسٹال کی کھڑکیوں پر نو جوان بنگالی لڑکوں کا اثر دھام تھا جو کھڑکی کھلتے ہی اس پردھاوا بولنے کے انتظار میں اپنے جسم تول رہے تھے۔

میں خلقت کا یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ فرخ بیگ اور دوسرے دوست سائیکل رکشہ پر آتے دکھائی دیئے۔ رکشہ کھینچنے والے دق زدہ بنگالی نے ان کے کہنے پر میری گاڑی کے بالکل قریب رکشہ روکا اور بری طرح ہانپنے اور کھانسنے لگا۔

فرخ بیگ نے جلدی جلدی مجھ سے مصافحہ کیا اور دوستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”محبوب صاحب آپ ان سے گپ لگائیں میں ذرا ٹکٹ لے آؤں۔“

”کیا مطلب ٹکٹ ابھی لینے ہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ میرا خیال تھا اس نے ایڈوائس بنگ کروائی ہوگی لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ گیلری کی کھڑکی کی طرف جارہا تھا جہاں کافی رش تھا۔ میں نے آواز دے کر اسے واپس بلایا اور پاس ہی کھڑے ایک ”بلیکے“ کو آواز دی۔ وہ ایک درمیانی عمر کا کچھ شخم بنگالی تھا جس کے چہرے پر کڑنگی تھی۔ میں نے اس سے چار ٹکٹ طلب کئے اور پچاس کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے نوٹ کو بجلی کے کھمبے پر لگے بلب کی روشنی میں دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بلند کیا اور پان کی پیک سے سینما کی پیردنی دیوار پر پچکاری مار کر بولا۔ ”اپن کو ثابت روکڑا نہیں چاہیے کھلا ہو تو دیو!“

”دراصل اسے نوٹ کی اصلیت پر شک تھا۔ مجھے سکی محسوس ہوئی۔ میرے پاس کھلے پیسے نہیں تھے۔ میں نے کہا۔“ کھلا روکڑا تو نہیں ہے، تم کسی سے پتہ کر لو نا!“

اس نے جھپٹ کر ٹکٹ میرے ہاتھ سے کھینچ لئے اور ترشی سے بولا۔ ”اپن کے پاس ٹیم نہیں اے، یہ پکڑو اپنا روکڑا!“ یہ کہہ کر اس نے میرا نوٹ میری طرف اچھال دیا۔

لیکن مجھ پر پھر وہی جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔ اس نے اپنے کچھ شخم جسم کی طاقت کے زعم میں مجھے مارنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ ایک ٹکے کی صورت میں بلند کئے ہی تھے کہ میں نے وحشیانہ انداز میں اس کے سینے پر ٹکر مار دی۔ اس کے حلق سے ایک جنگھاڑ نما چیخ بلند ہوئی اور وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بجلی کے کھمبے سے جا ٹکرایا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور زور سے بھینچا۔ وہ بھیا ٹک انداز میں چیخ چیخ کر نہ جانے کسے مدد کے لئے پکارنے لگا۔ اس کی آنکھیں یوں ابلی پڑ رہی تھیں۔ جیسے اس کا دم نکل جائے گا۔ پھر اس کے حلق سے سہمی سہمی بے معنی آوازیں نکلنے لگیں۔

دوست بروقت اسے میری گرفت سے نہ چھڑاتے تو شاید میں اسے جان سے مار دیتا۔ میں ہشکل اس سے الگ ہوا تو وہ بالکل بے پروم ہو رہا تھا۔ اس کی کیفیت اس قریب المرگ پھنڑے کی سی تھی جسے شیر کی



مرقت سے آزاد کروایا گیا ہو۔ وہ اس قدر بیمار تھا کہ اس کے بدن پر بیکسٹن کی جگہ سے اس کی چیخ و پکار سن کر چند لوگ اس طرف متوجہ ہوئے تھے لیکن معاملہ رفع دفع ہوتے دیکھ کر پلٹ گئے اور اندر کی جانب لپکے جہاں ہال میں داخلے کے لئے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔

میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہونٹوں کے گوشوں پر کف جمع ہو گیا تھا۔ سینما میں داخل ہونے بلکہ اشتہارات چلنے تک وہ سب اس واقعہ کی ناگواری کے زیر اثر خاموش رہے۔ آخر فرخ بیگ نے سکوت توڑا۔

”محبوب صاحب آپ کو کیا ہو گیا تھا؟ میں نے کبھی آپ کو اس قدر غصے میں نہیں دیکھا۔“  
”پتہ نہیں یار! مجھے اب خود ندامت ہو رہی ہے۔ نہ جانے مجھے اس پر اس قدر غصہ کیوں آ گیا تھا۔“  
میں نے خفیف ہو کر کہا۔

دوستوں نے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کی۔ فلم شروع ہو گئی تھی اور سب فلم دیکھنے میں مگھو ہو گئے تھے لیکن میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ مجھے اپنی اینارل جنونی کیفیت پر سخت حیرت ہو رہی تھی۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ اس آدمی کی نوٹ پھینکنے کی حرکت کے ساتھ ہی میں نے اپنے دماغ میں ایک بھونچال آتا محسوس کیا تھا۔ یک لخت میرے اندر وحشیانہ طاقت کی ایک مہیب لہر اٹھی تھی اور جی چاہا تھا کہ اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے کر اس کی ہڈیاں چکنا چور کر دوں۔ وہ شخص کمزور نہیں تھا بلکہ گوشت کا پہاڑ تھا اور جسمانی طور پر مجھ سے بہتر نظر آ رہا تھا، لیکن میری گرفت میں وہ کسی خوفزدہ میمنے کی طرح مچلنے اور میمانے لگا تھا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر وہ واقعہ بھی تازہ ہو رہا تھا جب میں نے ایسی ہی جنونی کیفیت میں معصوم بچوں پر گاڑی چڑھانے کی کوشش کی تھی۔ اپنی غیر فطری تند مزاجی نے مجھے اس قدر متفکر کیا کہ میں فلم بھی نہ دیکھ سکا۔ رات گئے گھر واپس پہنچا تو ذہن اسی طرح پریشان تھا۔ نیلم کی محبت بھری آغوش نے بھی اس رات مجھے کوئی آسودگی نہیں بخشی۔

اگلے روز ڈھاکہ سے طاہر مسعود کا فون آیا، وہ شام کو چٹا گانگ پہنچ رہا تھا۔ اسے ایک نہایت اہم کاروباری معاملہ پیٹانا تھا۔ میں نے نیلم سے ذکر کیا تو خلاف توقع اس نے کوئی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ میرا خیال تھا وہ میرے دوست اور ہم دونوں کے محسن طاہر مسعود کی آمد کا سن کر مسرت کا اظہار کرے گی اور اس کے لئے کچھ نہ کچھ خاص اہتمام کرنے کا عندیہ ظاہر کرے گی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

شام کو میرے کہنے پر وہ تیار ہوئی اور ہم دونوں اسے لینے ایئر پورٹ گئے۔ طاہر مسعود کو حسب عادت میں نے چمکتا ہوا پایا۔ سارا راستہ وہ ہم دونوں کو چھیڑتا رہا اور لطیفے سناتا رہا۔ اس کی دلچسپ باتوں سے نیلم بھی محفوظ ہونے لگی۔ اس کے چہرے کی سرخی اور بشاشت واپس آتی دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس

لیا۔ تاہم میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس نے اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیوں نہ کیا تھا۔ رات کھانے پر نیلم نے کچھ نہ کچھ اہتمام کر ہی لیا۔ میں نے باہر ہوٹل میں کھانے کی تجویز دی تھی مگر طاہر مسعود نے یہ کہتے ہوئے میری تجویز رد کر دی۔

”ابے اوگا وڈی! بھابی کے ہوتے ہوئے میں بھلا ہوٹل کا کھانا کھاؤں گا، تمہارا دماغ تو درست ہے؟“  
”اور میں خفیف سا ہو کر سر کھجانے لگا تھا۔۔۔“

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں بیٹھ گئے اور ادھر ادھر کی گپیں ہانکنے لگے۔ نیلم چائے بنانے کے لئے اٹھی تو طاہر مسعود میرے قریب کھسک آیا اور شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا بات ہے جگر! تمہارے اندر چند ہی روز میں کچھ زیادہ ہی مردانگی نہیں آ گئی؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

”ذرا اپنی کلائیوں کے بال تو دیکھ کس قدر گھنے ہو رہے ہیں، پہلے تو ایسے نہ تھے، کیا ان پر بلیڈ چلایا ہے؟“ وہ ہنستے ہوئے پوچھنے لگا۔

میں نے اس کی بات سن کر اپنی کلائیوں کے بالوں پر غور کیا تو مجھے بھی یہی محسوس ہوا کہ وہ پہلے کی نسبت گھنے ہو چکے ہیں۔ میں تو پہلے ہی اپنے جسم میں آنے والی تبدیلیوں کے متعلق متفکر تھا۔ اس نے ایک اور رخ کی جانب توجہ دلائی تو مزید پریشان ہو گیا۔ وہ مجھے متفکر دیکھ کر ہنسنے لگا اور بولا۔

”یار! تم تو یوں پریشان ہو رہے ہو جیسے خدا نخواستہ تمہارا جوہر مردانگی چھن گیا ہو۔ ارے بھائی یہ تو مردانہ وجاہت کی علامت ہے۔ بعض لوگوں میں شادی کے بعد مردانگی کے جوہر ایک دم کھلتے ہیں۔“

میں جواب میں بے دلی سے مسکرا دیا۔ میرا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں نیلم چائے لے آئی اور گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ ہم گھنٹہ بھر لاؤنج میں بیٹھے رہے۔ آخر رات کے گیارہ بجے ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور اپنے اپنے بیڈرومز کا رخ کیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے لباس بدلا۔ باتھ روم میں سلپنگ گاؤن کے کھلے گریبان پر آئینے میں میری نظر پڑی تو میں نے غور سے اپنے سینے کے بال دیکھے۔ طاہر مسعود کی بات ابھی تک میرے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس نے جو بات نوٹ کی تھی وہ غلط نہیں تھی۔ میرے جسم کے بال خصوصاً سینے کے بال بے حد سیاہ، گھنگھریالے اور گھنے ہو گئے تھے۔ برش کرتے ہوئے میں نے اپنی بڑھی ہوئی شیو پر غور کیا۔ صبح میں نے شیو خاصی لیٹ کی تھی مگر اس وقت بال پھر نکل آئے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس روز میں نے شیو کی ہی نہ ہو۔

میں باتھ روم سے باہر نکلا تو نیلم کو گلابی رنگ کی مہین نائی میں ملبوس پایا۔ وہ اس وقت نہایت خوبصورت لگ رہی تھی۔ باریک نائی کے اندر سے اس کا بھرپور جسم باہر امنڈا پڑ رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے



میں نے تپائی گھسیٹی اور ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے جھک کر پیار سے میرے گلے میں بائیں ڈال دیں اور اپنی نازک ٹھوڑی میرے بائیں کندھے پر ٹکا کر آہٹے میں میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں بھی وارفتگی سے اس کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے قرب نے میرے قلب و ذہن پر پُر لطف اثرات مرتب کئے تو میں نے اپنی ذہنی پریشانی کا ذکر کر دیا۔

”نیلیم! میری جان! میرے ذہن میں ایک الجھن ہے۔“ میں نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

”کیسی الجھن! میری جان!“ اس نے بھی اس قدر اپنائیت سے پوچھا۔

”یہ دیکھو نا! چند ہی دنوں میں میرے پورے جسم پر کتنے زیادہ بال ہو گئے ہیں!“

”میری جان! اتنی سی بات پر پریشان ہو گئے ہو۔“ اس نے میری گردن چومتے ہوئے کہا۔

”مردوں کے جسم پر بال اگنا تو اچھی بات ہوتی ہے بلکہ مجھے تو آپ کے یہ بال بہت اچھے لگتے ہیں۔“

آپ کو کیا پتہ ان میں کتنی کشش ہے۔ میرا جی چاہتا ہے آپ کے سینے کے گھنے بالوں میں اپنا چہرہ چھپا

کر آ نکھیں بند کر لوں.....“

یہ کہہ کر اس نے عقب سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اپنے گورے گورے ہاتھ کی لانی سفید انگلیاں میرے

سینے کے سیاہ گھنے بالوں میں پھیرنے لگی۔

اس لمحے آئینے میں، میں نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب

طرح کی پیاس نظر آئی۔ اس پیاس کو جذبات کی تشنگی کا نام نہیں دیا جاسکتا تھا بلکہ یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی

خون آشام جانور اپنے شکار کو دیکھ کر ہونٹ چاٹ رہا ہو۔ دفعتاً یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے

ذہن میں لپکا کہ جب سے یہ لڑکی میری زندگی میں داخل ہوئی ہے اس وقت سے ہی یہ سب تبدیلیاں

میری شخصیت میں وارد ہونے لگی ہیں۔ اس لمحے نیلیم کی نسبت ایک بے نام سا خوف، ایک بے عنوان سا

شبہ میرے ذہن میں بیٹھ گیا۔

نیلیم نے مجھے لاڈ سے بستر کی طرف کھینچا تو میں کسی معمول کی طرح اس کی خواہشات کی تکمیل میں

مصروف ہو گیا لیکن انتہائی قربت کے ان لمحات میں بھی، جن میں پہلے میں دنیا و مافیہا کو بھول کر اس کی

تسکین بخش آغوش میں گم ہو جایا کرتا، خوف کا سنپولیہ میرے ذہن میں ریگتار ہا۔

مزید ایک دن اسی طرح گزر گیا۔ طاہر مسعود واپس چلا گیا تھا۔ میں اپنے کام میں مصروف رہنے کی

کوشش کرتا مگر خوف و شبہ کا ناگ ہر لمحہ مجھے ڈستار ہتا۔ اب رہ رہ کر دادی جان کے بے ہوش ہونے کی

کیفیت مجھے یاد آنے لگی تھی۔ میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ وہ اس بظاہر معصوم صورت اور حسین و جمیل

دو شیرہ کو دیکھ کر اس قدر خوفزدہ کیوں ہو گئی تھیں؟ کیا وہ اسے جانتی اور پہچانتی تھیں؟ آخر اس لڑکی کی

حسیت میں کیا اسرار تھا؟ مجھے بچپن سے لے کر اب تک کے وہ تمام لمحات یاد آ رہے تھے جب دادی جان، دادا جان کو مجھے چاندی راتوں میں سمندر کے کنارے لے جانے سے منع کرتی تھیں اور جواب میں دادا جان عجیب و پر اسرار انداز میں مسکرا نے لگتے تھے یہ کیا راز تھا؟ دادی جان کو کس بات کا دھڑکا تھا؟ میں نے دادی جان کی باتوں کو کبھی درخور اعتناء نہ سمجھا تھا۔ دادا جان کی وفات کے بعد جب میں جوان ہوا تو باقاعدگی سے سمندر پر جاتا رہا اور ایک رات اس لڑکی کو ساتھ لئے گھر لوٹا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ دادی جان ہم سب سے روٹھ کر اپنے خالق حقیقی کے پاس چلی گئیں۔ فرشتہ اجل نے انہیں اس قدر مہلت بھی نہ دی تھی کہ وہ کچھ بتا سکتیں۔ انہوں نے صرف ایک لفظ ”چپوں“ بولا تھا جو بظاہر ایک لایعنی لفظ تھا لیکن یہ لفظ بذات خود مجھے اب پر اسرار لگنے لگا تھا۔ یہ اس لڑکی کا نام معلوم ہوتا تھا۔ جن حالات میں وہ مجھے ملی تھی، وہ حالات بھی مجھے اب پر اسرار لگنے لگے تھے۔ اس کی یادداشت کھوجانے کی بات مجھے اب ایک ڈرامہ محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے آہستہ آہستہ یقین ہونے لگا کہ میں کسی پر اسرار چکر میں پھنس گیا ہوں۔

آخر ایک بار پھر چودھویں کی رات آ گئی۔ نیلیم کو میری زندگی میں داخل ہوئے پورا ایک ماہ ہو گیا تھا۔

اس روز غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے ہم سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک ادھیڑ

عمر آدمی اپنے السیشن کتے کی زنجیر تھامے چلا آ رہا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی پتلون اور سفید بے داغ

شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر خوبصورت تنکوں سے بنا ہیٹ تھا۔ بظاہر وہ نیوی کا کوئی ریٹائرڈ آفیسر معلوم ہوتا

تھا۔ وہ ہمارے قریب آیا تو میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ادھیڑ عمر آدمی کا کتا نیلیم کو دیکھ کر اچانک

جارحانہ انداز میں اچھل اچھل کر بھونکنے لگا تھا۔

میں نے آنکھوں سے نیلیم کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ایک شعلہ سا لپکتا محسوس ہوا۔ اس

نے محض ایک مرتبہ کتے کو گھو کر دیکھا۔ یکا یک بھیڑیے جیسا خونخوار کتا سب چوڑی بھول گیا اور سہم کر

اپنے مالک کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے اپنی دم پھیلی ٹانگوں میں دبالی تھی اور یوں ڈرتے

ہوئے چل رہا تھا جیسے عام آوارہ کتے کسی راہ گیر کو پتھر اٹھاتے دیکھ کر کتراتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اس

کے منہ سے گھٹی گھٹی کاؤں کاؤں کی آواز آنے لگی تھی۔

کتے کا مالک کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہنسنے لگا اور اپنا کتا لے کر آگے بڑھ گیا مگر میرے ذہن میں بیٹھا ہوا

شک مزید بختہ ہو چکا تھا۔ نیلیم کی شخصیت میری نظر میں پہلے سے زیادہ پر اسرار ہو گئی تھی۔

کتا اور اس کا مالک چلے گئے تو میں نے نگاہ بھر کر نیلیم کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک اسرار

آگیاں فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ساحل پر چلنے والی تیز ہوا میں اس کا آنچل اور سیاہ لمبے بال لہرا

رہے تھے اور وہ اپنی آنکھیں نیم وا کئے کوئی گیت گنگنائی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

سورج نے ساحل پر آخری نگاہ ڈالی اور سمندر میں ڈوب گیا۔ شفق کی سرخی دور افق پر پھیل گئی۔



ہمارا کالج کچھ فاصلے پر ناریل کے ایک بڑے جھنڈی اوٹ سے نظر آ رہا تھا۔ مجھے نیلم کے ساتھ اپنے کالج میں جانے کے خیال سے ہول آنے لگا۔ جی میں آیا کہ اسے وہیں چھوڑ کر سرپٹ دوڑ لگا دوں، لیکن ایسا کرنا سراسر حماقت ہوتی۔ اگر نیلم کے متعلق میرا شبہ درست تھا تو میں اس کے چنگل سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ وہ چشم زدن میں مجھے آ لیتی اور جان سے مار دیتی۔ بظاہر اس کے ساتھ مزید کچھ وقت گزارنے میں مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بھی اس سے والہانہ محبت کرتا تھا..... لیکن میں نے اس سے بحیثیت انسان محبت کی تھی، اگر وہ کوئی ماورائی مخلوق تھی تو میں اس سے کیسے محبت کر سکتا تھا؟ پچھلے چند روز میں شک اور خوف نے مجھے اس طرح اپنی لپیٹ میں لیا تھا کہ محبت کے تمام جذبے ماند پڑنے لگے تھے۔ پھر جو منظر میں نے تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا اس نے مجھے ذہنی اور قلبی طور پر اس سے مزید دور کر دیا تھا۔ میں اس سے خوف محسوس کرنے لگا تھا۔

میں بے دلی سے پاؤں گھسیٹتا اس کے ساتھ ساتھ کالج کی طرف بڑھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ایسا کون سا طریقہ اپناؤں کہ نیلم سے بغیر کسی خطرے میں پڑے گلو خلاصی حاصل ہو سکے۔ آخر میرے دل میں ایک خیال آیا جس سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے سوچا تھا کہ کل دفتر جانے کی بجائے خدا کے کسی برگزیدہ بندے کسی عامل یا پیر فقیر کے پاس جاؤں گا اور اسے من و عن تمام واقعات سے آگاہ کر دوں گا۔ امید ہے خدا کے پاک کلام کی برکت سے مجھے اس چکر سے بخیر و عافیت نجات حاصل ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر ذہن کو قدرے سکون ملا اور میں ایک گہری سانس لے کر نیلم کی معیت میں آگے بڑھنے لگا۔ چلتے چلتے نیلم نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا اور ٹٹولتے لہجے میں بولی۔

”محبوب! تم خاموش کیوں ہو؟ کیا سوچ رہے ہو؟“

”ک..... کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں!“ میں نے گڑبڑا کر کہا اور ساحل سے سرپٹتی لہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ میں اس کی نظروں سے نظریں ملانے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے جسم میں سونیاں جھبھنے لگی تھیں۔ دفعتاً وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ آس پاس دور دور تک ساحل ویران ہو چکا تھا۔ میرے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ میں ٹھٹھک کر رک گیا اور خوفزدہ ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ بے تحاشہ ہنستی چلی جا رہی تھی۔ پھر ہنستے ہنستے وہ یکدم رک گئی اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر قدرے سنجیدگی سے بولی۔

”آؤ گھر چلیں، بہت دیر ہو گئی ہے۔“

میں نے ناچار اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور گھسٹتے قدموں سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں کالج پہنچ چکے تھے۔ اتفاق سے اس وقت کالج، بلکہ آس پاس کے علاقے میں بجلی غائب تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کہیں بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ اگر یہ بات درست تھی تو پھر رات گئے تک بجلی آنے کا کوئی امکان نہ تھا..... مجھے اس

خیال ہی سے ہول آنے لگا لیکن نیلم خوش تھی۔ موم بتی کی روشنی میں کھانا کھاتے ہوئے اس نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔

”جان! اچھا ہے، بجلی نہیں ہے۔ آج اسی بہانے جلدی سوئیں گے..... آؤ، نا! اوپر چلیں۔“

عام حالات میں اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں کھانا وہیں چھوڑ دیتا اور اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اوپر لے جاتا لیکن اب میری ساری گرم جوشی ہوا ہو چکی تھی۔ میں نے بے دلی سے اثبات میں سر ہلایا اور آہستگی سے نوالے توڑنے لگا۔ میں نے کھانا کھانے میں خاصی دیر لگائی مگر کھانا آخر ختم تو ہونا تھا۔ جونہی میں نے ہاتھ روکا، نیلم نے میرا بازو تھام لیا اور مجھے کھینچتی ہوئی اوپر لے گئی۔ میں لاکھ سردمہری اختیار کرتا، اس کے انداز میں وہ گرم جوشی تھی کہ میرے جسم میں سوئے ہوئے جذبات بھی انگڑائی لے کر بیدار ہو گئے۔ آخر میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اسے دبوج لیا.....

رات لمحہ لمحہ آگے بڑھتی رہی۔ نیلم میری آغوش میں سسکتی تڑپتی رہی۔ اس رات اس کا جوش دیدنی تھا۔ اس کی پیاس کسی طرح بجھنے میں ہی نہ آ رہی تھی۔ آخر آدھی رات کے قریب وہ بے سدھ ہو گئی اور اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ خود میں بھی بے حد تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ نیند یکدم آنکھوں میں اترنے لگی تھی۔ یہ چودھویں کی رات تھی۔ سمندر پر دیوانگی طاری تھی اور میں بپھری ہوئی موجوں کا شور صاف سن رہا تھا۔ جی میں آیا اٹھ کر باہر جاؤں اور پورے چاند اور چڑھے ہوئے سمندر کا نظارہ دیکھوں مگر تھکاوٹ اور کسلمندی نے بستر سے اٹھنے نہ دیا۔ رات کسی پہر میری آنکھ لگ گئی۔ نیند کی حالت میں، میں نے یکبارگی یوں محسوس کیا جیسے میرے پہلو میں نیلم کا مرمریں بدن نہیں بلکہ کوئی الجھا سا جسم ہے۔ میں ہڑا کر اٹھ بیٹھا۔ خوف کی ایک لہر میرے سارے وجود میں دوڑ گئی تھی۔ میری نظر کھڑکی پر پڑی۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اور اس کا پردہ تیز ہوا میں لہرا رہا تھا۔ چاند کی روشنی ناریل کے جھنڈ سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے چادر ہٹا کر اپنے پہلو میں جھانکا۔ سب کچھ میرا وہم تھا۔ نیلم اپنے مرمریں سراپے سمیت بے سدھ سو رہی تھی۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کے قطرے پونچھ کر دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جانے کس وقت مجھے پھر نیند آ گئی۔

مجھے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری ہوگی کہ یک لخت کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلی بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ نیلم میرے پہلو میں نہیں ہے۔ ابھی میں اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ یکا یک کھڑکی کا پردہ تیز ہوا کے زور سے پھڑ پھڑایا۔ اس لمحے چاند کی روشنی میں، میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ نیلم کھڑکی میں باہر کی جانب پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور گردن موڑے سرخ انگارہ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

جونہی ہماری نظریں چار ہوئیں، اس نے بلند آواز میں کہا ”محبوب! میرے بارے میں تمہارا یہ خیال



کہ میں اسان نہیں بلکہ لونی ماورائی، کسی ہوں بالکل درست ہے۔ میں لون ہوں آہستہ آہستہ م خود ہی جان جاؤ گے۔ فی الحال میں یہاں سے جا رہی ہوں، کیونکہ میری دنیا سے، جو ایک ماورائی دنیا ہے، میرے لئے بلاوا آیا ہے۔ خبردار مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے کسی عامل کے پاس جانے کی حماقت نہ کرنا، ورنہ پچھتاؤ گے!“

یہ کہہ کر اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی سی کریمہ صورت چمکڑ میں بدل گئی۔

شدت خوف سے میری چیخ نکل گئی۔ دل اس قدر زور سے دھڑکا جیسے پسلیوں کا حصار توڑ کر باہر آ جائے گا۔ دفعتاً طوفانی ہوا کے تھپڑے نے کھڑکی کا دوسرا پٹ ایک خوفناک آواز کے ساتھ دیوار سے دے مارا۔ بس پھر مجھے اتنا یاد ہے کہ چمکڑ اپنے بڑے بڑے پر پھڑ پھڑاتی فضاء میں بلند ہوئی تھی اس کے بعد میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پر پایا۔ نہ چاندنی رات تھی، نہ میرا کمرہ اور نہ ہی وہ بھیانک منظر! ذہن کی دھند چھٹی تو میں نے محسوس کیا کہ میں کسی اسپتال کے اگلے سفید بستر پر لیٹا ہوں۔ بستر کے قریب ایک نوجوان ڈاکٹر اور دو نرسیں کھڑی نظر آ رہی تھیں جن کی سانولی رنگت کمرے میں پھیلی ہوئی نیم تاریکی میں مزید گہری ہو گئی تھی۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ان کے چہروں پر اطمینان کی چمک ابھری۔ نوجوان ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر میرے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور ہمدردی سے پوچھا

”اب آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟“

میں نے سر کی جنبش سے اسے مثبت جواب دینے کی کوشش کی تو سر میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ جواتنی شدید تھی کہ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا اور منہ سے سسکاری نکل گئی۔

نوجوان ڈاکٹر نے پلٹ کر ایک نرس کو مخاطب کیا اور بنگالی میں کچھ کہا، پھر مجھ سے بولا۔ ”آپ فکر نہیں کرنے کا سبب اچھا ہو جائیں گا، ابھی نرس لوگ آپ کو انجکشن لگانے کا ہے۔“

میرے ذہن میں رات کا منظر پھر تازہ ہونے لگا تھا۔ وہ سب کو یاد کر کے میرا دل گھبرانے لگا۔ دماغ کی رگیں سلگنے لگیں۔ اچھا ہوا نرس نے میرے بازو میں سوئی بھونک دی ورنہ ذہن کے پردے پر چلنے والی بھیانک فلم سے میری دماغ کی رگیں پھٹ جاتیں۔ انجکشن میں نہ جانے کیسا جادو تھا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ میری آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے میں نے اپنے اسٹنٹ فرخ بیگ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے کیشر سلیم احمد اور دفتر کا ادھیڑ عمر ڈرائیور مجیب میاں بھی نظر آ رہے

تھے۔ وہ سب اس کے پیچھے ہوئے میرے بستر کے قریب آئے تین اس سے پہلے کہ وہ لونی بات کرتے، میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

یقیناً میں گھنٹوں سویا رہا ہوں گا کیونکہ جب میں بیدار ہوا تو شام ہو چکی تھی اور قرب و جوار کی مسجدوں سے مغرب کی اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔ میری نگاہ کھڑکی کے قریب رکھی آرام کرسی پر پڑی۔ فرخ بیگ کرسی میں دھنسا خراٹے لے رہا تھا۔ اس کا سر پیچھے کی طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خاصا تھکا ہوا ہے۔ نہ جانے وہ کب سے یہاں کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اسے آواز دے کر جگاؤں مگر پھر کچھ سوچ کر میں نے ارادہ بدل دیا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور آسمان کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے تکیہ اٹھا کر اپنی کمر کے پیچھے رکھا اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب میں بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ باہر روشنی تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے نظر آنے والی پرندوں کی ٹولیاں اپنے ٹھکانوں پر جا بیٹھی تھیں اور آسمان خالی دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ کہیں کہیں آوارہ بادلوں کی ٹکڑیاں ہوا کے دوش پر اڑتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے گہری سانس لی اور اپنے وجود میں خلیج بنگال کی سمت سے آنے والی اس تازہ نمناک ہوا کو اتارنے کی کوشش کی جو کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

فرخ بیگ صوفہ چیمبر میں کسمسانے لگا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سرہانے لگا سوچ دبا یا تو کمرہ روشن ہو گیا۔ فرخ بیگ نے آنکھوں پر بازو رکھ کر روشنی سے بچنے کی کوشش کی اور پھر اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں کو ہاتھوں سے ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

”آپ کب بیدار ہوئے، طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے جمائی روکتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا اور پھر اٹھ کر میرے بستر کے قریب آیا۔

”طبیعت ٹھیک ہے، ابھی اٹھا ہوں۔ تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟“

”بہت دیر سے.....“ وہ مسکرانے لگا۔ ”ڈاکٹر نے صبح بتایا تھا کہ انجکشن کے اثر سے آپ دوپہر تک سوتے رہیں گے، لیکن آپ نے ان کے اندازے سے کہیں زیادہ سو کر ایک نیاریکارڈ قائم کیا ہے۔“

”یار! تم چلے جاتے۔“ میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم نے خواہ مخواہ اتنی تکلیف کی، بھابی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

”تکلیف کیسی؟“ اس نے پر خلوص انداز میں کہا۔ ”ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے میں تکلیف نہیں، راحت محسوس ہوتی ہے۔ رہی آپ کی بھابی تو وہ بیچاری تو خود فکر مند ہو رہی تھی.....“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کیلئے رکا اور پھر تشویش بھرے لہجے میں بولا ”سر! یہ تو بتائیں بھابی کدھر ہیں، وہ گھر میں کہیں نظر نہیں آئیں؟“

میں اس غیر متوقع سوال سے گڑبڑا گیا۔ لمحہ بھر کے لئے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا جواب



دوں۔ پھر دفعتاً مجھے ایک مناسب جواب سوچا اور میں نے جلدی سے کہا۔

”یار! تمہاری بھابی کل ہی کراچی گئی ہیں، شام کی فلائٹ سے۔ دراصل ان کی امی کی طبیعت خاصی خراب ہے، انہیں السر کی تکلیف ہے۔“

”خدا انہیں صحت دے!“ اس نے تاسف سے کہا۔ میری بات سے اس کی تشویش دور ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے کا اطمینان اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اس نے میرے جھوٹ کو سچ سمجھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے سچ ہی سمجھنا تھا۔ اس بیچارے کو کیا خبر تھی کہ مجھ پر کیا قیامت بتی ہے!

”تم لوگوں کو میری بے ہوشی کی کیسے خبر ہوئی؟“ میں نے استفسار کیا۔ ”مجھے یہاں کون لایا تھا؟“

”یہاں آپ کو ہم ہی لائے تھے۔“ اس نے بتانا شروع کیا۔ ”صبح آٹھ بجے حسب معمول ڈرائیور مجیب میاں آپ کو لینے کا ٹیچ پہنچا تو آپ عادت کے مطابق تیار ہو کر لاؤنج میں نہیں بیٹھے تھے۔ اس نے کئی دفعہ گھنٹی بجائی، گاڑی کے ہارن دیئے مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس اثناء میں وہ عورت بھی آگئی جو آپ کے گھر کا کام کاج کرتی ہے۔ مجیب میاں نے اس سے استفسار کیا تو وہ بھی پریشانی میں بتانے لگی کہ وہ ساڑھے چھ بجے آئی تھی مگر کئی دفعہ گھنٹی بجانے کے باوجود کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ وہ باہر دروازے کے پاس بیٹھی رہی اور پھر واپس چلی گئی۔ ساڑھے سات بجے وہ دوبارہ آئی تو بھی کسی نے دروازہ کھولا اور نہ کوئی جواب دیا۔ اب وہ اپنے دس بارہ سالہ لڑکے کو ساتھ لائی تھی تاکہ وہ دیوار پھلانگ کر اندر جائے اور کچن کے بیرونی دروازے سے گھر میں داخل ہو۔ یہ دروازہ اکثر کھلا رہتا تھا۔ مجیب میاں نے لڑکے کو دیوار سے اندر اتارا۔ خوش قسمتی سے کچن کا دروازہ کھلا مل گیا۔ لڑکا کچن کے راستے لاؤنج میں داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کے اوپر بیڈروم میں پہنچا تو اس نے آپ کو بستر پر بے ہوش پڑے دیکھا۔ بھابی وہاں نہیں تھیں، لڑکے نے کھڑکی میں سے باہر جھانکتے ہوئے شور مچا دیا۔

مجیب میاں بھاگ بھاگ اندر پہنچا۔ اس کیلئے اکیلے آپ کو اٹھا کر نیچے لانا ممکن نہیں تھا۔ اس نے مجھے فون پر اطلاع دی۔ میں دس پندرہ منٹ میں آپ کے کاٹیج پہنچا گیا۔ پھر ہم دونوں آپ کو اٹھا کر نیچے لائے اور گاڑی میں ڈال کر اس پرائیویٹ اسپتال میں پہنچایا۔ ویسے سر آپ کو ہوا کیا تھا؟ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ آپ کسی خوف یا شاک کے زیر اثر بے ہوش ہوئے تھے؟“ اس نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”یار یہ ڈاکٹر لوگ تو بات کا بتنگڑ بنا ڈالتے ہیں۔“ میں نے ایک بار پھر جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”دراصل یار! مجھے کبھی کبھار مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔“

ہم باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر کھٹکا ہوا اور وہی نوجوان ڈاکٹر ایک نرس کی معیت میں داخل ہوا۔ اس وقت وہ پتلون قمیض پہنے ہوئے تھا اور خاصا سمارٹ لگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

”جی ہاں! ڈاکٹر صاحب میں ٹھیک ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔“ اس نے سر ہلایا اور پھر فرخ بیگ کی جانب دیکھتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ”آپ کا دوست نے خوب ڈیوٹی دیئے ہیں۔ یہ سارا وقت ایدر ہی بیٹھا رہا۔“

”ہاں، دوست جو ہوا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اگر آپ چاہیں تو ہم لوگ آپ کو ڈسچارج کر سکتا ہے۔“ ڈاکٹر نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ”ہمارا حساب سے اب آپ تندرست ہے۔“ فرخ بیگ نے میری طرف دیکھا، مگر گھر جانے کے خیال ہی سے میرے وجود میں خوف کی لہر دوڑنے لگی تھیں۔ میں نے کھڑکی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ آسمان نے تاریکی کی چادر اوڑھ لی تھی اور چاند سیاہ گھنے بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ بجلی کی چمک اس بات کا اشارہ دے رہی تھی کہ کچھ ہی دیر میں چھا جوں مینہ برسنے لگے گا۔ میں نے کھڑکی سے نگاہ ہٹا کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب میں آج رات یہیں آرام کروں گا۔ باہر موسم کے تیور ٹھیک نہیں اس وقت گھر کیا جانا۔“

”ایزیووش!“ ڈاکٹر نے کندھے اچکا کر کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ پیچھے پیچھے نرس بھی اپنی اونچی ایڑی والی سینڈل سے فرش بجاتی روانہ ہو گئی۔

”میرا خیال ہے اب تم بھی گھر جاؤ، موسم خراب ہو رہا ہے۔“ میں نے فرخ بیگ کو مخاطب کیا۔

”ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔“ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہوگی، ہو سکے تو صبح بھجوا دینا، بل وغیرہ بھی تو کلیئر کروانا ہوگا..... اور ہاں میں کل دفتر نہیں آؤں گا، تم کام سنبھال لینا۔“ میں نے کہا۔

”کام کی آپ فکر نہ کریں۔ تھوڑا آرام کریں، کام چلتا رہنا ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور مجھ سے رخصت چاہی۔ میں بستر سے اٹھ کر چپل گھسیٹا، اس کے ساتھ سیڑھیوں تک آیا۔ سیڑھیوں کے پاس رک کر اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور خدا حافظ کہہ کر سیڑھیاں اتر گیا۔

میں کچھ دیر سیڑھیوں پر بے مقصد کھڑا رہا اور آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ یہ خاصا مصروف اسپتال تھا۔ معلوم ہوتا تھا شہر کے تمام آسودہ حال مریض ادھر ہی کا رخ کرتے ہیں۔ انتظام و انصرام اور صفائی کا معیار بہت اعلیٰ تھا۔ اس وقت بھی ایک سیاہ رو بھنگن راہداری میں لگی ٹائلوں کو گیلے کپڑے سے صاف کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ مینہ کی پھوار تیز ہوا کے دوش پر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی اور بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ چند ثانیے ذہن ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ پھر پردہ ذہن پر گزرے ہوئے حالات و واقعات کی فلم چلنے لگی۔



گزشتہ دس پندرہ روز میں جو کچھ وقوع پذیر ہوا تھا۔ وہ ڈرامائی بھی تھا اور حیران کن بھی..... حالات نے جس بھیانک انداز میں رنگ بدلاتھا میں نے اس کے متعلق کبھی سوچا تک نہ تھا۔ جس ناز پرورد و شیرہ کو حاصل زندگی سمجھ کر میں نے گھر بارتیاگ دیا تھا۔ جس کی خاطر میں نے والدین، بہن بھائیوں اور عزیزو اقارب کو چھوڑا۔ چوری کی، قانون شکنی کا مرتکب ہوا، حتیٰ کہ قتل تک کر ڈالا اور چٹا گاند۔ جیسے دور دراز علاقے میں جس کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کیا وہ کوئی غیر انسانی مخلوق ہوگی اس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

میں نے لمحہ بھر کے لئے اس کے حسین چہرے کا تصور کیا۔ کس قدر معصومیت تھی اس کے چہرے پر، کتنی پیاری لڑکی تھی وہ..... دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ اے کاش! اس نے اپنا آپ مجھ پر یوں ظاہر نہ کیا ہوتا۔ کاش! وہ تمام عمر ایک حسین، معصوم اور دلنشین لڑکی کے روپ میں میرے ساتھ رہتی۔ اگر میں اس کے اصل سے بے خبر رہتا تو اس بات سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ کون ہے، کیا ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ بے خبری بذات خود ایک نعمت ہے۔ بسا اوقات بے خبر رہنے ہی میں راحت و عافیت پنہاں ہوتی ہے۔ لیکن اس نے جان بوجھ کر اپنا آپ مجھ پر ظاہر کیا تھا۔ اس میں بھی کوئی رمز پوشیدہ ہوگی جو میرے احاطہء عقل سے باہر تھی۔ وہ واپس آنے کا ارادہ ظاہر کر کے مجھ سے رخصت ہوئی تھی۔ گویا اس کا واپس آنا ایک طے شدہ امر تھا! اس کے تصور ہی سے مجھے پسینہ آ گیا۔ میں نے جو منظر دیکھا تھا اور جس انداز میں اسے چگاڈ کا روپ دھارتے دیکھا تھا اس کے بعد مجھے یقین تھا کہ دوبارہ اسے سامنے دیکھ کر دہشت سے میری حرکت قلب بند ہو جائے گی۔ میں سرا سیمہ ہو کر سوچنے لگا اس غیر انسانی مخلوق سے ہمیشہ کے لئے کیسے چھٹکارا پاؤں۔ اس کی اصلیت جان لینے کے بعد اس کے ساتھ رہنا امر محال تھا۔ ایک ہی راستہ نظر آتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاؤں اور کسی عامل سے رجوع کروں۔ اس نے مجھے واضح طور پر دھمکی دی تھی کہ میں ایسی کوئی حماقت نہ کروں، ورنہ مجھے پچھتا نا پڑے گا۔ اس کی دھمکی کے پیش نظر میرے لئے یہ فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ کافی دیر میں اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا اور سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے نیند نے آ لیا۔

صبح آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ گھنٹی دے کر نرس کو بلوایا تو اس نے اطلاع دی کہ باہر ڈرائیور منتظر ہے۔ میں نے اسے اندر بلوایا۔ وہ ایک استری شدہ شلواری قمیض اور چپل لایا تھا جو فرخ بیگ نے یقیناً میرے گھر سے منگوائی تھی۔ شلواری قمیض پر خاصی مقدار میں پرفیوم بھی چھڑکا ہوا تھا..... وہ ایک لفافے میں بند کچھ رقم بھی لایا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو کمرے میں موجود اپنی چند چیزیں سمیٹنے کی ہدایت کی اور خود منہ ہاتھ دھونے اور کپڑے بدلنے کے لئے ہاتھ روم میں چلا گیا۔

باہر نکلا تو ڈرائیور چیزیں سمیٹ چکا تھا۔ میں نے اپنے میلے کپڑے بھی اسے تھما دیئے اور نیچے گاڑی

میں جا کر انتظار کرنے کو کہا۔ اس کے بعد میں استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچا اور اسپتال کا بل ادا کیا۔ بل ادا کر کے میں نے فرخ بیگ کی بھجوائی ہوئی رقم گنی۔ اب بھی لفافے میں لگ بھگ پندرہ سو روپے موجود تھے۔ میں نے رقم جیب میں رکھ لی اور ہسپتال سے باہر نکل آیا۔ ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گزشتہ رات کی بارش نے ہر شے دھو ڈالی تھی۔ سب کچھ اجلا اجلا اور نکھر نکھر الگ رہا تھا۔ ڈرائیور گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ فرخ بیگ نے اسے یقیناً اس لئے بھیجا تھا کہ وہ مجھے گھر پہنچا دے لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں نے بیدار ہونے کے بعد دوبارہ سوچ بچار کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ عامل کے پاس جانے کا خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ بصورت دیگر مجھے نیلم کے ساتھ رہنا پڑتا جو ایک مستقل آزار تھا۔

میں چٹا گاند میں کسی عامل کا پتہ نہیں جانتا تھا۔ ڈرائیور سے پوچھنا خلاف مصلحت ہوتا، اس لئے کچھ سوچ کر میں گاڑی کی کچھلی نشست پر بیٹھ گیا اور اسے بازار چلنے کو کہا۔ ڈرائیور نے خاموشی سے تعمیل کی اور گاڑی بازار کی طرف موڑ دی۔ اس دوران مجھے کچھ سوچ بچار کا موقع مل گیا تھا۔

ڈرائیور مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا ہوا ایک باروق بازار میں پہنچ گیا۔ بڑے ڈاک خانے کے پاس چوک میں خاصا رش تھا۔ بسیں، ٹرامیں، سائیکل رکشے اور موٹریں ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ سائیکل سوار اور پیدل چلنے والے ہجوم میں راستہ بناتے گزر رہے تھے۔ ہر طرف شور سامچا ہوا تھا، نفاسی اور افراتفری! یوں لگتا تھا جیسے ہر کسی کو کہیں پہنچنے کی جلدی ہو۔ ڈرائیور نے چوک میں گاڑی آہستہ کی تو میں یونہی دکانوں اور دیواروں پر آویزاں سائن بورڈ پڑھنے لگا۔ زیادہ تر بورڈ بنگالی میں تھے تاہم کہیں کہیں بنگالی کے ساتھ اردو اور انگریزی میں لکھے ہوئے بورڈ بھی تھے۔ گاڑی ایک جگہ ٹھہر گئی۔ ہم سے آگے گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی وجہ سے ٹریفک جام ہے۔ جس جگہ ہم رکے ہوئے تھے یہ دورویہ سڑک تھی۔ درمیان میں تقریباً پانچ فٹ چوڑی کچی پٹی تھی جس میں مضبوط تناور درخت اگے ہوئے تھے۔ دفعتاً میری نگاہ درخت کے ایک تنے پر پڑی۔ جس پر ٹین کی چادر پر لکھا ہوا ایک اشتہار کیلوں سے ٹھونک کر لگایا گیا تھا۔ اشتہار پر اردو اور بنگالی زبان میں لکھا تھا۔

”بنگالی باوا! ستر سالہ تجربہ کار ماہر عملیات و روحانیات! ہر طرح کے جادو، ٹونے، آسیب، اور بھوت پریت کے اثر کا توڑ کروائیے..... دل پسند شادی نوکری، کاروبار میں ترقی اور حکام بالا کی تسخیر کے لئے رجوع کریں۔ آستانہ فیضیہ دھان منڈی نزد شیواجی مندر چٹا گاند!“

مجھے یوں لگا جیسے دل کی مراد برآئی ہو۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”مجیب میاں تم مجھے یہیں اتار دو“ میں کچھ خریداری کر کے رکشے پر گھر چلا جاؤں گا۔ تم گاڑی دفتر لے جاؤ۔“

یہ کہہ کر میں گاڑی سے اتر گیا اور ذہن میں آستانہ فیضیہ کا پتہ دہراتا ایک سمت چل پڑا۔ جب میں گاڑی سے خاصا دور آ گیا تو میں نے ایک سائیکل رکشہ والے کو روکا۔ ”دھان منڈی چلے گا؟ شیواجی



مندرجہ کے پاس آستانہ فیضیہ ہے وہاں جانا ہے؟“

سائیکل رکشہ والے نے اثبات میں سر ہلایا۔ شیواجی مندر سے وہ بخوبی واقف تھا۔ کرایہ ایک روپیہ ہوئیں گا، ایدر سے بوت دور ہے۔“ رکشہ والے نے چلنے سے پہلے کہا۔ میں نے جیب سے دو روپے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھے اور کہا۔ ”ایک روپیہ تمہارا انعام ہے اب ذرا تیز چلو۔“

رکشہ والے کو جیسے پر لگ گئے۔ وہ ترنگ میں آ کر تیز تیز پیڈل مارنے لگا اور ہانپتے ہوئے کوئی بنگالی گیت گنگنانے لگا۔ آدھ گھنٹے میں ہم شیواجی مندر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ یہ قدرے کم گنجان آباد علاقہ تھا اور یہاں پانی کی ایک ندی بہہ رہی تھی جس کے آس پاس ناریل کے بے شمار جھنڈ تھے اور بانس کے پودے جھاڑیوں کی صورت میں اگے ہوئے تھے۔ مندر بہت بڑا تھا اور اس کے احاطے سے متصل ایک کچی بستی تھی۔ ہم بستی میں داخل ہوئے ہی تھے کہ مجھے بانس سے بنا ہوا ایک بڑا سا جھونپڑا دکھائی دیا۔ جس کی چھت کھریل کی تھی اور اس پر جنگلی کبوتر بیٹھے غرغروں کر رہے تھے۔ سامنے دروازے پر ایک پرانا سا بورڈ لگا تھا جس پر بنگالی اور اردو دونوں زبانوں میں ”آستانہ فیضیہ“ لکھا ہوا تھا۔

میں نے رکشہ والے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ نیچے اتر کر میں نے جھونپڑے کے دروازے پر دستک دی۔ دوسری تیسری دستک پر ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ وہ گہرے سانولے رنگ کی کمزوری عورت تھی جس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور بال پریشان تھے البتہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جیسے اندھیرے میں دو چور بتیاں جل رہی ہوں۔ بدن پر میلی سی ساڑھی تھی۔ اس نے سر سے لے کر پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور بنگالی میں کچھ کہا جس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ میں کون ہوں اور مجھے کس سے ملنا ہے۔ میں نے جواباً اردو میں کہا۔ ”میں ایک حاجت مند ہوں، بابا سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے تعویذ چاہیے۔“

”بابا تو گیان میں ہے۔ وہ اس وقت کسی سے نہیں ملنے کا۔“ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں جواب دیا۔ ”بڑی بی میں بہت دور سے آیا ہوں۔“ میں نے التجا کی۔ ”مجھے بابا سے اسی وقت ملنا ہے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے ان سے ملوادو؟“

”بولانا اس وقت وہ کسی سے نہیں ملنے کا۔“ اس نے رکھائی سے کہا اور واپس پلٹنے لگی۔ میں نے اسے آواز دے کر روکا اور جیب سے پانچ کانوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بڑی بی! یہ رکھ لو“ کچھ راشن واشن لے لینا۔“ پھر قدرے رک کر میں نے لجاجت سے کہا۔ ”ذرا دیکھو تو اگر بابا نے گیان دھیان سے کچھ دم لیا ہو تو میں ان سے مل لوں، زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔“

نوٹ دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے یوں جھپٹ کر نوٹ پکڑا جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس نے ذرا دیر کی تو میں اپنا ارادہ بدل لوں گا۔ نوٹ اپنے بوسیدہ بلاؤز کے گریبان میں اڑس کر اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو

گیا۔ رکشے والے کو میں نے رخصت کر دیا تھا۔

یہ ایک تاریک مگر کشادہ کمرہ تھا جس کے فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ عورت نے مجھے چٹائی پر بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا اور خود اس سے متصل کمرے میں چلی گئی۔ وہ جس دروازے سے دوسرے کمرے میں داخل ہوئی تھی وہ کھلا ہوا تھا۔ تاہم ایک بھاری پھولدار پردہ اس کے سامنے لٹک رہا تھا۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوٹ آئی اور مجھے اس کمرے میں جانے کو کہا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھا اور پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک درمیانے سائز کا نیم روشن کمرہ تھا جس کے کونے میں ایک دپلا پتلا مگر قدر آور بنگالی بابا آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے سیندھوری رنگ کا لباس پہن رکھا تھا، گلے میں بڑے بڑے رنگ دار منکوں والی مالائیں تھیں اور ہاتھوں میں لوہے کے کڑے تھے۔ اس کے سانولے چہرے پر گھنی سفید داڑھی تھی۔ سر کے بال لمبے تھے جو میلی لٹوں کی صورت میں اس کے شانوں پر جھول رہے تھے۔ اس نے اپنے سامنے مٹی کی ایک ہانڈی رکھی ہوئی تھی جس کے اندر کوئی شے سلگ رہی تھی اور اس کی ناگوار سی بو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بنگالی بابا سر جھکا کر آنکھیں بند کئے منہ ہی منہ میں کچھ بد بدار ہاتھا۔

میں نے دروازے کے پاس رک کر اسے سلام کیا۔ میری آواز سن کر اس نے اپنا سر اٹھایا اور اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ یکا یک اس کے چہرے پر اضطراب کی پرچھائیں لہرائیں اور وہ بے یقینی کے عالم میں مجھے یک ٹک دیکھنے لگا۔ اس کے پرسکون وجود میں ہیجان سا برپا ہو گیا تھا۔ دفعتاً وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لپک کر میرے مقابل آ کھڑا ہوا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی اور ناک کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ میں اس کی یہ کیفیت دیکھ کر مضطرب ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے بازو تھامے اور اپنی انگاروں جیسی سرخ آنکھوں سے میری پیشانی گھورتے ہوئے ہیجانی کیفیت میں بولا۔ ”بس کس (کچھ) مت بول رے بالک! میرے کو سب مالم (معلوم) ہو گیا ہے کہ تو (تجھ) پر کیا بیتی ہے!“ تیرے ماتھے پر بنا چگاڑا مالک مدھم نشان سب کہانی سن رہا ہے!“

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ بدستور میری پیشانی دیکھ رہا تھا اور منہ ہی منہ میں نہ جانے کیا بول رہا تھا۔ میں بری طرح زوریں ہو گیا۔

”آپ کو کیا معلوم ہو گیا ہے..... بابا؟“ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا اور اپنی پیشانی چھو کر دیکھنے لگا۔ اس کا یہ کہنا کہ میرے ماتھے پر چگاڑا کی شکل کا کوئی نشان ہے۔ میرے لئے ایک بھیا ٹک انکشاف تھا۔

بابے نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ اس نے اپنی دہکتی ہوئی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالیں اور متمتاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”بتا رے بالک وہ سسری تڑے کس ساحل پر پڑی ملی تھی؟“



میں بابے کے اس سوال پر پہلے سے بھی زیادہ حیران بلکہ ہکا بکا رہ گیا۔ وہ حقیقتاً کوئی بہت ہی بڑا عامل تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہی میرا نجات دہندہ ثابت ہوگا۔ میں مرعوبیت کے مارے اس کے قدموں میں بیٹھ گیا اور زندگی ہوئی آواز میں کہا۔

”بابا! وہ مجھے کراچی کے ساحل پر ملی تھی۔ بعد میں میں اسے یہاں لے آیا اور اس کے ساتھ رہنے لگا۔“

”اب کہاں ہے وہ؟“ اس نے جلدی سے پوچھا۔

”وہ چلی گئی ہے۔ نہ جانے کدھر۔ لیکن جاتے ہوئے عندیہ دے گئی ہے کہ واپس آئے گی۔“

یہ کہہ کر میں نے اس کے پاؤں پکڑ لئے اور سراپا التجا بن کر کہا۔

”مجھے اس سے بچاؤ بابا! اور نہ خوف و دہشت سے میری جان نکل جائے گی۔“

”پھل نہیں کر بالک!“ بابے نے میرے بال کھینچے۔ ”میں اب اس سری کو ایسا ناچ نچاؤں گا کہ زاد (یاد) رکھے گی۔ لونڈی بنا کر رکھوں گا سری کو۔“

بابے کی آواز میں ایسا عزم اور ایسا جوش تھا کہ میرے وجود میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ میں اس کے قدموں سے اٹھ بیٹھا اور امید بھری نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی جذبہ مسرت سے متمل تھا۔ آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسی شکار کو جال میں پھنسا دیکھ کر کسی شکاری کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ اب خلا میں نہ جانے کس شے کو گھور رہا تھا اور آپ ہی آپ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اب دیکھو گا ترے (تجھے) سری چپون!“

چپون کا لفظ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ وہی لفظ تھا جو دادی جان مرحومہ کے منہ سے اس وقت ادا ہوا تھا جب وہ نیلم کو دیکھ کر بے ہوش ہوئی تھیں۔ میں نے تجسس کے مارے پوچھ لیا۔

”یہ لفظ چپون میں پہلے بھی سن چکا ہوں بابا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟“

”برما کی زبان میں چمپا کے پھول کو چپون کہتے ہیں۔ ویسے برما کے جنگلوں میں جن خون آشام چکاڈوں کا بسیرا ہے ان کی دیوی بھی چپون کہلاتی ہے! یہ وہی چپون ہے جو تمہارے پیچھے پڑ گئی ہے۔ سری حسین و جمیل عورتوں کا روپ دھاریتی ہے!“

”اوہ!“ میں خوف سے لرز اٹھا۔

بنگالی بابے نے ایک بے ہنگم تہقہہ لگایا اور بولا: ”چتنا نہ کرو بالک! وہ سالی میرے ہوتے ہوئے تمہارا گیس نہیں بگاڑ سکتی۔“ اس نے میرا شانہ تھپ تھپایا۔ ”میں ایک ایسا چلہ کاٹوں گا کہ سری ہاتھ باندھے میرے سامنے آ کھڑی ہوگی۔ بس تو ایک کام کر۔ اپنے گھر ذ اور اس کا کوئی ایسا زوڑا (جوڑا) مجھے

لا دے جسے وہ اکثر پہنتی رہی ہو۔ پھر میں ذانوں اور میرا کام!“

بابے کی بات سن کر مجھے کچھ حوصلہ ملا، لیکن گھر جا کر نیلم کا جوڑا لانے کی میرے اندر ہمت نہ تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”بابا میں گھر چلا تو جاؤں..... لیکن..... اگر وہ واپس آ گئی تو؟“

بنگالی بابے نے لمحہ بھر کیلئے سوچا پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

”اچھا چل میں بھی تیرے ساتھ چلتا ہوں۔“

کوئی گھنٹہ بھر بعد ہم دونوں کانٹج کے سامنے کھڑے تھے۔ اس وقت بادل گھر آئے تھے اور ساحلی علاقہ ان سیاہ بادلوں کی وجہ سے گہری شام ہو جانے کا تاثر دے رہا تھا۔ بنگالی بابے نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور پھر فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی۔ دفعتاً اس کے چہرے کے تاثرات بدلے اور وہ کانٹج کی بالائی منزل کی جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی نگاہ کے تعاقب میں نظریں اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کی طرف دوڑائیں۔ اسی لمحے ایک شعلہ سا لپکا اور آن واحد میں پورے کانٹج میں آگ بھڑک اٹھی۔ بنگالی بابے نے سراپسیگی کے عالم میں میرا ہاتھ پکڑا اور بلند آواز میں یہ منتر پڑھتے ہوئے کانٹج کی مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔

”ازائیل! ازائیل! تم زاگ شوان شمندرا!..... ازائیل! ازائیل! تم زاگ شوان شمندرا!“

بنگالی بابے کو بدحواس دیکھ کر میری سٹی گم ہو گئی۔ خوف کے مارے میرا وجود لرز نے لگا تھا اور ٹانگیں بے جان ہو گئی تھیں، مگر بنگالی بابے کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ میں اس کے ساتھ گھسٹتا بھاگتا چلا گیا۔ کوئی دوسو گز دور جا کر بابا رک گیا اور اپنی سانسیں بحال کرتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ کانٹج پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا اور شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے قریب کے گھروں کے مکین بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگتے دکھائی دیئے۔ وہ بلند آواز میں آگ آگ پکار رہے تھے۔

اپنے گھر کو جلتا دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ سب کچھ میری نظروں کے سامنے خاکستر ہو رہا تھا۔ مگر میں بے بس تھا۔ گھر کے ساتھ اس گھر سے وابستہ کچھ خوشگوار یادیں، نیلم کے ساتھ گزارے ہوئے کچھ حسین لمحے بھی میری آنکھوں کے سامنے راہ ہو رہے تھے۔ اپنا آشیانہ راہ ہوتے دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

”یہ سب اس سری کا کیا دھرا ہے بالک!“ بنگالی بابے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے بروقت علم نہ ہو جاتا تو ہم دونوں بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ جاتے۔ لگتا ہے وہ لوٹ آئی ہے اور سخت گسے (غصے) میں ہے..... میرے کھیاں میں اس دخت تمہارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے فکر مندی سے کہا۔



”اب اس چلے کا کیا ہوگا بابا جس کے لئے تم کپڑوں کا جوڑا مانگ رہے تھے؟“ میں نے پریشان ہو کر استفسار کیا۔ ”سب کپڑے تو مکان کے ساتھ ہی جل گئے ہیں۔“

”اب وہ چلے تو نہیں ہو سکے گا“ مگر میں اس سسری کو چھوڑوں گا نہیں۔ اس کا کوئی نہ کوئی بندوبست تو ضرور کروں گا۔“ اس نے پر عزم لہجے میں کہا۔ پھر قدرے سوچ کر بولا۔ ”تم اپنے سینے کے کچھ بال مجھے دے کر یہاں سے نکل ڈاؤ (جاؤ) بالک! اس شہر سے جتنی زلدی (جلدی) دور نکل لو اچھا ہے۔ ورنہ تمہارے حق میں بوہت بُرا ہوگا۔“

میں پریشانی کے عالم میں اس کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور وہ قدرے متفکر نظر آتا تھا۔ اس کے لہجے کا وہ جوش جس کا مظاہرہ اس نے آستانے پر کیا تھا، عنقا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے چوغے کی جیب سے ایک چھوٹی سی قینچی نکالی اور مجھے تھوڑا قریب ہونے کا اشارہ کیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنی قمیض کے بٹن کھولے اور اپنا سینہ اس کے سامنے کر دیا۔ جب وہ بالوں کا ایک گچھا کاٹ کر فارغ ہوا تو انہیں ایک رومال میں باندھتے ہوئے بولا۔

”میں کچھ دیر یہاں رک کر ڈاپ (جاپ) کروں گا بالک۔ تم اب چلے ڈاؤ (جاؤ)۔“

”میں کہاں جاؤں بابا؟“ میں نے فکر مندی سے کہا۔ ”اگر وہ مجھے نقصان پہنچانے کے درپے ہو گئی ہے تو میں کہیں بھی چلا جاؤں وہ مجھے ڈھونڈ نکالے گی۔ جو اپنی دنیا سے اتنی جلدی یہاں پہنچ گئی۔ اس کے لئے کوئی بھی فاصلہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟“

”بھکر نہیں کرو بالک!“ اس نے میرا شانہ تھپتھپایا۔ ”میں تمہیں ایک ایسی چیز دوں گا۔ جسے پہن کر اس سسری سے تمہاری ڈان (جان) کو کوئی کھترہ (خطرہ) نہیں رہے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے چاندی کا ایک کڑا اتارا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا۔ پھر کڑا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اسے اپنے بائیں ہاتھ میں پہن لے بالک!“

میں نے کڑے کی طرف یوں ہاتھ بڑھایا جیسے کوئی نعمت متبرکہ میرے ہاتھ آگئی ہو اور جلدی سے اسے پہن لیا۔ جب میں کڑا پہن چکا تو اس نے کہا۔ ”اب تم ڈاؤ (جاؤ) اور یہاں راد رکھنا اسے کبھی اتارنا نہیں ورنہ وہ تڑے آ لے گی!“

کچھ دور سڑک پر مجھے ایک بس کھڑی نظر آئی۔ میں نے ہاتھ لہرا کر کنڈیکٹر کو رکنے کا اشارہ کیا اور بابے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے کچھ رقم پیش کی مگر بابے نے اک شان استغنا سے مجھے منع کر دیا۔ میں نے اس سے مصافحہ کیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا بس میں سوار ہو گیا جو فوراً ہی چل پڑی۔

بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ تمام سیٹیں پر تھیں اور ان کے درمیان راستے میں بھی لوگ

کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے بمشکل کھڑا ہونے کی جگہ ملی۔ بس غالباً شہر کی طرف جارہی تھی۔ وہ کہیں بھی جا رہی ہوتی فی الوقت میرے لئے بے معنی تھا۔ میرا مطمع نظر صرف یہ تھا کہ اس مقام سے جلد از جلد دور ہو جاؤں۔ کنڈیکٹر نے میرے آگے کھڑے مسافر سے استفسار کیا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ جواب میں اس نے اسے سٹی سٹاپ کا ٹکٹ کاٹنے کو کہا۔ میں نے بھی اسی مسافر کی پیروی کی۔ بس فرائے بھرتی چلی جارہی تھی۔ بس کے ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی جیسے بھاگ رہا تھا۔ طرح طرح کے پریشان کن خیالات آرہے تھے۔ اپنے مستقبل کے متعلق سوچتے ہوئے میرا سر دکھنے لگا۔ میری حالت طوفان میں گھرے ہوئے اس شخص جیسی تھی جو تباہ شدہ بحری جہاز سے لائف بوٹ لے کر نکلا ہوا اور سمندر کی بے رحم موجوں کے تھپیڑے سہتا کسی جزیرے کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ اپنے گھر والوں سے میں نیلم کی خاطر ناٹھ توڑ آیا تھا۔ اور آتے ہوئے قتل جیسا بھیانک جرم بھی کر بیٹھا تھا۔ کراچی پولیس یقیناً میری تلاش میں سرگرم ہوگی۔ وہاں واپس جانے کا مطلب سوائے اس کے کیا ہوتا کہ میں جانتے بوجھتے پھانسی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ چٹا گانگ آ کر جو کچھ بنایا تھا وہ چند لمحے پہلے میری نظروں کے سامنے را کھ ہو گیا تھا۔ نئے سرے سے یہاں اپنی زندگی شروع کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔ چمپون نے جس طرح اشتعال میں آ کر میرے کانچ کو جلا کر بھسم کر ڈالا تھا اس کے بعد بنگالی بابے کی اس بات پر یقین کئے بنا کوئی چارہ نہ تھا کہ میری زندگی کو یہاں خطرہ ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ میرا بنگالی بابے کے پاس جانا اسے ناگوار گزرا ہے کیونکہ وہ اسے قابو کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اس کا لباس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور مذکورہ چلہ کاٹ لیتا تو وہ اس کے قبضے میں چلی جاتی اور عملاً اس کی لونڈی بن جاتی۔ بنگالی بابے کو وہاں بلانے والا میں تھا اس لئے وہ مجھ پر بھی غضب ناک ہو گئی تھی۔ اندریں حالات میرا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر تھا۔

میں سوچنے لگا کہ کہاں جاؤں؟ اب ایک ہی ٹھکانہ رہ گیا تھا..... ڈھاکہ میں طاہر مسعود کا گھر۔ وہ میرا دوست بھی تھا اور ہمدرد بھی۔ اب اسے جا کر ساری روداد سنانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا وہ اس قدر ناقابل یقین تھا کہ وہ بھی مشکل ہی سے یقین کرتا۔ مجھے ایک موہوم سا خدشہ یہ بھی تھا کہ وہ نیلم کے غائب ہو جانے پر مجھ پر کچھ اور شبہ کرے گا۔ وہ یہ بھی سوچ سکتا تھا کہ میں اسے کراچی سے بھگا کر لایا تھا اور چند روز اس کے جسم سے کھیل کر اسے ٹھکانے لگا دیا ہے اور اب ایک الٹی سیدھی سنووری گھڑی ہے۔

بس ایک جھٹکے سے رکی تو میں خیالات کی دنیا سے لوٹ آیا۔ یہ سٹی سٹاپ ہی تھا۔ بس میں چڑھنے والوں کو اترنے والوں سے زیادہ جلدی تھی۔ کئی دھکے کھا کر میں بمشکل نیچے اتر ا۔

سامنے ڈاک خانے کی عمارت تھی جہاں صبح میں ڈرائیور کے ساتھ آیا تھا۔ میں آہستگی سے چلتا ہوا ڈاک خانے کی عمارت کے سامنے بنے برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ ڈھاکہ کے لئے فلائٹ ساڑھے تین



بجے روانہ ہوتی تھی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سوا دو بج رہے تھے۔ بھوک سے آنتوں میں آٹھن سی ہو رہی تھی، لیکن کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھانے کے لئے وقت نہیں تھا۔ فرخ بیگ کوفون کر کے ڈھاکہ روانگی کی اطلاع دینے کا خیال آیا مگر پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ وہ دس طرح کے استفسارات کرے گا۔ اسے یوں اچانک ڈھاکہ روانگی کی کیا وجہ بتاؤں گا؟ عین ممکن تھا کہ میرے گھر کو آگ لگنے کی اطلاع اسے مل گئی ہو اور وہ گاڑی لے کر بجلت وہاں جا پہنچا ہو۔ گوڈرائیور نے اسے بتا دیا ہوگا کہ اس نے مجھے شہر میں اتارا تھا، مگر یہ چار گھنٹے پہلے کی بات تھی۔ وہ فکر مند ہوگا کہ کہیں میں بھی تو اس آگ میں نہیں جل مرا۔ اصولاً اس کی پریشانی رفع کرنے کے لئے مجھے اسے فون ضرور کرنا چاہیے تھا، مگر پھر میں اس عالم میں ڈھاکہ چلے جانے کا کیا جواز پیش کرتا جبکہ میرا گھر شعلوں میں جل رہا تھا؟ میں نے اسے فون کرنے کا خیال ذہن سے جھٹک دیا اور واپس سڑک پر آ کر رکشے کا انتظار کرنے لگا۔ میرے سامنے سے کئی رکشے گزرے مگر خالی کوئی بھی نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ایک رکشل ہی گیا۔

رکشے کا ڈرائیور ایک کمزور سادق زدہ آدمی تھا۔ اس نے ایک لنگی اور بنیان پہن رکھی تھی۔ رکشہ کھینچ کھینچ کر اس کے پیچھے بڑے یقیناً چھلنی ہو چکے ہوں گے۔ بات کرتے کرتے اس کی سانس پھولنے لگتی تھی۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر مجھے کوئی اور رکشہ نظر نہیں آیا۔ اس کے رکشے میں بیٹھتے ہوئے مجھے ندامت سی محسوس ہو رہی تھی، مگر پھر یہ سوچ کر بیٹھ گیا کہ میں نہیں بیٹھوں گا تو کوئی اور بیٹھ جائے گا۔ اس کے نصیب میں قدرت نے ڈھور ڈنگروں کی طرح رکشہ کھینچنا ہی لکھا تھا تو اسے یہ کارمشقت بہر طور نبھانا تھا۔

ہم سب لوگ قدرت کے ہاتھوں میں کھیلنے والے کھلونے ہیں۔ کسی کے نصیب میں غربت ہے اور کسی کے نصیب میں امارت، کوئی عزت کے عرش پر متمکن ہے تو کوئی ذلت کے فرش پر گرا نظر آتا ہے۔ قدرت جب چاہے لوگوں کے درمیان ان کے دن پھیر دے۔ خود میرے ساتھ یہی ہوا تھا۔ آسمان نے ایسی تماشاگری کی تھی کہ سب کچھ تہہ بالا کر دیا تھا۔

رکشہ ایئر پورٹ کی سمت رواں دواں تھا۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ دوڑائی۔ آسمان ہنوز بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ پرواز کی روانگی سے پہلے بارش نہ ہو ورنہ پرواز منسوخ بھی ہو سکتی تھی۔ دل میں یہ ڈر بھی تھا کہ جانے جہاز میں سیٹ بھی ملے گی یا نہیں۔ میں اس امید پر جا رہا تھا کہ شاید چانس پر ہی کوئی سیٹ مل جائے۔ سیٹ نہ ملتی تو مجھے مجبوراً بس کا سفر اختیار کرنا پڑتا جو خاصا تکلیف دہ ہوتا۔ راستے میں سڑک کنارے ایک بوسیدہ مقبرے کے قریب مجھے سینہ ہوری رنگ کے لباس میں ملبوس ایک ملنگ نظر آیا۔ اسے دیکھ کر میرا دھیان بنگالی بابے کی طرف چلا گیا۔ نہ جانے اس وقت وہ کیا کر رہا ہوگا؟ کیا خبر چمپون اور وہ دونوں اس وقت برسرِ پیکار ہوں۔ وہ ٹھنڈے پیٹوں بنگالی بابے کا

جاپ کبھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ جس کی تکمیل اس کے لئے غلامی کا طوق ثابت ہوتی۔ میں نے ایک نظر بنگالی بابے کے دیئے ہوئے کڑے کی طرف دیکھا۔ یہ آدھا نچ چوڑا اور موٹا سا چاندی کا کڑا تھا۔ جس پر دو بھیانک شہیں بنی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان بنگالی میں شاید کوئی منتر لکھا ہوا تھا جسے پڑھنے سے میں قاصر تھا۔ کڑے کو دیکھا تو مجھے عجیب طرح کی طمانیت اور تحفظ کا احساس ہوا۔ میں نے دل ہی دل میں بنگالی بابے کو دعادی اور رکشے والے کی طرف دیکھنے لگا۔

رکشے والا ہانپتے ہوئے تیز تیز پیڈل مار رہا تھا اور وقتاً فوقتاً کھانس کر دائیں بائیں بلغم تھوکتا ایئر پورٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے اس پر بے حد ترس آیا۔ میں نے ارادہ کیا اسے کچھ فالٹو پیسے ضرور دوں گا۔ بیس پچیس منٹ بعد ہم ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ میں نے رکشے والے سے کرایہ پوچھا۔ اس نے ایک روپیہ طلب کیا۔ میں نے اپنی جان کا صدقہ دینے کے خیال سے جیب سے دس دس روپے کے دونوٹ نکال کر اسے دیئے اور کہا۔

”لو بھائی ان روپوں سے کچھ راشن لے لینا اور اپنا دوا دارو کر لینا۔ تم مجھے بیمار دکھائی دیتے ہو۔“ وہ لنگ ہو کر یوں میری شکل دیکھنے لگا جیسے میں کسی اور جہان کی مخلوق ہوں یا میرے سر پر سینگ اگے ہوئے ہیں۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کوئی بلا وجہ اسے اتنی زیادہ رقم بھی دے سکتا ہے۔

”یہ..... یہ سب روپیہ آ“ آپ میرے کو دے رہا ہے صاب! سب میں رکھ لوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں سب رکھ لو۔“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اس کی آنکھوں میں لرزتے آنسوؤں سے نگاہ ہٹا کر ایئر پورٹ کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ عمارت میں داخل ہونے تک اس کی بلند دعائیں میری سماعت سے ٹکراتی رہیں۔

فلائٹ کی روانگی میں پونا گھنٹہ باقی تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کرتا بنگلہ کا ونٹر کی طرف بڑھا کہ چانس پر کوئی سیٹ مل جائے۔ شاید چند لمحے پہلے کی ہوئی نیکی خدا کو پسند آئی تھی۔ مجھے فوراً ہی ایک سیٹ مل گئی جو کسی صاحب نے کچھ دیر پہلے کینسل کروائی تھی۔ بورڈنگ کارڈ اور ٹکٹ ہاتھ میں آیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس دروازے کی جانب بڑھ گیا جہاں چیکنگ کرنے والا عملہ مستعد کھڑا تھا۔ چیکنگ کروا کے میں تیز قدموں سے چلتا ہوا لاؤنج میں آیا اور پھر اس بس کی طرف بڑھ گیا جو لیٹ آنے والے تین چار مسافروں کو جہاز تک پہنچانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

جہاز میں میری سیٹ کافی پیچھے تھی۔ ایئر ہوسٹس کی رہنمائی میں جب اس سیٹ تک پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ میری سیٹ کے مقابل دوسری قطار کی ایک سیٹ پر براجمان بھاری کم شخص مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اسکی نگاہوں میں ایسا تاثر تھا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے





اپنے ذہن پر زور دیا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ شخص کہیں پہلے مجھ سے مل چکا ہو، لیکن بہت سوچنے کے باوجود مجھے یاد نہ آیا۔ میں نے یہ سوچ کر اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا کہ ہو سکتا ہے میری شکل دیکھ کر اسے اپنے کسی جاننے والے شخص کا گمان گزرا ہو۔

جہاز روانہ ہوا اور عملے نے چائے اور دیگر لوازمات سے مسافروں کی تواضع شروع کی تو ایک بار پھر میں نے اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ ”عجیب آدمی ہے۔“ میں نے الجھن محسوس کرتے ہوئے سوچا۔ ”اتنی تہذیب نہیں کہ کسی کو اس طرح گھور کر نہیں دیکھنا چاہیے۔“

جہاز ڈھاکہ ایئر پورٹ پر اترا اور سب مسافر سامان لینے کے لئے گیلری پہنچے تو میں کنویئر بیلٹ کے پاس سے گزر کر باہر کی جانب چل دیا۔ باہر ایک بڑا برآمدہ تھا۔ جہاں مسافروں کے عزیز واقارب منتظر کھڑے تھے۔ میں نے سوچا قریبی پی سی او سے طاہر مسعود کو فون کر لوں تاکہ وہ مجھے لینے آ جائے یا ڈرائیور بھیج دے۔ میں اس ارادے سے پی سی او کی جانب بڑھا ہی تھا کہ مجھے اپنے عقب میں تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، میرے پیچھے وہی آدمی کھڑا تھا جسے میں نے جہاز میں دیکھا تھا اور جو مجھے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔

”فرمائیے کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کافی دیر سے میری ذات میں غیر ضروری دلچسپی لے رہے ہیں۔“ میرا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا تھا۔ ”میری دلچسپی غیر ضروری نہیں..... بر محل ہے برخوردار!“ اس بھاری کم شخص نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کارڈ میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ کارڈ پر لکھی عبارت تو میں نہ پڑھ سکا تاہم اس پر چسپاں باوردی تصویر دیکھ کر میری سٹی گم ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑ لیا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

”میں پولیس انسپکٹر شیر محمد ہوں اور میرا تعلق کراچی پولیس سے ہے۔ اب تو تمہیں سمجھ آ جانی چاہیے کہ میں تمہاری ذات میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہوں..... مسٹر محبوب احمد خان!“

☆.....☆.....☆

One Urdu Forum . Com

میں اس کے منہ سے اپنا نام سن کر ششدر رہ گیا۔ لمحہ بھر کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے شعور کی طنابیں میرے ہاتھ سے پھسل گئی ہوں۔ مجھے کوئی جواب بھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اپنے حواس مجتمع کرنے میں چند لمحے ملے۔ میں نے انسپکٹر کے ہونٹوں پر کھینے والی زہریلی مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے سنبھل کر کہا۔

”آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے انسپکٹر صاحب۔ میرا نام محبوب احمد خان نہیں ہے۔“

”اچھا!“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”تو پھر جناب کا نام کیا ہے؟“

”مم..... میں طاہر مسعود ہوں۔ چٹا گانگ میں ایکسپورٹ، امپورٹ کا بزنس کرتا ہوں۔“

”خوب!“ وہ ہنسنے لگا۔ ”آدمی ایئر پورٹ پر کھڑا ہو، جہاز کا استعمال شدہ ٹکٹ جس پر اس کا اصل نام درج ہے، اس کی جیب میں ہو اور اس کے باوجود نام چھپانے کے لئے جھوٹ کا سہارا لے تو اسے احمق ہی کہا جاسکتا ہے.....!“

میں اس کی بات سن کر بری طرح ٹپٹا گیا۔ وہ بہت کا یاں قسم کا پولیس آفیسر تھا۔

”میاں صاحبزادے..... بہتر ہوگا خاموشی سے میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلے چلو۔“ اس نے مجھے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے کہا اور میرے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

”میں کہیں نہیں جا رہا انسپکٹر صاحب!“ میں نے اپنا لہجہ مضبوط بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ”براہ کرم میرا بازو چھوڑ دیں اور مہذب انسانوں کی طرح مجھ سے بات کریں۔ فرض کریں، میں محبوب احمد خان ہی ہوں۔ پھر بھی مجھے یہ پوچھنے کا حق تو حاصل ہے کہ آپ مجھے پولیس اسٹیشن لے جانے کی بات کیوں کر رہے ہیں؟ میں نے کیا جرم کیا ہے؟“

”زیادہ بھولا بننے کی کوشش مت کرو، سمجھ!“ اس نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ”تمہارا جرم تمہیں خوب معلوم ہے۔ سیدھے سبھاؤ پولیس اسٹیشن چلو، ورنہ مجھے سختی کرنی پڑے گی۔“

”تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔“ میں نے درشتی سے کہا۔ ”میں معاشرے کا ایک مہذب، باعزت اور شریف شہری ہوں۔ خدا جانے تم مجھے کس جرم میں ملوث کر رہے ہو۔ کیا تمہارے پاس میرے وارنٹ



ہیں؟ لیا لیا ہے میں نے؟ میری آواز خاصی بلند ہوئی سی۔ قریب سے لرزے والے سی گول، پچھلے چلتے رک گئے اور پرجسس نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگے۔

”یہ تو میں تمہیں پولیس اسٹیشن پہنچ کر بتاؤں گا کہ تم نے کیا کیا ہے؟“ اس نے مجھے نگلی گالی دیتے ہوئے کہا اور پھر میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس کی گالی سن کر میرے ذہن میں یکدم جیسے بھونچال آ گیا۔ مجھ پر ایک بار پھر وہی جنونی کیفیت طاری ہو گئی جو ایسے موقعوں پر مجھ پر طاری ہو جاتی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا اور دائیں ہاتھ کا ایک بھر پور گھونسا اس کی ناک پر جڑ دیا۔ اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے ناک پکڑ کر کسی تناور درخت کی طرح دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ اس کے نتھنوں سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا جس سے اس کے کپڑے تر ہورہے تھے۔ وہ بری طرح چیخنے چلانے لگا تھا۔ میں اسے اٹھا کر دوبارہ نیچے پٹخنا چاہتا تھا۔ میں اس ارادے سے وحشیانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا، مگر عقب سے کئی آدمیوں نے مجھے دبوچ لیا۔ دفعتاً فضا میں سائرن کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر میں نے وردی میں ملبوس تین چار پولیس والوں کو اپنی جانب لپکتے دیکھا۔

”پکڑ لو، پکڑ لو اس حرامی کو.....“ زخمی پولیس انسپکٹر زمین سے اٹھ کر کراہتے ہوئے بولا۔ ”یہ قاتل ہے اور چھو کر یاں بھی اغوا کرتا ہے۔“

انسپکٹر کا حکم سنتے ہی پولیس والے مجھ پر پل پڑے۔ دو نے میرے ہاتھ پشت پر جکڑ کر مجھے ہتھ کڑی لگادی اور باقی دو تھپڑوں، مکوں اور لاتوں سے میری تواضع کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں لوگوں کا جمع لگ گیا۔ پولیس والے مجھے دھکیلتے ہوئے پارکنگ ایریا میں لے گئے جہاں ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس پر آویزاں نیلی بتی سائرن کی آواز کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ انہوں نے قربانی کے بکرے کی طرح مجھے اس جیپ میں لاداد اور نہایت تیزی سے سینٹرل پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ جس لڑکی کی خاطر تم نے محمد حنیف ایڈووکیٹ کو قتل کیا اور پھر اسے اغواء کر کے ایسٹ پاکستان لے آئے، وہ لڑکی کدھر ہے؟“ یہ اس پولیس آفیسر کا پہلا سوال تھا، جس کے سامنے مجھے تفتیش کے لئے پیش کیا گیا۔

”میں نے کوئی لڑکی اغوا کی ہے اور نہ کسی شخص کو قتل کیا ہے۔ یہ سب مجھ پر سراسر الزام ہے اور کسی غلط فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ میں دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ کسی صورت میں اقبال جرم نہیں کروں گا۔

”ہونہہ!“ پولیس آفیسر نے گہرا سانس لیا اور پھر میری طرف بغور دیکھتے ہوئے لفظ چبا چبا کر بولا۔

”کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو کہ تمہارا نام محبوب احمد خان ہے اور تم کراچی کے تاجر نذیر احمد

خان کے بیٹے ہو؟ تمہاری والدہ عشرت خان ایک سوسل ور کر ہیں۔ انہیں اور ہمیں کچھ عرصہ پیسٹر ایک نامعلوم لڑکی بے ہوشی کی حالت میں ساحل سمندر سے ملی تھی جسے تمہاری والدہ نے کراچی کے ”آغوش“ نامی دارالامان میں داخل کروادیا تھا۔ تم نے ایک رات چوکیدار کے ساتھ ساز باز کر کے لڑکی کو دارالامان سے اغوا کیا اور اسے ڈھا کہ لے آئے۔ دارالامان سے نکلتے ہوئے محمد حنیف ایڈووکیٹ سے تمہاری مذہبھڑ ہو گئی۔ وہ تمہاری راہ میں مزاحم ہوا تو تم نے اسے بے دردی سے گولی کا نشانہ بنا ڈالا۔ واردات میں استعمال ہونے والا پستول، اور گاڑی پولیس برآمد کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ دارالامان کے چوکیدار نے وعدہ معاف گواہ بن کر پورا قصہ پولیس کے گوش گزار کر دیا ہے۔ پولیس کے پاس پورے شواہد موجود ہیں اور کراچی پولیس کی بھیجی ہوئی فائل بمع تمہاری تصویر میرے پاس ہے۔“ اس نے میز کی دراز سے ایک فائل نکال کر اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”اسلئے میں نے بغیر وقت ضائع کئے تم سے براہ راست یہ سوال پوچھا تھا کہ وہ لڑکی کدھر ہے؟“

پولیس آفیسر کے منہ سے یہ ساری تفصیل سن کر میری جو حالت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے میرے وجود سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ ڈالا ہو۔ لیکن میں نے جیسے تیسے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پا لیا اور اپنی آواز کے ارتعاش کو حتی الامکان کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”انسپکٹر صاحب..... یہ سچ ہے کہ میرا نام محبوب احمد خان ہے اور میں نذیر احمد خان اور بیگم عشرت خان کا بیٹا ہوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے اور میری والدہ کو ایک نامعلوم لڑکی ساحل سمندر پر بے ہوشی کی حالت میں ملی تھی جسے بعد ازاں دارالامان میں داخل کروادیا گیا تھا، لیکن اس کے بعد اس لڑکی کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں۔ محمد حنیف کون ہے، میں اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ میں تو بزنس کے سلسلے میں یہاں ڈھا کہ آیا تھا اور بالکل اکیلا آیا تھا۔ یقین کریں جو باتیں آپ بتا رہے ہیں میرا ان سے بالکل کوئی واسطہ نہیں.....“

”پی آئی اے کے ریکارڈ کے مطابق تم نے کراچی سے ڈھا کہ کے لئے دو سیٹیں بک کروائی تھیں۔ ایک اپنے نام اور دوسری مس نیلم کے نام سے۔ دونوں نشستیں ساتھ ساتھ تھیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ جس کی سیٹ تم نے اپنے ساتھ بک کروائی تھی، وہ لڑکی کون تھی؟“

”میں نے اپنے علاوہ کسی کی سیٹ بک نہیں کروائی.....“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ میرا جواب سن کر انسپکٹر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا، پھر اگلا سوال کیا۔

”یہاں کس بزنس کے سلسلے میں آئے تھے؟“

”جی..... ایکسپورٹ، امپورٹ کے سلسلے میں۔“



”ڈھا کہ اور چٹا گانگ۔“

”ڈھا کہ میں کہاں ٹھہرے تھے؟“

”ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں۔“ میں نے قدرے توقف سے جواب دیا۔ طاہر مسعود کا نام لینا مناسب نہیں تھا۔

”کس تاریخ سے کس تاریخ تک ہوٹل میں رہے؟“ اس نے اگلا سوال کیا۔

”تین دن قیام کیا تھا۔ تاریخیں یاد نہیں۔“

”میاں صاحب زادے، کوئی تو تاریخ ہوگی نا، جب آپ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا تھا۔“ اس کا لہجہ انتہائی تلخ اور درشت ہو گیا۔ ”جلدی تاریخ بتاؤ، میرا وقت ضائع نہ کرو۔“

میں نے وہ تاریخ بتادی، جس روز میں نے ڈھا کہ میں قدم رکھا تھا۔ اس نے ٹیلی فون اٹھا کر انکوائری سے مذکورہ ہوٹل کا نمبر معلوم کیا اور بنگلہ منیجر سے بات کرنے لگا۔ میرے سارے وجود میں سردی کی لہریں دوڑنے لگیں، کیونکہ بنگلہ منیجر اسے بتا رہا تھا کہ اس تاریخ اور اگلے دو تین دنوں میں محبوب احمد خان نام کا کوئی بھی شخص اس ہوٹل میں آ کر نہیں ٹھہرا تھا۔ میرا جھوٹ، جو میں نے بغیر سوچے سمجھے بولا تھا، کھل چکا تھا۔

”ہاں جی اب؟ انسپکٹر نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔“ اس ہوٹل کے ریکارڈ میں تو کہیں تمہارا نام نہیں.....؟“

”میں سم“ بکم“ کی عملی تصویر بنا انسپکٹر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے چپ اور گم سم دیکھ کر وہ اپنی نشست سے اٹھا اور میرے قریب آ کر، میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ تم نیلم نامی اس لڑکی کے ساتھ یہاں آئے اور کسی نامعلوم مقام پر رہتے رہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے اس کے ساتھ کہاں قیام کیا اور اب وہ کہاں ہے؟ یاد رکھو جتنی جلدی سچ بولو گے، اتنا ہی تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ ہم پولیس والوں کے پاس سچ اگلوانے کے ایسے باکمال ہتھکنڈے ہوتے ہیں کہ مردے بھی با آواز بلند سچ بولنے لگتے ہیں.....!“

”انسپکٹر صاحب یقین کریں میں یہاں بالکل اکیلا آیا تھا.....“

”الو کا پٹھا..... حرامی!“ انسپکٹر نے میری بات سنتے ہی اٹھے ہاتھ کا تھپڑ میرے منہ پر مارا اور گالیاں بکنے لگا۔ ”میرا خیال ہے تم آرام سے نہیں مانو گے۔ کرتا ہوں تمہارا بندوبست۔“ یہ کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی۔ اگلے ہی لمحے موٹی مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا آدمی اندر داخل ہوا اور ایڑھیاں بجا کر انسپکٹر کو سلیوٹ کیا۔

”ادھر ہی ہے سر۔“

”اسے بلاؤ اور اس بھڑوے کی ذرا ڈرائنگ روم میں لے جا کر خاطر کرو۔ اسے مہمان داری کی ضرورت ہے۔“

”بہتر سر۔“ اس آدمی نے دوبارہ ایڑھیاں بجا کر سلیوٹ کیا اور باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک اور سپاہی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ پھر دونوں مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک تاریک سی راہداری میں لے گئے۔ وہاں کونے میں ایک بڑا سا کمرہ تھا، جس میں داخل ہوتے ہی میری روح فنا ہو گئی۔ وہاں جسمانی ایذا رسانی اور تشدد کے عجیب و غریب آلات رکھے ہوئے تھے اور ایک جلا د صورت، کالا کلوٹا اور قوی الجشہ آدمی میرا منتظر تھا۔ اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے قصائی بکرے کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر اس نے دونوں سپاہیوں سے بنگالی میں کچھ کہا۔ اس کی بات سنتے ہی دونوں سپاہیوں نے حلق سے عجیب سی آوازیں نکالیں اور مجھے اطراف سے پکڑ کر نہایت پھرتی سے ایک چٹائی پر پٹخ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں خود کو سنبھالتا، اس جلاؤ نما آدمی نے ٹرک کے ٹائر سے بنے ہوئے ایک بھاری چھتر سے میری چھترول شروع کر دی۔ میں بری طرح چیختے اور چلانے لگا مگر اس وحشی نے اپنی مشق ستم جاری رکھی۔ جب وہ مار مار کر تھک جاتا تو کچھ دیر سستانے لگتا اور پھر دوبارہ مجھے پیٹنے لگتا۔ اس نے تقریباً آدھا گھنٹہ مجھے اس قدر مارا کہ درد اور تکلیف کی شدت سے میں بے ہوش ہو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ حواس مجتمع ہوئے تو مجھے احساس ہوا کہ میں حوالات میں بند ہوں۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں ننگے فرش پر پڑا تھا اور میرے ہاتھ ہتھکڑیوں سے آزاد تھے۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے دیکھا کہ میرے جسم پر جگہ جگہ چوٹوں کے نشانات تھے اور بہت زیادہ سوجن بھی تھی۔ میں نے چوٹوں پر ہاتھ رکھا تو درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ میں کراہتے ہوئے بے سدھ لیٹ گیا۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا، مگر یہاں کون تھا جو مسیحائی کرتا۔ رنج و الم کی اس گھڑی میں مجھے امی اور نوشین کی یاد آئی۔ میری آنکھیں چھلک پڑیں اور بے اختیار رو پڑا۔

”ابے مرد ہو کر ٹسوے بہاتا ہے۔ تھوڑا سرم کرو۔“ یہ سنتری کی آواز تھی جو پہرہ دیتے ہوئے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سلاخوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور خاموشی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے آستین سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کئے اور کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

”بھوک تو نہیں لگی؟“ اس نے ہمدردانہ انداز میں پوچھا۔ میں نے جواب دینے کی ضرورت محسوس



نہیں کی۔

”بھوک لگے تو ادھر جنگلے کے ساتھ کھانا پڑا ہے، کھا لینا۔“ اس نے جنگلے سے ہٹتے ہوئے کہا اور اپنا گشت پورا کرنے لگا۔ مجھے کسی قدر بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ پیاس سے حلق بھی خشک ہو رہا تھا مگر درد کی شدت اور نقاہت کی بدولت میرا اٹھنے کو جی نہیں چاہا۔ کچھ احساسِ ذلت بھی اس کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے سے روک رہا تھا، چنانچہ میں لیٹا رہا۔ رات لمحہ لمحہ آگے بڑھتی رہی۔ سنتری کے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر طرف پر اسرار اور مہیب خاموشی تھی۔ میں سوچ کی غلامِ گردشوں میں بھٹکتا رہا، مگر اس جہنمِ کدے سے باہر نکلنے کی کوئی تدبیرِ ذہن میں نہ آئی۔ یہ بات تو واضح تھی کہ کراچی پولیس کی طرف سے انہیں میرے بارے میں مکمل تفصیلات موصول ہوئی تھیں۔ وہ مجھے از خود چھوڑنے والے نہیں تھے۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ ضروری تفتیش کے بعد وہ مجھے کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کریں گے اور پھر بذریعہ جہاز کراچی بھیج دیں گے جہاں مجھ پر نیلم کے اغوا اور محمد حنیف وکیل کے قتل کے الزام میں مقدمہ چلنا تھا۔ میں نے جو جرم کئے تھے وہ مجھے تختہ دار تک پہنچانے کے لئے کافی تھے۔ پھانسی کے پھندے سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ میں پولیس کی حراست سے فرار ہو جاؤں۔ لیکن کیسے؟ یہ ایک بڑا سوال تھا۔

ایک خیال میرے ذہن میں اور بھی آ رہا تھا۔ وہ یہ کہ کسی طرح اپنے دوست طاہر مسعود کو اپنے اوپر ٹوٹنے والی افتاد سے آگاہ کروں۔ ممکن ہے وہ کچھ دے دلا کر تھانے سے میری گلو خلاصی کروادے۔ مگر مجھے اس میں خطرہ نظر آیا۔ پولیس یہ جان کر کہ اس نے مجھے اور نیلم کو اپنے ہاں ٹھہرایا تھا، خود اسے بھی اعانتِ جرم کے الزام میں گرفتار کر سکتی تھی! پھر اس بات کی کیا گارنٹی تھی کہ وہ واقعی میری مدد کرے گا؟ میں نے تو اسے یہ بتا رکھا تھا کہ نیلم میری بیوی ہے جس سے میں نے پسند کی شادی کی ہے اور خاندان کی مخالفت کے پیش نظر اسے کراچی سے ڈھا کہ لے آیا ہوں۔ یہ جاننے کے بعد کہ میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا اور اصل کہانی کچھ اور ہے، وہ مجھ سے برگشتہ بھی ہو سکتا تھا۔

میں مسلسل سوچتا رہا، مگر اس صورتِ حال سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دی۔ میں کسی ننھے سے چوہے کی طرح چوہے دان میں پھنس چکا تھا۔ اب مجھے چمپون کے کہے ہوئے آخری الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اس نے مجھے تنبیہ کی تھی کہ میں اس سے چھٹکارا پانے کے لئے کسی عامل کے پاس جانے کی حماقت ہرگز نہ کروں، ورنہ پچھتاؤں گا۔ بنگالی بابے سے رجوع کرتے ہی مجھ پر یہ مصیبت نازل ہو گئی تھی۔ تو کیا مجھے اس صورتِ حال سے دوچار کرنے والی چمپون ہی تھی؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹکا۔ بنگالی بابے نے مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھنے کے لئے چاندی کا دم شدہ متبرک کڑا پہنایا ہے۔ جب تک یہ کڑا میرے ہاتھ میں رہے گا، وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ میں نے لاشعوری طور پر اپنا

ہاتھ اس کلائی کی طرف بڑھایا جس میں میں نے وہ کڑا پہن رکھا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے مجھے شدید دھچکا لگا۔ کڑا میری کلائی سے غائب تھا۔

میں سمجھا یہ میرا فریبِ نظر ہے یا ذہن کا کوئی فتور، مگر بار بار ٹٹولنے اور دیکھنے کے باوجود کڑا نظر نہیں آیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور اندھیرے میں ادھر ادھر ہاتھ چلانے لگا کہ ممکن ہے کڑا ہاتھ سے اتر کر فرش پر گر گیا ہو، مگر کڑا وہاں ہوتا تو ملتا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور چلا کر سنتری کو آواز دی۔

”سنو، میری بات سنو۔“

”کیا ہے بے کیوں شور مچاتا ہے؟“ وہ میرے قریب آ کر بے زاری سے بولا۔

”بھائی تم نے..... تم نے میرا چاندی کا کڑا تو نہیں دیکھا؟ وہ میری کلائی میں تھا۔“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”مجھے کیا پتہ.....؟“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”صبح منشی سے پوچھنا۔ وہی حوالا تیوں کی رقم، گھڑیاں اور دوسری قیمتی چیزیں سنبھالتا ہے اور مال خانے میں رکھواتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے اس نے میرا کڑا اتارا ہوگا؟“

”اگر کوئی کڑا ہوا تو اسی کے پاس ہوگا اور تمہیں حوالا سے چھوٹنے ہی مل جائے گا، پھک نہ کرو۔ چلو اب سو جاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ پرے چلا گیا۔

میں اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ جب تک کڑا میری کلائی میں تھا مجھے اطمینان سا تھا کہ چمپون مجھ سے دور رہے گی۔ مگر اب میرا دل انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے وہاں آ سکتی تھی اور پھر کچھ بھی کر سکتی تھی.....!

”یا خدا مجھے اس بھیانک مخلوق سے محفوظ رکھ!“ میں نے گڑگڑا کر اپنے رب سے دعا مانگی۔ میرے ذہن کے پردے پر بار بار وہ منظر ابھر رہا تھا جب وہ کھڑکی میں بیٹھ کر سرخ انگارہ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی اور پھر یک لخت ایک بڑی سی کریمہ چمکاڈر کا روپ دھار لیا تھا۔ میں ڈراسہا اپنی کوٹھڑی کے ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ معمولی سی آہٹ پر بھی میرا دل یوں دھڑک اٹھتا تھا جیسے پسلیوں کا حصار توڑ کر باہر آ جائے گا۔ رات کا ایک پہر اسی طرح گزر گیا۔ پھر آہستہ آہستہ نیند مجھ پر غلبہ پانے لگی۔

صبح سنتری کی کرخت آواز سے میری آنکھ کھلی تو دن کا اجالا ہر سو پھیل چکا تھا۔ مجھے جگا کر سنتری راہداری کی طرف مڑا تو کچھ دیر بعد ایک مرل سا آدمی، جو سادہ لباس میں تھا، ہاتھ میں پانی کا کٹورا لئے آ گیا۔ اس کے اصرار پر میں نے منہ پر پانی کے جھپکے مارے اور کلی کر کے چائے کا پیالہ اور دو رس پکڑ لئے جو وہ میرے ناشتے کے لئے لایا تھا۔ چائے بدرنگ اور پتلی تھی۔ رس بھی سیلن زدہ تھے۔ کھانے کو ذہن آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر بھوکے پیٹ کی تحریک پر میں آہستہ آہستہ دونوں چیزیں حلق سے اتارنے لگا۔ ناشتے



سے فارغ ہوا تو کل والے سپاہیوں میں سے ایک مجھے کوٹھڑی سے نکالنے آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرے میں حوالات کے تالے کی چابی۔ تالا کھول کر اس نے مجھے ڈپٹ کر باہر آنے کو کہا۔ مجھے اسی انسپکٹر کے سامنے دوبارہ پیش ہونا تھا جس نے گذشتہ روز مجھ سے پوچھ گچھ کی تھی۔

سات بجے کے قریب میں انسپکٹر کے سامنے پیش ہوا۔ اس بار اس کی معاونت کے لئے ایک بنگالی سب انسپکٹر بھی موجود تھا۔ دونوں نے کوئی ایک گھنٹہ مجھ سے پوچھ گچھ کی۔ مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ یہ دیکھ کر سب انسپکٹر نے انسپکٹر سے کہا۔

”سر میرا کھیاں ہے اس موالی نے چھو کری سے کھیلنے کے بعد اسے کہیں بیچ باج ڈالا ہے۔ یہ اکھا حرامی ہے۔ ایسے نہیں مانے گا۔ اسے ٹکلی پہ چڑھانا ہوئیں گا۔“

”ٹھیک ہے مبین احمد اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کی تیاری کرو۔ دو تین روز کا جسمانی ریمانڈ تو لینا ہی ہوگا۔ حرام ختم کی کھال موٹی معلوم ہوتی ہے۔“ انسپکٹر نے زہریلے لہجے میں کہا۔

انہوں نے مجھے دیوار کے ساتھ فرش پر بٹھا دیا اور ایک سپاہی کو میری نگرانی کرنے کی ہدایت کی۔ سب انسپکٹر مجھے مجسٹریٹ کے پاس لے جانے کے لئے اپنی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد دو مسلح سپاہی کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے ہتھکڑی لگائی اور اس کا دوسرا اپنی بیٹی کے ساتھ باندھ لیا۔ پھر وہ مجھے باہر لے آئے۔ صحن میں ایک کھلی جیپ کھڑی تھی۔ مجھے اس میں بٹھا کر دونوں آگے سامنے بیٹھ گئے۔ سب انسپکٹر آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھے ہی جیپ روانہ ہو گئی۔ چند منٹ بعد ہم ایک بڑی سڑک پر تھے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ مجسٹریٹ کی عدالت کتنی دور ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ عدالت بہت دور نہیں ہوگی۔ میں اس امکان پر غور کرنے لگا کہ آیا جیپ سے چھلانگ لگا کر فرار ہونا ممکن ہے یا نہیں۔ جیپ جس جگہ سے گزر رہی تھی وہ سول لائن کا علاقہ تھا۔ سڑک کے دونوں طرف سول سروس کے افسروں کے بنگلے واقع تھے۔ یہ پرانی طرز کی کوٹھیاں تھیں جن کے سامنے بڑے بڑے لان تھے اور ان کے گرد باڑ کے علاوہ ناریل، بانس اور انناس کے جھنڈا گے ہوئے تھے۔ جیپ ایک بغلی سڑک پر مڑی تو اس کی رفتار انتہائی کم ہو گئی۔ وہاں سڑک ٹوٹی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ڈرائیور نے گاڑی پہلے گیر میں ڈال دی تھی۔ میں نے دونوں سنتریوں کو دیکھا۔ وہ کسی قدر غافل بیٹھے تھے۔ موقع اچھا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ایک لخت اپنے ساتھ بیٹھے سنتری کو جیپ سے دھکا دے کر اس کے ساتھ ہی نیچے چھلانگ لگا دی۔ میرا یہ اقدام اس قدر اچانک تھا کہ سپاہی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ گندم کی بوری کی طرح دھپ سے پکی سڑک پر جا گرا۔ میں چونکہ اس کے اوپر گرا تھا اس لئے مجھے کوئی خاص چوٹ نہیں لگی، البتہ اپنی جھونک میں، میں لڑھک کر گھاس کے اس قطعے میں جا گرا جو سڑک کنارے واقع تھا۔ گرتے ہوئے میں نے سنتری کی رائفل پر نپا

تلا ہا تھا ڈالا تھا اور اب وہ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے سنبھلتے ہی سب سے پہلے اس سنتری پہ فائر کیا جو جیپ کے اندر تھا۔ جیپ پندرہ بیس گز دور جا کر رک چکی تھی اور وہ سپاہی مجھ پر بندوق تان چکا تھا، مگر میری رائفل کی گولی نے اسے پہلے جالیا۔ اس کے حلق سے ایک فلک شکاف چیخ بلند ہوئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا فائر میں نے اس سپاہی پر کیا جو میرے ساتھ سڑک پر گرا تھا۔ اسے شدید چوٹ آئی تھی اور وہ بری طرح ڈکار رہا تھا۔ اس میں زمین سے اٹھنے کی سکت ہی نہیں تھی۔ لیکن میں نے رسک نہیں لیا اور اسے بھی ٹھنڈا کر دیا۔ سب انسپکٹر نے جیپ سے باہر نکلنے کی حماقت نہیں کی، ورنہ اس کا حشر بھی اس کے ساتھیوں سے مختلف نہ ہوتا۔

رائفل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ خطرہ چونکہ ابھی دور نہیں ہوا تھا اس لئے میں نے اسے پھینکا نہیں اور اندھا دھند ایک کوٹھی کے کھلے ہوئے گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ کے ساتھ زنجیر لٹک رہی ہے۔ میرے بائیں ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ گرتے ہوئے ہتھکڑی کا دوسرا سنتری کی پیٹی سے الگ ہو گیا تھا اور اب زنجیر لٹک رہی تھی۔ میں نے زنجیر کو بھاگتے بھاگتے اپنے بازو کے گرد رسی کی طرح لپیٹ لیا۔ میں جس کوٹھی میں گھسا اس کے ایک طرف تنگ سارا ستہ تھا جو غالباً عقب کی طرف جاتا تھا۔ میں اس راستے سے گزر کر دوسری سمت نکل گیا۔ اس طرف سرونٹ کوارٹر تھے۔ جن کے سامنے کھاٹ پر دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے میرے وحشیانہ تیور اور ہاتھ میں پکڑی رائفل کو دیکھ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ایک کتا جو درخت کے ساتھ بندھا ہوا تھا خونخوار آواز میں بھونکنے لگا۔ میں حواس باختہ ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ پھر مجھے ایک چھوٹی سی دیوار نظر آئی، جو دو کوٹھروں کے درمیان حد فاصل کا کام کر دیتی تھی۔ اس کے ساتھ مرغیوں کا ڈربہ بنا ہوا تھا۔ میں نے بھاگ کر مرغیوں کے ڈربے پر ایک قدم رکھا اور دیوار پھلانگ کر دوسری کوٹھی میں کود گیا۔ چند لمحوں کے بعد میں اس کوٹھے کے سامنے بنے وسیع و عریض لان میں تھا۔ وہاں پورچ میں مجھے نیلے رنگ کی ایک کار نظر آئی جس کا ادھیڑ عمر ڈرائیور اگلا دروازہ کھول کر اس کے میٹ جھاڑ رہا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ حالت میں تھی۔ میرے بھاگتے قدموں کی چاپ سن کر، ڈرائیور نے جونہی پلٹ کر میری طرف دیکھا، میں نے اسے جالیا۔ میرے زوردار دھکے سے لڑھک کر وہ نجیف آدمی پورچ کے ستون سے ٹکرایا اور اٹھنے کے قابل نہ رہا۔ میں نے پھرتی سے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور آنا فانا اسے پورچ سے نکال کر باہر سڑک پر پہنچ گیا۔ یہ سب کچھ کسی معجزے کی طرح چشم زدن میں پیش آیا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں اس قدر آسانی سے پولیس کی گرفت سے بچ نکلا ہوں۔

سڑک پر پہنچ کر میں نے اندازے سے دو چار موٹر گاڑے اور ایک ایسی دورو یہ سڑک پر نکل گیا جو شہر سے باہر جاتی تھی۔ میں بار بار عقبی شیشے میں دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ تعاقب کا خطرہ بہر حال موجود تھا۔ میں نے



پولیس جیپ میں وائرلیس سیٹ دیکھا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ اب تک تمام پولیس چوکیوں، ناگوں اور موبائل فورس کو مطلع کر چکے ہوں گے۔ پولیس کسی بھی جگہ ناکہ لگا کر مجھے پکڑ سکتی تھی۔ ہرگز رتے لمحے کے ساتھ میری گرفتاری کا خطرہ بڑھ رہا تھا۔ مجھے جلد از جلد اس علاقے سے دور نکل جانا چاہیے تھا۔

گاڑی اس سڑک پر فرار لے بھر رہی تھی۔ صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ جس کی بدولت میں بلا روک ٹوک اڑا چلا جا رہا تھا۔ میں اسی طرح گاڑی چلاتا پندرہ بیس کلومیٹر دور نکل گیا۔ آگے ایک چوک تھا۔ وہاں میں نے رفتار کم کی تو بائیں جانب جانے والی سڑک پر مجھے پولیس کی ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ وہ مجھ سے پچاس ساٹھ گز دور کھڑی تھی۔ میری رگوں میں سنسنہٹ ہونے لگی۔ میں نے چوک کر اس کیا اور دوبارہ ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ سپیڈومیٹر کی سوئی ستر کے ہندسے کو چھونے لگی۔ میں کچھ ہی دور گیا ہوں گا کہ مجھے وہ جیپ اپنے پیچھے آتی نظر آئی۔ میں نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی۔ اب میں اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی بھگا رہا تھا، جو اس سڑک پر ایک انتہائی خطرناک اقدام تھا، لیکن کیا کرتا میری جان پر بنی ہوئی تھی۔

تیز رفتاری کا مجھے خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ پندرہ بیس منٹ کی ریس کے بعد میں نے پولیس کی جیپ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ غالباً اس میں کوئی خرابی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد مجھے وہ نظر نہیں آئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا، جہاں سڑک کے دونوں جانب ایک گھنا جنگل شروع ہو چکا تھا۔ وہاں میں نے ایک بورڈ بھی آویزاں دیکھا جس پر انگریزی اور بنگالی میں ”مادھو پور جنگل“ لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض اور تاریک سا جنگل تھا۔ دن کے وقت بھی وہاں روشنی خاصی کم لگ رہی تھی۔ دو تین میل کے بعد ایک ندی کا پل آیا اور اس کے ساتھ ساتھ کچی سڑک جنگل کے اندرونی حصے کی طرف جاتی دکھائی دی۔ میں نے گاڑی اس کچی سڑک پر ڈال دی۔ یہ سڑک شاید اس لئے بنائی گئی تھی کہ ٹرک اور چھوٹے جنگل سے کاٹی گئی لکڑی لا کر نزدیکی منڈی، گھاٹ یا ریلوے اسٹیشن تک لے جا سکیں۔ اس سڑک پر میں چار پانچ میل چلا ہوں گا کہ میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ میں نیچے اتر اور چابی لگا کر ڈگی کھولی تاکہ سپئر ٹائر نکال سکوں، مگر یہ دیکھ کر میں نے اپنا سر پکڑ لیا کہ ڈگی میں اسٹپنی تھی ہی نہیں! اب کیا کروں؟ میں نے مایوسی کے عالم میں سوچا۔ میں جنگل کے وسط میں بالکل بے یار و مددگار کھڑا تھا۔ ہر طرف سناتا تھا اور ایک پراسراری خاموشی۔ بس کبھی کبھار کسی پرندے کی چہکار سنائی دے جاتی تھی۔ میں کچھ دیر گاڑی کے قریب بے بسی کے عالم میں کھڑا رہا اور پھر اسی طرح گاڑی چلانے کا فیصلہ کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پنکچر ٹائر کے ساتھ میں نے دو تین میل مزید گاڑی چلائی، مگر پھر آگے بڑھنا ممکن نہ رہا۔ پنکچر ٹائر بری طرح پھٹ گیا تھا اور اس کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ گاڑی کو یونہی سڑک پر چھوڑ دینا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لئے میں نے اسے سڑک سے اتار کر ایک اونچی جگہ کھڑا کیا اور پھر نشیب کی طرف دھکا دے دیا۔ وہ

جھاڑیوں کو روندتی، مہیب آواز کے ساتھ ایک کھائی میں جا گری۔ اس کا رنگ گہرا نیلا تھا اس لئے سبز جھاڑیوں کے ساتھ وہ تقریباً کیمو فلاج ہو گئی۔

میں نے واپس پلٹنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اپنے عقب میں مجھے کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے جیسے ہی پلٹ کر دیکھا میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ پیچھے ایک درخت کے تنے کے ساتھ چمپون کھڑی تھی!.....

”میں واپس آگئی ہوں محبوب!“ اس کی سرسراتی ہوئی آواز میرے پردہ سماعت سے ٹکرائی۔

”تت..... تم.....“ میرے منہ سے اس کے علاوہ کوئی الفاظ برآمد نہ ہوئے۔ خوف سے میرے جسم کا رواں رواں الف کی طرح کھڑا ہو گیا تھا۔ نیم تاریک اور سنسان جنگل میں اسے دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر میری جان نکل گئی تھی۔

”تم مجھ سے اتنا ڈر کیوں رہے ہو ہاں.....؟“ وہ شوخ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ ”میں وہی تو ہوں..... تمہاری نیلم۔“

”تت، تم چمپون ہو.....“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”ایک غیر انسانی مخلوق۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔“

”ایسی باتیں مت کرو محبوب۔ تم سے میرا تعلق ہے اور وہ تعلق بڑا گہرا ہے۔ اتنی آسانی سے یہ بندھن ٹوٹنے والا نہیں۔“

”میں تم سے ہر بندھن توڑ دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ خدا کے لئے تم میرا پیچھا چھوڑ دو.....“ میں نے لجاجت سے کہا۔ ”میں تمہاری منت کرتا ہوں۔“

”بڑے عجیب آدمی ہو تم، محبوب احمد خان.....“ اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ”لوگ مجھے حاصل کرنے کے لئے چلے کاٹتے ہیں۔ اپنی جان تک داؤ پر لگا دیتے ہیں اور ایک تم ہو کہ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو۔ گھر آئی ہوئی نعمت کولات مارنا اسی کو کہتے ہیں! جانتے ہو، میرا ساتھ کسی شخص کے لئے کس قدر خوش بخشی کی علامت سمجھا جاتا ہے؟ میں تمہیں دنوں میں مالا مال کر سکتی ہوں اور تمہاری ہر تشنہ خواہش لمحوں میں پوری کر سکتی ہوں.....“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اگر اس وقت میری کوئی خواہش ہے تو بس یہی کہ تم میری جان چھوڑ دو اور اپنی مہربانیوں کے لئے کسی اور کا انتخاب کر لو۔ میرے لئے تمہاری یہی مہربانیاں بہت ہیں کہ میں اپنے گھر سے بے گھر ہو چکا ہوں اور تین بے گناہ شخص میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

”یہ سب عارضی مصیبتیں ہیں۔ دیکھنا میں تمہیں دنیا کا امیر ترین شخص بنادوں گی۔ عزت، شہرت اور اثر



اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا۔ مجھے اس کے دام میں ہرگز نہ آنا تھا۔ وہ ایک زہریلی ناکن بھی جس کے خوشنما رنگ لاکھ پرکشش اور قابل دید سہی، مگر اس کا زہر سخت جان لیوا تھا۔ میں اب اس کے کسی عمل سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا۔

”اچھا اب میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔“ میں نے سختی سے کہا۔

”کہاں چلے؟“ وہ استعجابیہ لہجے میں پوچھنے لگی۔

”جہنم میں!“ میں نے تیزی سے کہا۔

”اچھی جگہ ہے!“ وہ شوخ انداز میں بولی۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”تم میرے پیچھے ہرگز نہیں آؤ گی۔“ میں نے زچ ہو کر کہا اور پہلو بچا کر سڑک کی سمت جانے کی کوشش کی۔

”آؤں تو کیا کر لو گے؟“ وہ جیسے اڑ کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”دیکھو، میری جان چھوڑ دو۔۔۔۔۔!“ میں نے معافی کے انداز میں دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ کر بے زاری سے کہا۔ ”تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو جب کہ میں تمہارا وجود ایک لمحے کے لئے بھی اب برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے۔“

”ہونہہ۔۔۔۔۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر قدرے توقف سے بولی تو اس کا لہجہ برف کی طرح سرد تھا۔ ”سوچ لو مسٹر محبوب احمد خان۔ میری ڈکشنری میں دوسرے لوگوں سے اظہار تعلق کے صرف دو جذبے، دو لفظ ہیں۔ ایک محبت، دوسرا نفرت یا بالفاظ دیگر دوستی اور دشمنی! جسے میری محبت یا دوستی حاصل ہوتی ہے وہ بہت فائدے میں رہتا ہے۔ جس کے حصے میں نفرت یا دشمنی آ جاتی ہے وہ سراسر گھاسٹے میں رہتا ہے۔ تم دوستی اور محبت کا ہاتھ جھٹک کر نفرت اور دشمنی خرید رہے ہو!“

میں چپ رہا۔ اس کی بات کا کوئی جواب دینے کی میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس وقت میرے دل میں کوئی آرزو تھی تو بس یہی کہ وہ چڑیل مجھے چھوڑ کر چلی جائے اور میں اسے دوبارہ کبھی نہ دیکھوں۔ اس نے میرے ذہن میں کلبلائے والے خیال کو پڑھ لیا۔ کہنے لگی۔

”ٹھیک ہے میں جارہی ہوں۔ ایک وقت آئے گا کہ تم خود مجھ سے مدد کی بھیک مانگو گے۔ میری خوشامدیں کرو گے۔ مجھے یقین ہے وہ وقت ضرور آئے گا!“ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ متمتا اٹھا اور آنکھوں میں شرارے سے پھوٹے نظر آئے۔ پھر اس نے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور یک لخت چگاڈڑ کا روپ دھار کر آسمان کی طرف بلند ہو گئی!

☆.....☆.....☆

مجھے جنگل میں پیدل چلتے چلتے سہ پہر ہو گئی تھی۔ وہ مقام بہت پیچھے رہ گیا تھا جہاں چپون نمودار ہوئی

دروغ مہارے کھری لوندی ہوئی۔ م۔ مین پر یوں بھرمت میں ہرے رہوے اور۔۔۔۔۔“ میں نے دانت بھیج کر کہا۔ ”بہتر ہوگا کہ اب تم میرے سامنے سے دفعان ہو جاؤ۔“

میری اس بات سے اس کے چہرے کا رنگ یکدم بدل گیا۔ آنکھوں سے شعلے سے لپکنے لگے۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”تم اب حد سے بڑھ رہے ہو۔ تمہیں پتہ نہیں کہ جس پر مجھے تاؤ آ جائے میں اس کا کیا حشر کرتی ہوں۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ کسی عامل کے پاس جانے کی حماقت نہ کرنا مگر تم نے میری وارننگ پر کان نہیں دھرے اور اس بڑھے بنگالی بابے کے پاس چلے گئے۔ بڑا عامل بنتا تھا۔ میں نے اسے جلا کر بھسم کر ڈالا۔ میں چاہتی تو تمہارا بھی وہی حشر کرتی مگر مجھے تم پر ترس آ گیا کیونکہ میں تم سے محبت کرنے لگی تھی۔۔۔۔۔ لیکن تمہیں آئندہ کے لئے متنبج کرنے کے لئے میں نے یہ ضرور کیا کہ پولیس کے ہاتھوں تمہیں گرفتار کروادیا اور پھر ترس کھا کر تمہیں ان کے چنگل سے رہائی بھی دلا دی۔ تمہیں یہاں تک لانے میں صرف اور صرف میرا ہاتھ ہے، سمجھے!“

”مگر میں نے تو بنگالی بابے کا دیا ہوا کڑا پین رکھا تھا۔۔۔۔۔ تم مجھ تک کیسے پہنچ سکتی تھیں؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”بابا بابا۔۔۔۔۔“ میری بات سن کر اس نے قہقہہ لگایا۔ ”میں نے ایسے بابے اور ان کے کڑے، انگوٹھیاں بہت دیکھی ہیں۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم اس بات سے واقف ہی نہیں کہ تمہارے سامنے کون ہستی کھڑی ہے۔ یقین کرو، معمولی درجے کے سادھو، عامل اور پیر فقیر میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے!“

میں عالم استعجاب میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ وہ بظاہر ایک معصوم اور حسین و جمیل لڑکی تھی مگر باطن نہایت خوفناک اور خطرناک شے تھی۔ چند لمحوں کے بعد پھر نرمی اس کے چہرے پر جھلکنے لگی۔

”آؤ میں تمہاری ہتھکڑی کھول دوں اور تمہارے زخم اچھے کر دوں۔“ اس نے مجھے گم سم کھڑے دیکھ کر پکارا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے آگے بڑھ کر میری کلائی پکڑ لی اور پھر میں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ اس کا ہاتھ لگتے ہی لوہے کی ہتھکڑی اس طرح نرم ہو گئی جیسے وہ موم سے بنی ہوئی ہو۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے میری کلائی سے الگ کیا اور اسے جھاڑیوں کی طرف اچھال دیا۔ اس کے بعد وہ مسکراتی ہوئی میرے سارے بدن پر اپنے دونوں ہاتھ پھیرنے لگی۔ جہاں جہاں اس کا ہاتھ لگتا، مجھے عجیب سکون بخش ٹھنڈک کا احساس ہوتا۔ چند ہی لمحوں میں میرے سارے وجود سے درد اور سو جن غائب ہو گئی۔ چوٹوں کے نشانات یوں غائب ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں!

”لو اب تم بالکل تندرست اور فٹ ہو۔“ وہ پیچھے ہٹی ہوئی کہنے لگی۔

لمحہ بھر کے لئے میرے دل میں اس کے لئے ممنونیت کے جذبات پیدا ہوئے، مگر جلد ہی میں نے



تھی۔ اس کے چلے جانے سے دل نے اطمینان محسوس کیا تھا مین ایک اسی جانا سا خوف کی سی۔ میں نے اسے خفا کیا تھا اس لئے خدشہ تھا کہ وہ مجھے کسی نئی مصیبت میں مبتلا کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کا آخری جملہ بذات خود خاصا معنی خیز تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ میں خود اس سے مدد کی بھیک مانگوں گا..... بہر حال اب جو مقدر میں تھا وہ ہو کر رہنا تھا۔ اوٹ پٹانگ سوچ کر خود کو ہلکان کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ فی الحال مجھے کوئی مناسب ٹھکانہ تلاش کرنا تھا جہاں دو چار روز سکون سے، چھپ کر گزارے جاسکیں۔ وہیں مجھے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنی تھی۔ ایسٹ پاکستان میں ٹھہرے رہنا میرے لئے بے حد خطرناک تھا کیونکہ میں دو پولیس والوں کے قتل کا ذمہ دار تھا۔ مجھے جلد از جلد وہاں سے نکلنا تھا ورنہ پولیس کے ہتھے چڑھ سکتا تھا جو مجھے تختہ دار پر لٹکا کر ہی دم لیتے۔ کراچی واپس جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ فی الحال یہی مناسب تھا کہ میں برما کی طرف نکل جاؤں یا ہندوستان کا رخ کروں۔ دو چار سال کی روپوشی کے بعد وطن واپس لوٹ جانے کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا۔

انہی خیالوں میں غلطیاں میں نامعلوم منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد جنگل کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی ندی بہتی دکھائی دی۔ اس پر لکڑی کا پل تھا اور ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر انگریزی میں لکھا تھا ”فاریسٹ ریسٹ ہاؤس..... دو میل آگے“ بورڈ دیکھ کر خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے بھٹکے ہوئے مسافر کو صحرا میں نخلستان نظر آ گیا ہو۔ اگرچہ اس وقت تک میں پیدل چل کر بری طرح تھک چکا تھا، مگر بورڈ دیکھ کر میرے بدن میں نئی طاقت بھر گئی۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

اب شام کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں سرمئی بادل نظر آ رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے سارا آسمان ڈھانپ لیا۔ جنگل کا اندھیرا پہلے سے سوا ہو گیا۔ دو تین بار بجلی چمکی اور پھر بادلوں کی گرگڑاہٹ کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ میں نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی مبادا موسلا دھار بارش شروع ہو جائے۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ بارش کا سلسلہ تیز ہو گیا اور طوفانی انداز میں بارش ہونے لگی۔ میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ بارش سے بچنے کے لئے میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک قدرتی جھیل اور پہاڑی نظر آئی۔ پہاڑی جھیل کے دوسرے کنارے پر تھی۔ اس پر ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں ریسٹ ہاؤس کی سفید عمارت صاف نظر آ رہی تھی۔ اس طرف جانے کے لئے ایک کچی سڑک، اس سڑک سے جدا ہو کر جھیل کے کنارے کنارے اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ میں اس پر ہولیا اور پندرہ بیس منٹ کے بعد لاشتم پشتم ریسٹ ہاؤس کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ تیز چلنے اور چڑھائی کی وجہ سے میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔

ریسٹ ہاؤس جس سرسبز پہاڑی پر واقع تھا وہ سطح زمین سے کوئی دو سو فٹ بلند ہوگی۔ دور سے دیکھنے

پر وہ پھوٹی سی سی سی مٹراس کے اوپر ہانی کے لراؤند کے برابر ہموار سی سی، بس کے ایک کنارے پر ریسٹ ہاؤس تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ اینٹ، چونے اور کھیریل سے بنائی گئی ایک خوبصورت اور پر شکوہ عمارت تھی جس میں کئی کمرے تھے۔ سامنے کی طرف ایک بڑا برآمدہ تھا جس کے ستونوں پر رنگ برنگے پھولوں کی بلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ برآمدے کے سامنے ایک وسیع لان تھا، جس کے گرد بانس کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ اس جنگلے کی اونچائی پانچ فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔

سورج دھرتی پر آخری نگاہ ڈال کر افق کے دامن میں منہ چھپا چکا تھا۔ مغرب کی جانب شفق کی سرخی باقی رہ گئی تھی جو آہستہ آہستہ اندھیرے میں گھل رہی تھی۔ بارش کا زور اب ٹوٹ چکا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ دیر بعد بادلوں کا لشکر رخصت ہو جائے گا۔

میں نے جنگلے میں لگے چوٹی گیٹ کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے جنگلے کے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو اندر سے کنڈی لگی ہوئی نظر آئی۔ البتہ اس میں تالا نہیں تھا۔ میں نے بانس کے ایک ٹکڑے کی مدد سے، جنگلے کے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھول لی۔ اندر داخل ہو کر میں نے ٹوٹتی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا، مگر ریسٹ ہاؤس میں مجھے کوئی ذی روح نظر نہیں آیا۔ تمام کمرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں تیز قدموں سے چلتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ بارش سے پناہ میسر آئی تو حواس کچھ ٹھکانے لگے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کے بالوں اور چہرے پر بہتے ہوئے پانی کو پونچھا اور پھر برآمدے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک بڑا اور کھلا برآمدہ تھا جس میں چار دروازے اور چھ کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ برآمدے کے دونوں کناروں پر ایک ایک چھوٹا کمرہ تھا جو بطور اسٹور استعمال ہوتا ہوگا۔ ان دونوں کو بھی میں نے مقفل پایا۔ اگرچہ اب تک مجھے وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ ریسٹ ہاؤس میں چوکیدار ضرور موجود ہوگا۔ جو بارش کی بدولت اپنے کوارٹر میں دبکا بیٹھا ہوگا۔ پہلے میں نے ریسٹ ہاؤس کے پہلو یا عقب میں جا کر سرونٹ کوارٹر میں چوکیدار کو ڈھونڈنے کا ارادہ کیا مگر پھر بارش آہستہ ہونے کے انتظار میں ٹھہر گیا۔

برآمدے میں ایک طرف کین کی دو تین آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ تھکاوٹ سے میرا برا حال تھا۔ میں نے ایک کرسی کھینچ لی اور پاؤں پسار کر اس میں نیم دراز ہو گیا۔ بدن کو قدرے آرام ملا تو مجھ پر خود بخود غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ نہ جانے کس وقت میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

مجھے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ دفعتاً کسی نے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو میرے سامنے کوئی لائین لئے کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے روشنی سے بچنے کے لئے اپنی آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا چھجھانایا اور بغور اسے دیکھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی



یہ بویراں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں رنی سے اٹھ ہوا ہوا۔ مجھے اٹھ کر وہ بے اختیار رو رو کر  
بیچھے ہٹ گئی اور تیز بنگالی لہجے میں کچھ کہا جس کا مطلب شاید یہ تھا کہ میں کون ہوں۔ اس کا انداز خاصا  
جارحانہ تھا۔

”مجھے بنگالی نہیں آتی.....“ میں نے نرم لہجے میں، اردو میں جواب دیا۔

میری بات سن کر وہ چونک پڑی۔ اس نے لالٹین نیچے کر کے بغور مجھے دیکھا اور پھر صاف اردو میں  
بولی۔ ”میں پوچھ رہی ہوں کہ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس کا انداز بدستور جارحانہ تھا۔ اس کے  
اردو بولنے کے لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بہاری لڑکی ہے۔ اس کا رنگ گندی سا تھا۔ نین نقش  
تیکھے تھے اور آنکھیں بڑی بڑی اور خوب روشن تھیں جو فوراً اپنے مد مقابل کی توجہ کھینچ لیتی تھیں، جیسے کہہ رہی  
ہوں باقی چہرے کو چھوڑو پہلے ہمیں دیکھو۔ اس نے ایک معمولی ساڑھی پہن رکھی تھی اور پاؤں سے ننگی تھی۔  
مجھے خیال آیا کہ وہ ضرور چوکیدار کی بیٹی ہوگی۔

”میں اپنے بارے میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔ پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟“ میں نے دوستانہ انداز  
میں کہا۔

”میں چوکیدار کی بیٹی ہوں۔“ اس نے قدرے تامل سے جواب دیا۔ پھر یوں بے چینی سے میری  
طرف دیکھنے لگی جیسی میری طرف سے کسی جواب کی منتظر ہو۔

”میں ایک مصیبت زدہ مسافر ہوں.....“ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”جنگل میں بھٹکتا،  
کسی پناہ گاہ کی تلاش میں اس طرف آنکلا ہوں اور یہاں رات بسر کرنا چاہتا ہوں۔“

”تم غلط جگہ آئے ہو۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”یہ کوئی سرائے یا مسافر خانہ نہیں ہے، محکمہ جنگلات  
کے افسروں کا ریسٹ ہاؤس ہے۔ عام لوگوں کو تو یہاں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر میں مخصوص حالات کا شکار ہو کر ادھر آیا ہوں۔ کیا تم ایک مصیبت زدہ انسان کی  
مدد نہیں کرو گی؟“ میں نے ملتی نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”مصیبت زدہ لوگ دروازے پر دستک دے کر مدد مانگتے ہیں، تمہاری طرح خود دروازے کی کنڈی  
کھول کر بلا اجازت اندر نہیں گھس آتے۔“ اس نے تنک کر کہا۔

”میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔“ میں اس کی بات سے لاجواب ہو گیا۔ ”مجھے واقعی دستک دے کر اندر  
آنا چاہیے تھا۔ مگر تیز بارش میں کچھ بچھائی ہی نہیں دیا۔ دوسرے، ساری عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔  
میں نے سوچا نہ جانے اندر کوئی ہے بھی یا نہیں.....“

”دیکھنے میں تو تم اتنے بے وقوف نہیں لگتے.....“ وہ گردن کو خم دے کر بولی۔ ”کنڈی اندر سے کیا  
فرشتوں نے لگائی تھی جو اندر کوئی نہ تھا؟“

میں زبردستی پوچھ رہی تھی۔ اس نے رنی سے اٹھ کر وہ بے اختیار رو رو کر اپنی برساتی کپڑوں میں  
شرارت بھرے میری طرف دیکھنے لگی۔

”میں تمہارے بابا سے ملنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرتے  
ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ اس نے تھنویں اچکائیں۔

”میں ان سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے ایک رات اس ریسٹ ہاؤس میں قیام  
کرنے دیں۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ اس نے نفی میں سر کو جنبش دی۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ بابا بیمار ہیں۔ انہیں  
اس وقت تیز بخار ہے اور وہ دوا کھا کر سو رہے ہیں، اس لئے تم سے نہیں مل سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس  
سے پہلے ایک دفعہ بابا نے کسی آدمی کو ٹھہرایا تھا تو افسروں کو رپورٹ ہو گئی تھی۔ وہ بابا کو نوکری سے برخاست  
کرنے لگے تھے۔ بڑی مشکلوں سے انہیں معافی ملی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن بابا نے کبھی کسی غیر متعلقہ  
آدمی کو ریسٹ ہاؤس میں داخل نہیں ہونے دیا۔“

”تم لوگ خود کہاں رہتے ہو؟“

”کیوں؟ کیا اب ہمارا مہمان بننے کا ارادہ ہے؟“

”ویسے ہی پوچھ لیا تھا.....“ میں نے خجالت سے کہا۔

”بیچھے ایک کمرے کا کوارٹر ہے۔ میں اور بابا اسی میں رہتے ہیں۔“

”تمہارے بہن بھائی اور ماں جی نہیں ہیں؟“ میں نے اس کی ہمدردی سمیٹنے کی کوشش کی۔

”بابا کے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں.....“ اس نے آہ بھری۔

”اوہ!“ میں نے تاسف سے سر ہلایا۔ وہ اب قدرے نرم پڑ چکی تھی اس لئے میں نے کچھ تامل کے  
بعد کہا۔ ”مجھے تمہاری اور تمہارے بابا کی مجبوری کا پورا احساس ہے، مگر میں تم سے مدد کی التجا کرتا ہوں۔ اگر  
تم مجھے یہاں برآمدے میں سونے کی اجازت دے دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا  
جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کسی کو میری یہاں آمد اور قیام کا پتہ نہیں چلے گا۔ اگر ایسا ہوا بھی تو تم کہہ سکتی ہو کہ  
میں زبردستی برآمدے میں گھس آیا تھا۔!“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے ایک دو بار پلٹ کر موسلا دھار بارش کی طرف نگاہ دوڑائی اور پھر فیصلہ کن  
لہجے میں بولی۔ ”ٹھیک ہے تم یہاں برآمدے میں سو سکتے ہو، لیکن حسب وعدہ تمہیں صبح سویرے یہاں  
سے جانا ہوگا۔ میں مزید کوئی عذر نہیں سنوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ واپس پلٹی اور بارش میں بھاگتی ہوئی کسی  
چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی۔



میں اس سڑکی پر تیزی پر گھورتا ہوا دوبارہ کرسی میں سیم دراز ہو لیا۔ انہی پوری رات پڑی تھی۔ میرے جسم پر گیلیا لباس تھا۔ جب تک میں دوڑتا رہا تھا، مجھے خنکی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب ٹھنڈی ہوا میرے جسم پر کپکپی طاری کئے دے رہی تھی۔ بھوک اور پیاس بھی ستار ہی تھی۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا؟ جیسے تیسے مجھے وہیں براآمدے میں رات بسر کرنی تھی۔

میں کچھ دیر یونہی کرسی پر بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر برآمدے کے ایک کونے میں چلا گیا اور دیوار کے قریب کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے دور ہو گئی تھی۔ میں سوچوں کی راہ گذر پر بھگتا رہا۔ کبھی گھر کے افراد کے چہرے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے، کبھی نیلم کے ساتھ گزرے ہوئے روز و شب کے مناظر پردہ ذہن پر متحرک ہو جاتے اور کبھی پولیس اسٹیشن میں بیٹے ہوئے وقت کی بھیانک یاد دماغ کو ڈسنے لگتی۔ میں پولیس کی گرفت سے تو نکل آیا تھا، مگر ہنوز خطرے کی رینج سے باہر نہیں تھا۔ پولیس یقیناً نہایت سرگرمی سے مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔ اگر ان کا دھیان مادھوپور جنگل کی طرف ہو جاتا تو ان کے لئے اس ریسٹ ہاؤس تک پہنچنا چنداں دشوار نہ تھا۔ اس لحاظ سے مجھے جلد از جلد اس مقام سے بھی دور ہو جانا چاہیے تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ مجھے برا مدے میں آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہی لڑکی میری طرف آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جسے اس نے کیلے کے پتے کے ساتھ ڈھانپ رکھا تھا۔ میں اسے آتے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میرے قریب آ کر پلیٹ میری طرف بڑھائی اور آہستگی سے بولی۔

”اس میں کچھ چاول ہیں، کھالینا۔“

میں نے احساس تشکر سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پلیٹ پکڑ لی۔ وہ واپس جانے کے لئے پلیٹ تو میں نے کہا۔ ”تھوڑا سا پانی مل سکے گا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں کانسی کا ایک کٹورا تھا۔ میں نے کٹورے سے تھوڑا سا پانی پیا اور ممنونیت سے کہا۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے میرے لئے بارش میں بھیگنا قبول کیا اور میرے لئے کھانا لائیں۔“

”نہیں نہیں، کوئی بات نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور جس طرح آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی۔

میں نے چاول کھائے۔ خاصے مزیدار تھے۔ یا ممکن ہے بھوکا ہونے کی وجہ سے مجھے مزیدار لگے ہوں۔ پیٹ بھرا ہوا ہو تو انسان کو من و سلویٰ میں بھی لذت محسوس نہیں ہوتی لیکن پیٹ خالی ہو تو سوکھی روٹی بھی نعمت غیر مترقبہ محسوس ہوتی ہے۔ کھانے سے فراغت کے بعد میں دوبارہ لیٹ گیا۔ نیند کی پری روٹھی ہوئی تھی۔ میں اسے منانے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر وہ مان ہی گئی اور مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

اگلے روز میں چاہتے ہوئے بھی ریسٹ ہاؤس چھوڑ نہ سکا۔ بارش میں بھگینے کی وجہ سے رات مجھے تیز بخار ہو گیا تھا۔ صبح اٹھا تو چکر آنے لگے۔ چوکیدار کی بیٹی صبح مجھے جگانے آئی تو میری سرخ آنکھیں اور دکھتا ہوا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت وہ میرے قریب فرش پر بیٹھ گئی اور ہمدردانہ انداز میں پوچھنے لگی کہ مجھے کیا ہوا ہے؟ جب میں نے اسے بخار اور سر درد کا بتایا تو اس نے بے اختیار میرے ماتھے کو چھوا اور گہری فکر مندی سے بولی۔

”اوہ تمہیں تو بہت تیز بخار ہے!“

”ہاں۔ لیکن کوئی بات نہیں، میں تھوڑی دیر تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ میں نے نقاہت سے کہا۔

”نہیں..... میں تمہیں اس حال میں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ ہم غریب ضرور ہیں مگر سنگدل نہیں۔

ٹھہرو میں تمہارے لئے دودھ اور بخار کی دوائی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے وہیں چھوڑا اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کوارٹر کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس اور دوسرے ہاتھ میں دو نوں چیزیں میرے سامنے رکھیں اور بولی۔ ”لو یہ کھا لو۔ اس کے بعد تمہیں بخار کی گولی دوں گی۔ قریب ہی فارمیٹ والوں کی کالونی ہے۔ اس کے شفا خانے کے کمپائونڈر سے بابا کے لئے لائی گئی۔ بڑی اچھی دوائی ہے، منٹوں میں بخار اتار دیتی ہے۔“

”میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔“ میں نے احسان مندی سے کہا۔

”شکریہ کی کیا بات ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“

”تم بہت اچھی لڑکی ہو۔“ میں نے اس کی تعریف کی۔ اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ میں نے

دودھ رس کھا لئے تو اس نے مجھے بخار کی گولی دی جو میں نے بچے کچے دودھ کی مدد سے نگل لی۔ اس نے گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور بولی۔

”میں تمہارے لئے یہ چھوٹا کمر اکھول رہی ہوں۔ جب تک تمہارا بخار نہیں اترتا تم اس میں آرام کر لو.....“

میں نے بے یقینی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میری نگاہوں کا مفہوم پا کر وہ یاسیت سے بولی۔

”یقین کرو میرا یا میرے بابا کا دل اتنا سخت نہیں کہ کسی مصیبت زدہ مدد نہ کریں، لیکن کیا کریں یہ صاحب لوگ بڑے سخت ہوتے ہیں، ان سے ڈر لگتا ہے۔ تمہیں کیا پتہ مجھے اب کتنی ندامت ہو رہی ہے کہ رات تمہیں بھگے بدن اور بھگے لباس میں یہاں برآمدے میں سلا دیا۔ اسی وجہ سے تمہیں بخار ہوا ہے.....!“



تکلیف ہوگی۔“

”کوئی تکلیف نہیں ہوگی، اللہ مالک ہے۔“ اس نے متمتاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”جو آدمی دوسرے کی مدد کرتا ہے اللہ اسے کبھی رسوا نہیں کرتا۔ میرا اس بات پر پختہ یقین ہے۔“

”میں تمہارا بہت احسان مند ہوں۔“ میں نے تشکر بھرے لہجے میں کہا۔ میری حالت اس وقت ایک مجبور اور گرے پڑے انسان کی سی ہے، مگر حقیقتاً میں ایک امیر کبیر گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ بس سمجھو گردش حالات نے مجھے اس حال پر پہنچا دیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میری آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ وہ میری باتوں سے متاثر نظر آنے لگی۔ بظاہر تیز مگر باطن معصوم اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس نے میری دل جوئی شروع کر دی۔ پھر اس نے چھوٹا سا سا بیڈ روم کھول دیا۔ وہ چھ سات فٹ چوڑا اور آٹھ نو فٹ لمبا کمرہ تھا۔ اس کے اندر ایک پرانا پلنگ، بچھا ہوا تھا جس پر پچھٹے پرانے پردے، اخبارات اور گتے کے ڈبے ایک ڈھیر کی صورت پڑے تھے۔ گرد آلود فرش پر کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ ایک کونے میں سوڈے کی خالی بوتلوں کے کئی کریٹ رکھے ہوئے تھے۔ مجھے شراب کی بھی کئی خالی بوتلیں وہاں پڑی نظر آئیں جو یقیناً فاریسٹ افسران کی تفریح طبع کے لئے استعمال ہوئی ہوں گی۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایک ٹوٹی ہوئی میز اور بید کی دو کرسیاں بھی تھیں۔

”تم باہر ٹھہرو میں پہلے یہ کمرہ صاف کر لوں۔“ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے تعمیل کی اس نے کمرہ صاف کرنے میں دس منٹ لگائے۔ جب میں اس کے بلانے پر دوبارہ کمرے میں گیا تو وہ بالکل صاف ہو چکا تھا۔ فالتو اشیاء کو اس نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ پلنگ پر اب ایک پرانی مگر صاف چادر بچھی ہوئی تھی اور ایک عدد تکیہ بھی موجود تھا۔ میں اس کے اشارے پر چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے کمرے کی اکلوتی کھڑکی کھول دی جس سے تازہ ہوا اندر آنے لگی۔

”تم آرام کرو۔ اب میں چلتی ہوں۔ بابا فکر مند ہو رہے ہوں گے کہ میں کہاں چلی گئی؟“ یہ کہہ کر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ جاتے ہوئے وہ دروازے کو باہر سے مقفل کرنا نہیں بھولی۔

☆.....☆.....☆

میں دودن اور دو راتیں بخار میں پھنکتا رہا۔ اس دوران اس لڑکی نے کسی ہمدرد نرس کی طرح میری تیمارداری کی۔ اس کا ایک پاؤں میرے پاس ہوتا تو دوسرا اس کے بیمار بابا کے پاس۔ وہ اس کیلئے جو دوائیں فاریسٹ کا لونی کے شفا خانے سے لاتی، مجھے بھی دے دیتی۔ میں کسی فرمان بردار بچے کی طرح دوا لے لیتا۔ وہ کھانا کھلاتی تو میں کھا لیتا، سونے کو کہتی تو سو جاتا۔ وہ تھی ہی اتنی اچھی۔ خواہواہ اس کی

اس کا نام سلمیٰ تھا۔ وہ بے حد دکھی لڑکی تھی۔ اس کا گھرانہ دس بارہ برس پہلے بھارت کے صوبہ بہار میں مقیم تھا۔ وہاں اس کے بابا کی جوتوں کی دکان تھی۔ آمدنی زیادہ نہ تھی لیکن عزت سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ تقسیم ہند کا عمل شروع ہو گیا اور یہ علاقہ ہندو مسلم فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ دوسرے متاثرہ بہاری خاندانوں کی طرح وہ لوگ بھی مشرقی پاکستان کی طرف ہجرت کر آئے۔ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے بابا کو یہاں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈھاکہ میں انہیں ایک کمپ میں رہنا پڑا، جہاں ہر طرف مفلسی، بیماری اور گندگی کا راج تھا۔ ایک دفعہ کمپ میں سیڑھی کی وبا پھوٹ پڑی۔ سینکڑوں مرد عورتیں اور بچے اس وبا کی لپیٹ میں آ کر لقمہ اجل بن گئے۔ مرنے والوں میں اس کی ماں، دو بڑے بھائی اور دادی اماں بھی تھیں۔ وہ اپنے بابا کے ساتھ اس دنیا کے دکھ سہنے کے لئے زندہ بچ گئی۔ اس وقت اس کی عمر بمشکل آٹھ سال تھی۔ اس کے بابا نے بیٹی کو سینے سے لگایا اور اس جنگل کا رخ کیا۔ یہاں ریسٹ ہاؤس میں انہیں چوکیدار کی نوکری مل گئی۔ اس وقت سے وہ اس جنگل میں اپنے بابا کے ساتھ تنہا رہ رہی تھی۔ اس کے بابا نے اس کی پرورش اور کھانا پکانے کی خاطر ایک بیوہ عورت سے شادی کی تھی، مگر یہ شادی دو تین ماہ سے زیادہ نہ چلی۔ وہ عورت روایتی سوتیلی ماں تھی۔ وہ ہر وقت سلمیٰ کو جھڑکتی اور پیٹتی رہتی تھی۔ ایک روز بابا نے اسے سلمیٰ کو مارتے دیکھ لیا۔ انہوں نے چھڑی اٹھائی اور مار مار کر اس کا بھر کس نکال دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اسے طلاق دے کر چلتا کیا اور پہلے کی طرح تنہا رہنے لگے۔ اب وہ خود ہی اس کی ماں تھے اور خود ہی باپ۔ وہ اس کے لئے اپنے ہاتھ سے کھانا بناتے اور خود ہی کپڑے، برتن بھی دھوتے۔ پھر جب وہ کچھ بڑی ہو گئی تو اپنے بابا کا ہاتھ بٹانے لگی۔ آہستہ آہستہ اس نے انہیں ان ذمہ داریوں سے بالکل آزاد کر دیا۔ اب وہ جوان ہو چکی تھی اور بوڑھے باپ کی خدمت اس کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ کچھ عرصہ سے بابا کی صحت جواب دے گئی تھی۔ وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے جس کی وجہ سے وہ ہمہ وقت پریشان رہتی تھی۔ ان کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی عزیز نہ رشتہ دار۔ انہیں اگر کچھ ہو جاتا تو وہ کہاں جاتی؟ انہیں اب اس کی شادی کی فکر لاحق تھی مگر غریب کی بیٹی کو جہیز کے بغیر کون بیاہنے آتا ہے؟ انہوں نے قریبی گاؤں کے ایک دو شناسا آدمیوں سے بات کی تھی، مگر دوسری شادی کے خواہش مند ادھیڑ عمر مردوں کے سوا اس کے لئے کوئی رشتہ نہ آیا تھا۔ انہوں نے یہ رشتے مسترد کر دیئے تھے۔ وہ جانتے بوجھتے اپنی جوان بیٹی کو جہنم میں کیسے جھونک سکتے تھے؟

میں نے اس لڑکی کی اداس اور دکھ بھری داستان سن کر اپنے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے گہرے جذبات محسوس کئے، مگر افسوس میں اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاس محض ہمدردی کے بول تھے۔ جنہیں اس کی نذر کرنے میں میں نے بخل سے کام نہیں لیا۔ میری دل جوئی سے وہ مجھے اپنا ہمدرد اور



خیر خواہ سمجھنے لگی اور ذہنی و قلبی طور پر میرے قریب آ گئی۔ میں نے اپنے متعلق جتنا ضروری سمجھا اسے بتا دیا۔ میں نے اسے اپنی اور نیلیم کی رام کہانی سنائی اور یہ بھی بتایا کہ کراچی میں اس کی خاطر ایک آدمی کو قتل کر ڈالا تھا۔ تاہم یہ ذکر میں نے گول کر دیا کہ وہ کوئی غیر انسانی مخلوق تھی اور چمکا ڈکڑ کا روپ دھار کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ میری بات پر کبھی یقین نہ کرتی۔ اسکی بجائے میں نے اسے یہ بتایا کہ نیلیم ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی اور زمانے کے ستم سہنے کے لئے میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

اس نے میری داستان الم سن کر میرے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔ اشاروں کنائوں میں اس نے مجھے یہ باور کرانے کی بھی کوشش کی تھی کہ نیلیم کی بے وقت موت سے میری زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا، وہ اسے پر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی.....

اگرچہ میرا بخار اتر گیا تھا مگر سلمیٰ نے بہانے بہانے سے مجھے تین چار روز مزید روکے رکھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ مجھے کبھی وہاں سے جانے نہ دیتی۔ میں نے اس کی نگاہوں میں اپنے لئے چاہت اور محبت کی چور بتیاں جلتی صاف محسوس کر لی تھیں، مگر وہ اس کا برملا اظہار کرنے سے شرمناک رہی تھی۔ کمال یہ تھا کہ اس نے ابھی تک اپنے بابا کو بھی اس بات کی بھنک نہیں پڑنے دی تھی کہ ریسٹ ہاؤس میں کوئی اجنبی نوجوان مقیم ہے۔ وہ عموماً اس وقت میرے پاس آتی جب اس کا باپ سو رہا ہوتا۔ خوش قسمتی سے اس دوران محکمہ جنگلات کا کوئی اہلکار یا افسر بھی اس طرف نہیں آیا تھا۔ پولیس کی وہاں آمد کا مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا، مگر قسمت مہربان تھی، اس لئے وہاں کسی چڑیا تک نے پر نہ مارا۔

آخر ایک روز میں نے اس مقام سے روانہ ہونے کا ارادہ باندھ لیا۔ سلمیٰ کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ ریسٹ ہاؤس سے مغرب کی جانب، دو میل کے فاصلے پر، ایک بڑی سڑک ہے جو علاقے کے ایک بڑے قصبے ”پننا“ کی طرف جاتی ہے۔ وہاں سے بنگلہ بھارت سرحد زیادہ دور نہیں۔ میں نے منصوبہ بنایا کہ ”پننا“ سے سرحد کی طرف نکل جاؤں گا اور کسی نہ کسی طرح انڈیا میں داخل ہو جاؤں گا۔ اپنی جان بچانے کا ایک ہی راستہ مجھے نظر آیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح بمبئی چلا جاؤں۔ وہاں ہمارے کئی رشتہ دار رہتے تھے۔ میں وہاں عارضی قیام کر سکتا تھا اور اپنے گھر والوں سے رابطے کی بھی کوئی نہ کوئی صورت نکل سکتی تھی۔ مجھے اب احساس ہو رہا تھا کہ یوں میرے چپ چاپ گھر چھوڑ آنے سے سب گھر والوں خصوصاً امی اور نوشین کی حالت بہت خراب ہو گئی ہوگی۔ انہیں اپنے زندہ سلامت اور خیریت سے ہونے کی اطلاع دینی ضروری تھی.....

آخر ایک شب جب سلمیٰ بابا کو سلائے کے بعد، مجھے کمرے میں کھانا دینے آئی تو میں نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

میری بات سن کر سالن کی رکابی اس کے ہاتھ سے نیچے گر گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اسے تھے

جیسے جانے کی بات کر کے میں نے اس کے بدن سے سارا لہو کشید کر لیا ہو۔ اس نے صدمے کی کیفیت میں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور آنسو بھری نگاہوں سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر زبان نے اس کے ذہن کا ساتھ نہیں دیا۔ بس وہ بگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے بے اختیار اسے اپنے سینے میں بھر لیا اور طفل تسلیاں دینے لگا۔ وہ جو کہنا چاہتی تھی، میں خوب اچھی طرح جان چکا تھا۔ میرے پاس اُسے دلا سہ دینے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ مجھ سے چمٹ کر بچوں کی طرح رونے لگی اور بار بار ایک ہی فقرہ دہرانے لگی۔

”نہیں بوبی، میں نے تمہیں یہاں سے کہیں نہیں جانے دینا۔ یہاں سے ہرگز نہیں جانے دینا!“

ہرگز رتے لمحے کے ساتھ اس کا جنون بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں اس کی جذباتی کیفیت دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ وہ اب بار بار مجھے چوم رہی تھی اور بری طرح میرے ساتھ لپٹ رہی تھی۔ اس نے اس لمحے کھل کر مجھ سے اظہار محبت بھی کر ڈالا۔

اس کی بے کلی اور بے چینی سے متاثر ہو کر میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ اس کے جواں جسم کے لمس سے میرے وجود میں سوئے ہوئے وحشی جذبات کے اژدھے بے قابو سے ہونے لگے تھے۔ وہ جوانی کے منہ زور جذبات سے بھرپور ایک نوجوان لڑکی تھی۔ ادھر میرا جو حال تھا، اس کے بارے میں میں پہلے ہی آپ کو بہت کچھ بتا چکا ہوں۔ دو جوان جسم جب اس قدر قریب آئے تو نفسانی خواہشات کے گھن چکر نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ طوفان تھا تو میں چند ہی لمحوں میں اپنی اصلی ذہنی کیفیت میں واپس لوٹ آیا، لیکن سلمیٰ کے لئے چونکہ یہ ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا، اس لئے وہ ہنوز اس عمل کے کیف آگیاں اثرات سے باہر نہ نکلی تھی اور میری بانہوں میں آنکھیں موندھے بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے پیار سے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور اس سے الگ ہو گیا۔ میز پر لائٹیں پڑی تھیں میں نے اس کی لو اونچی کی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی سانسیں استوار کرنے لگا۔ سلمیٰ ابھی تک مدہوش پڑی تھی شاید اسے نیند آ گئی تھی۔ جب کافی دیر گزر گئی تو میں نے اسے جگانے کا ارادہ کیا آگے بڑھ کر میں نے اسے آواز دی اور جگانے کے لئے بازو ہلایا تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ سلمیٰ کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی اور باجھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ بدن اس طرح نیلا پڑ چکا تھا، جیسے اسے کسی زہریلی شے نے ڈس لیا ہو..... سلمیٰ مر چکی تھی! میں سکتے میں آ گیا۔





میں پھٹی پھٹی نظروں سے سلمیٰ کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ اسے کسی زہریلے بچھو یا سانپ نے ڈس لیا ہے۔ وہ ریسٹ ہاؤس ایک گھنے جنگل میں واقع تھا، جہاں زہریلے حشرات الارض کا وجود کوئی اچھنبے کی بات نہ تھی مگر جلد ہی میرے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑنے لگا کہ اس کی موت کی وجہ کچھ اور ہے۔ میرے وجود میں چپون کے وصل نے ایک عجیب ساز ہر اتارا تھا۔ میرا خون اس قدر زہریلا ہو گیا تھا کہ اگر کوئی زہریلی شے مجھے ڈس لیتی تو وہ بھی میرے خون میں موجود زہر کے اثر سے موت کے گھاٹ اتر جاتی تھی۔ چٹا گانگ میں اپنے گھر کے لان کی باڑ کاٹتے ہوئے میں نے اس حقیقت کا خود مشاہدہ کیا تھا۔ باڑ میں موجود شہد کے چھتے سے بیسیوں مکھیوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور مجھے کاٹتے ہی پراسرار انداز میں ہلاک ہو گئی تھیں۔ سلمیٰ کی موت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

اپنے ہاتھوں ایک جیتی جاگتی لڑکی کی اس بھیانک انداز میں موت نے مجھے انتہائی خوف زدہ کر دیا تھا۔ میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ فی الفور اس مقام سے فرار ہو جاؤں۔ سلمیٰ نے مجھے بتایا تھا کہ ایک دو روز سے اس کا باپ اس کی پراسرار نقل و حرکت کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ اسے شک ہونے لگا تھا کہ وال میں کچھ کالا ہے۔ اگر یہ بات درست تھی تو اس کا بوڑھا باپ بیٹی کے تعاقب میں اس کمرے تک پہنچ سکتا تھا۔ میں نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے سلمیٰ کی برہنہ لاش کو ایک چادر سے ڈھانپا، لائین گل کی اور نہایت خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے اس معصوم اور ہمدردی لڑکی کی موت کا بے حد ملال تھا۔ مگر اس میں میرا کوئی دوش نہ تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے ہلاک نہیں کیا تھا۔

باہر ہو کا عالم طاری تھا۔ تاریکی نے تمام علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں نے بیرونی گیٹ کی کنڈی کھولی اور کچی سڑک پر آ گیا۔ اس کے بعد میں نے نہایت تیزی سے مغرب کی سمت بڑھنا شروع کر دیا۔

جیسا کہ سلمیٰ نے بتایا تھا، دو میل کے فاصلے پر ایک بڑی سڑک موجود تھی۔ میں اس کے کنارے ایک

سنگ میل پر بیٹھ گیا اور کسی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ سنگ میل کے مطابق ”پنا“ وہاں سے پچاس میل دور تھا۔ میں نے کافی دیر انتظار کیا۔ مگر اس سڑک سے کسی گاڑی کا گزرنہ ہوا۔ مجھے وہاں بیٹھنے سے وحشت سی ہو رہی تھی۔ ذہن پر ابھی تک سلمیٰ کی موت کا خوف چھایا ہوا تھا۔ دل بار بار دھڑک اٹھتا تھا کہ کوئی میرا پیچھا کرتا ہو وہاں تک نہ آ پہنچے۔ اسی خوف نے مجھے اس بات پر اکسایا کہ میں پیدل ہی ”پنا“ کی طرف سفر شروع کر دوں۔ میں نے پیدل کوئی دو میل کا فاصلہ طے کیا۔ اس دوران عقب سے مجھے ایک ٹرک آتا دکھائی دیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کو کہا مگر ڈرائیور نے لفٹ نہیں دی۔ ٹرک میرے پاس سے تیزی سے گزر گیا۔ میں بہت بد دل ہوا مگر کیا ہو سکتا تھا۔ دو میل مزید پیدل چلا تو دور سے ایک اور ٹرک آتا دکھائی دیا۔ اس بار میں نے تہیہ کیا کہ کچھ بھی ہو اس ٹرک پر ضرور سوار ہوں گا۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں ایک جگہ سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے وہاں دو تین پتھر پھینک دیئے اور سڑک کے کنارے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ جونہی ٹرک نے اس جگہ اپنی رفتار کم کی میں دوڑ کر ٹرک کے پچھلے حصے کے ساتھ لٹک گیا اور جیسے تیسے اوپر چڑھ گیا۔ ٹرک ڈرائیور اس کے کلیز کو مطلق خبر نہ ہوئی تھی۔ میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور آرام سے ٹرک پر لدی بور یوں پر بیٹھ گیا۔

ٹرک ”پنا“ کی طرف رواں دواں تھا۔ اس کی رفتار معتدل تھی۔ نہ زیادہ تیز نہ اتنی سست۔ میں نے حساب لگایا کہ وہ اس رفتار سے دو گھنٹے میں ”پنا“ پہنچ جائے گا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ”پنا“ سے کہیں آگے جا رہا ہو۔ بہر حال میرے پاس کم از کم دو گھنٹے تو تھے۔ اتنی دیر میں آرام سے ان بور یوں پر سو سکتا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر پاؤں پسار لئے اور آنکھیں موند لیں۔



کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھلی۔ ٹرک کسی نامعلوم مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسی لمحے مجھے بہت عجیب سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔

”گیتا جی مت پوچھئے اس بار مال سرحد پار لانے میں کس قدر کٹھنائی کا سامنا کرنا پڑا۔ بی ایس ایف (بارڈر سیکورٹی فورس) والوں نے بھتے کاریٹ پہلے سے دو گنا کر دیا ہے۔ اگلی بار روکڑا جیادہ دینا پڑے گا۔ اس بار اپنے پاس سے پانچ سو روپے دے کر آیا ہوں۔“

”اچھا اچھا مل جائیں گے تمہیں تمہارے پانچ سو۔ بی ایس ایف والوں کا تو مال نہیں، تمہارا اپنا ریٹ اب کچھ بڑھتا ہوا دکھائی پڑتا ہے۔“

”ارے نہیں گیتا جی، ہم تو آپ کے پرانے سیوک ہیں۔ آپ ہی کا دیا کھاتے ہیں۔ آپ سے

دھوکہ کیوں کریں گے؟ اصل میں کرشنا گانی چیک پوسٹ پر ایک نیا انسپکٹر آ گیا ہے۔ بڑا ہی..... ہے!“

”اچھا مال کا بولو، مال تو پورا ہے نا؟ چھوٹے ابراہیم نے بولا تھا کہ اس بار فیون کی پانچ اور چرس کی



میں بوریاں ہوں گی؟

”ہاں اتنی ہی ہیں۔ کیا ابھی اتارنی ہیں؟“

”نہیں، کوئی جلدی نہیں، صبح دیکھ لیں گے۔“

اس کے بعد دونوں کے دور جانے کی آوازیں آئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ایسا معجزہ بھی رونما ہو سکتا ہے۔ میں جس ٹرک پر انجانے میں سوار ہوا تھا وہ اسمگلروں کی ملکیت ہوگا، یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ میں سوتے ہی میں خود بخود دوسرے پار پہنچ جاؤں گا، یہ تو میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ میں احساس تشکر سے آبدیدہ ہو کر وہیں بوریوں پر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ اب بظاہر میں ہر خطرے سے آزاد ہو گیا تھا!

میں نے سر اٹھا کر آسمان پر نگاہ ڈالی۔ صبح کاذب کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ کہیں دور سے مرغ کی اذان کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ یہ اس امر کی طرف واضح اشارہ تھا کہ قریب ہی کوئی آبادی ہے۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ارد گرد نگاہ ڈالی۔ ٹرک ایک حویلی کے اندر ٹھہرا ہوا تھا۔ حویلی کی دیوار نو دس فٹ بلند ہوگی۔ اسے پار کرنا بظاہر دشوار ہی تھا، اس لئے میں نے نیچے اتر کر دروازے کی تلاش شروع کی۔ ہر سو اندھیرا تھا اور گہرا سکوت۔ مجھے اندیشہ تھا کہ مجھے دیکھا جاسکتا ہے اور میں کسی نئی مصیبت سے دوچار ہو سکتا ہوں اس لئے میں بے حد محتاط تھا اور آڑ لے کر اور ادھر ادھر دیکھ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ کوئی سو گز چلنے کے بعد مجھے ایک دروازہ نظر آیا۔ اس کی دوسری جانب ایک مدہم سا بلبل جل رہا تھا جس کی روشنی اندھیرے کا سینہ چاک کرنے میں بری طرح ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے میں موجود جھری سے جھانک کر دوسری طرف دیکھا تو ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا، جس کے دو کمرے تھے اور سامنے برآمدہ بھی تھا۔ برآمدے میں چار پائی بچھی ہوئی تھی جس پر ایک آدمی کروٹ بدلے سو رہا تھا۔ میں فوراً وہاں سے ہٹ گیا اور دیوار کے ساتھ مخالف سمت چلنے لگا۔ مجھے اس گیٹ کی تلاش تھی، جہاں سے ٹرک اندر آیا ہوگا۔ آخر مجھے مطلوبہ گیٹ مل گیا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ اس کے اوپر ایک بڑا تالا پڑا ہوا تھا۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں بے چینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک میری نگاہ ایک بانس پر پڑی جو دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں کالج میں اسٹیلکس میں حصہ لیتا رہا تھا اور پول واٹ میرا پسندیدہ ایونٹ (Event) تھا۔ میں نے پول واٹ سٹیک کو استعمال کرتے ہوئے دیوار پھانڈنے کا فیصلہ کیا۔ بانس اٹھا کر میں دس بارہ قدم پیچھے ہٹا اور پھر پوری قوت سے دوڑتے ہوئے زقند بھری۔ چشم زدن میں میں دیوار کے اس پار تھا۔

میں جہاں گرا وہاں کھیت تھا۔ زمین میں تازہ ہل چلایا گیا تھا جس کی وجہ سے مجھے کوئی چوٹ نہیں لگی لیکن ایک اور مصیبت میری منتظر تھی۔ جونہی میں گرا، جانے کہاں سے تین چار خونخوار کتے نمودار ہوئے اور

نہایت خوفناک آواز میں بھونکتے ہوئے میری طرف لپکے۔ ان سے بچنے کے لئے میں نے سر پٹ دوڑ لگا دی۔ کتے بھی میرے پیچھے بھاگے۔ ان کے بھونکنے کی آواز سن کر قریبی آبادی سے بھی کئی کتے وحشیانہ انداز میں بھونکنے لگے۔ میرا دل خوف و دہشت سے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس رات میں جس رفتار سے بھاگا، اگر ایسی کارکردگی میں نے کبھی اسٹیلکس مقابلوں میں دکھائی ہوتی تو پانچ سو میٹر کی دوڑ میں اول انعام حاصل کرتا۔ بہر حال کتے کچھ دیر میرا پیچھا کرنے کے بعد واپس لوٹ گئے، مگر ان کے بھونکنے کی آوازیں مسلسل آتی رہیں۔

جب مجھے محسوس ہوا کہ خطرہ ٹل گیا ہے تو میں نے ایک جگہ ٹھہر کر اپنی سانسیں استوار کیں۔ یہ ایک ٹوٹا ہوا متروک اور پرانا مندر تھا جس کے کھنڈر کے قریب میں رکھا تھا۔ جب میں اس کی اوٹ سے نکلا تو کیا دیکھا کہ ایک ریلوے لائن وہاں سے گزر رہی ہے۔ ایک طرف درختوں کے عقب سے بہت زیادہ لائٹ جھلک رہی تھی۔ پھر انجن کی وسل سنائی دی تو مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی ٹرین آ رہی ہے۔ میں لائن کے ایک طرف قدرے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں ریلوے اسٹیشن تو تھا نہیں کہ ٹرین رکتی۔ اگر ریلوے اسٹیشن ہوتا اور ٹرین ٹھہرتی تو میں ضرور اس پر سوار ہو جاتا۔ ٹرین جہاں بھی جا رہی ہوتی مجھے کسی شہر تو لے جاتی۔

میں وہاں کھڑا ہو کر ٹرین گزرنے کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ ایک بالکل غیر متوقع بات ہوئی۔ ٹرین کے بریک بے ہنگم آواز میں چرچرائے اور اس کی رفتار آہستہ ہونے لگی اور پھر میں نے ٹرین کو اس ویرانے میں ٹھہرتے دیکھا۔ کسی نے ویکووم لگا کر گاڑی کو وہاں دانستہ ٹھہرایا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں ٹھٹھکا لیکن پھر بھاگ کر ٹرین کی طرف بڑھا اور جو پہلا ڈبہ نظر آیا اس پر چڑھ گیا۔ یہ ہوڑا ایک سپر سٹیشن تھی جو مرشد آباد سے کلکتہ جا رہی تھی۔ اندر داخل ہوا تو احساس ہوا کہ فرسٹ کلاس سیلپر میں سوار ہو گیا ہوں۔ اس کے ایک طرف لمبی راہداری تھی جس میں مختلف کمپارٹمنٹس کے دروازے کھلتے تھے۔ میں پہلے کمپارٹمنٹ کے دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا اور صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ عین اسی وقت مجھے تڑتڑ گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ یہ آواز اسی کمپارٹمنٹ سے آئی تھی جس کے قریب میں کھڑا تھا۔ میں اپنی جگہ اچھل پڑا۔ ابھی میں صورت حال کو سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت سی لڑکی بدحواسی کے عالم میں چیختی ہوئی باہر نکلی۔ اس کے عقب میں دو نقاب پوش نوجوان تھے جن کے ہاتھوں میں پستول دبے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کمپارٹمنٹ کے اندر ایک مسافر کو ڈھیر کر چکے تھے اور اب اس لڑکی کو مارنے ہی والے تھے۔ میں نے انہیں اس اقدام سے باز رکھنے کے لئے لپک کر ایک آدمی کو دوسرے پر زوردار دھکا دیا۔ دونوں بدحواسی کے عالم میں راہداری کی دیوار سے ٹکرائے اور ایک دوسرے کے اوپر فرش پر جا گرے۔ اس دوران نیچے والے نوجوان کے پستول نے شعلہ اگلا اور اوپر والے کے بازو میں سوراخ ہو گیا۔ میں اسی اثنا میں اوپر والے نوجوان کے سر پر پہنچ گیا تھا اور اسے



دبوج لیا تھا۔ دوسرے نے جب دیکھا کہ میں اس کے ساتھی کو پکڑ چکا ہوں تو وہ نکل بھاگا۔ غالباً اس کا پستول خالی ہو گیا تھا ورنہ وہ مجھے ہرگز نہ چھوڑتا۔ جس نو جوان کو میں نے دبوج رکھا تھا وہ اگرچہ زخمی ہو گیا تھا مگر بری طرح مزاحمت کر رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا ساتھی ٹرین سے نیچے کود گیا ہے۔ اس لئے وہ نکل بھاگنے کے لئے جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کے برعکس میری کوشش یہ تھی کہ میں اس کے ہاتھ سے کسی طرح پستول چھین لوں۔ ہم دونوں اب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی کشمکش میں ایک بار پھر گولی چلی اور ٹرین کی چھت میں جا لگی۔ بھر چھینا جھپٹی میں پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ پستول گرتے دیکھ کر لامحالہ میری توجہ پستول کی جانب مبذول ہونی چاہیے تھی۔ میں نے اسے پکڑے پکڑے جھک کر پستول اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے یکدم میرے پیٹ میں کہنی ماری اور مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میں فرش پر جا گرا۔ اگرچہ پستول میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ مگر نو جوان میری گرفت سے آزاد ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ ٹرین سے چھلانگ لگا کر اندھیرے کا حصہ بن چکا تھا۔

میں فرش سے اٹھا۔ پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں اس نو جوان کے تعاقب کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ دفعتاً مجھے اپنے عقب میں ایک ساتھ کئی بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک انسپکٹر اور کئی پولیس والے نظر آئے جو میری طرف، راہداری میں بھاگے چلے آ رہے تھے۔ راہداری میں مجھے وہ خوبصورت لڑکی گری ہوئی نظر آئی۔ غالباً وہ واردات کی دہشت اور صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے انسپکٹر کو قریب آتے دیکھ کر ہجانی انداز میں چیخ کر کہا۔

”انسپکٹر جلدی کرو، قاتل ادھر سے نیچے اترے ہیں۔ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے!“

لیکن انسپکٹر نے میری بات سنی ان سنی کردی اور مجھ پر پستول تانتے ہوئے چلا کر کہا۔

”ہتھیاریں نیچے پھینک دو ورنہ گولی مار دوں گا.....!“

میں حیرت سے انسپکٹر کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ مجھی کو مجرم سمجھ رہا ہے۔ اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر میں نے پستول فرش پر پھینک دیا اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا تھا کہ ہجانی کیفیت میں کہیں وہ مجھ پر فائر ہی نہ کر دے۔ مجھے ہتھیار پھینکتے دیکھ کر وہ پھرتی سے پلٹا اور ایک لمبے تڑنگے کانشیبل سے مخاطب ہو کر سخت آواز میں بولا۔

”نا تھورام، گرفتار کر لو بھڑوے کو..... بھاگنے نہ پائے.....“

”میں کس لئے بھاگوں گا انسپکٹر صاحب!“ میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہی۔ ”بھاگتا وہ ہے جس نے کوئی جرم کیا ہو۔ میں تو..... میں تو قاتلوں کو پکڑ رہا تھا، جو بھاگ گئے ہیں..... میں نے یہ پستول انہی سے چھینا ہے۔ آپ انہیں پکڑیں۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے.....“ میں بولتا چلا گیا مگر ان میں سے کسی نے میرے واویلے پر کان نہیں دھرے۔ پولیس والوں نے مجھے دبوج کر تھکڑیوں میں جکڑ دیا۔

میں نے انسپکٹر کو جھک کر اس نو جوان لڑکی کی نبضیں ٹٹولتے دیکھا۔ پھر وہ اندر کی طرف لپکا۔ اسی اثناء میں ارد گرد کے کمپارٹمنٹوں کے مسافر بھی باہر نکل آئے۔ راہداری میں شور مچ گیا۔ پولیس والے چیخ چیخ کر لوگوں کو پیچھے ہٹنے کو کہہ رہے تھے۔ مجھے وہ گھسیٹتے ہوئے کمپارٹمنٹ کے اندر لے گئے۔ پھر وہ اس لڑکی کو بھی اٹھا کر اندر لے آئے جو راہداری میں بے ہوش پڑی تھی۔ انسپکٹر مقتول مسافر کی لاش پر جھکا ہوا تھا۔ اسے اس میں زندگی کی کوئی رمت نظر آئی ہوگی کہ اس نے چلا کر کہا۔

”گارڈ کنڈیکٹر کو بولو، گاڑی چلائے۔ ہمیں فوراً کرشنا نگر پہنچنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے، یہ بچ جائے۔“

اس کی بات سن کر ایک کانشیبل باہر کی طرف لپکا، لیکن جلد ہی واپس آ گیا۔ گارڈ کنڈیکٹر خود وہاں پہنچ گیا تھا۔ انسپکٹر نے جلدی جلدی اسے صورت حال سے آگاہ کیا اور اپنی بات دہرائی۔ گارڈ کنڈیکٹر اثبات میں سر ہلا کر فوراً ہی واپس پلٹ گیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ مجرم فرار ہو گئے تھے اور پولیس ان کا تعاقب کرنے کی بجائے مجھ بے گناہ کو تھکڑی پہنا کر مطمئن ہو گئی تھی۔ حالانکہ اگر ان کا پیچھا کیا جاتا تو انہیں پکڑنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آتی۔ اب وہ ایک ایسے شخص کو بچانے کی فکر کر رہے تھے جو میری رائے میں بمشکل دو گھڑی کا مہمان تھا۔

گارڈ کنڈیکٹر نے سیٹی بجادی تھی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے روانہ ہو گئی اور چند لمحوں میں ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ باہر اب آہستہ آہستہ صبح کا اُجالا پھیل رہا تھا، مگر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندیشہ ہائے دور دراز نے میرے دماغ میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ کیا کوئی نئی مصیبت میری منتظر تھی، کیا یہ سب چمپوں کی دھمکیوں کا شاخسانہ تھا؟

گاڑی چلی تو گارڈ کنڈیکٹر بھی اسی کمپارٹمنٹ میں آ گیا۔ وہ انسپکٹر کے ساتھ مل کر مقتول کے منہ میں پانی ڈالنے کی سعی لا حاصل میں مشغول تھا۔ اس کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ مقتول کلکتہ کی انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالت کا جج، جسٹس چوہدری تھا اور وہ خوب روڑ کی اس کی بیٹی پوجا تھی۔ یہ معلومات بکنگ چارٹ پر درج ہوں گی۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ انسپکٹر بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ کانشیبل اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے کسی طرح کی بھی مزاحمت نہیں کی تھی، جس کی وجہ سے وہ مجھ سے مطمئن بیٹھے تھے، لیکن میں ذرا پہلو بدلتا تو وہ چونک پڑتے اور ان کے ہتھیاروں پر ان کی گرفت مضبوط ہو جاتی۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ انسپکٹر کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کروں، مگر وہ کچھ سننے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ آخر یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ جسٹس صاحب کی بیٹی ہوش میں آئے گی تو انہیں ساری حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ گاڑی کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔ باہر آبادی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔



معلوم ہوتا تھا کوئی اسٹیشن آ رہا ہے۔ پھر جلد ہی گاڑی دندنائی ہوئی ایک درمیانے درجے کے اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ یہ کرشنا نگر کاریلوے اسٹیشن تھا۔ گاڑی رکی تو انسپکٹر نے کانسٹیبل کو کمپارٹمنٹ اندر سے بند کرنے کی ہدایت کی اور میری کڑی نگرانی کا حکم دے کر خود باہر نکل گیا۔ باہر مسافروں کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اسٹیشن آنے پر ایک کانسٹیبل نے کھڑکیوں کے شٹر گرا دیے تھے۔ کئی مسافروں نے شٹر پہ ہاتھ مارا، دروازے پر دستک دی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ میری نظریں اس نوجوان لڑکی کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ بیس اکیس برس کی ایک حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ رنگ صاف تھا، نین نقش تیکھے اور زلفیں دراز۔ اس نے نیلے رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ جیسا کہ نام سے بھی ظاہر تھا اور حلیے سے بھی، وہ ایک ہندو لڑکی تھی۔ اس کا باپ پچاس پچپن کے پیٹے میں ہوگا۔ وہ ایک بھاری بھر کم اور بارعب شخص تھا۔ اس نے سفید کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا، جواب خون میں تر ہو گیا تھا۔ قاتلوں نے اسے کئی گولیاں ماری تھیں۔ اس کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا۔

مزید دس منٹ گزرے ہوں گے کہ دروازے پر مخصوص دستک ہوئی۔ ایک کانسٹیبل نے اٹھ کر دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ باہر انسپکٹر تھا۔ اس کے پیچھے گارڈ کنڈیکٹر تھا اور ایک سمارٹ سا آدمی۔ اس کے ہاتھ میں اسٹیتھسکوپ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ سب ایک ساتھ اندر آئے۔ ڈاکٹر نے سب سے پہلے لپک کر جسٹس چوہدری کو دیکھا۔ سینے پر جگہ جگہ اسٹیتھسکوپ لگا کر دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی اور مایوسی سے سر ہلا دیا۔ پھر وہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے گال تھپتھپانے لگا۔ اس نے اسے ہوش میں لانے کے لئے کئی جتن کئے۔ مگر کوشش کے باوجود اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

کرشنا نگر پہ اسٹاپ اتنی دیر کا نہیں بنتا تھا۔ جب وہ لڑکی ہوش میں نہ آئی تو ڈاکٹر انسپکٹر اور گارڈ کنڈیکٹر سے مشورہ کرنے لگا۔ وہ کرشنا نگر کے ریلوے اسپتال کا ڈاکٹر منگل سین تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جسٹس چوہدری کے جسم میں زندگی کی کوئی رتق باقی ہوتی تو وہ اسے کرشنا نگر اسٹیشن پر اتار لیتا اور فوراً ریلوے اسپتال لے جاتا۔ اسپتال اسٹیشن سے چند قدم دور تھا اور وہ اس مقصد کے لئے اسٹرپچر بردار آدمی ساتھ لایا تھا۔ لیکن اب جب کہ جسٹس چوہدری کی موت واقع ہو چکی تھی، اس کی لاش کو کرشنا نگر اتارنا ایک بے کار بات تھی۔ بہتر یہی تھا کہ اس کی لاش کمپارٹمنٹ ہی میں رہے تاکہ پولیس کو تفتیش کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ رہا مسئلہ پوجا کو ہوش میں لانے کا، تو اس کے لئے اس کے میڈیکل بکس میں ادویات موجود تھیں۔ اسے اسپتال منتقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کام کے لئے وہ خود کلکتہ تک ٹرین میں سفر کرنے کو تیار تھا۔

گارڈ کنڈیکٹر اور انسپکٹر نے ڈاکٹر منگل سین کی رائے سے اتفاق کیا۔ ڈاکٹر نے گارڈ کنڈیکٹر سے استدعا کی کہ وہ کسی خالی کمپارٹمنٹ میں پوجا کے لئے برتھ مہیا کر دے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پوجا کے لئے اب اس کمپارٹمنٹ میں سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اگر ہوش میں آ بھی گئی تو باپ کی لاش کو دیکھ کر دوبارہ حواس کھو بیٹھے گی۔ گارڈ کنڈیکٹر نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آ کر بتایا کہ ساتھ والا کمپارٹمنٹ خالی ہونے والا ہے۔ اس میں صرف ایک بزرگ مسافر ہے۔ جو اگلے اسٹیشن پر اتر جائے گا۔ ڈاکٹر نے دروازے سے باہر جھانک کر کسی کو آواز دی۔ اگلے ہی لمحے دوا سٹرپچر بردار آدمی اندر آ گئے۔ ڈاکٹر نے پوجا کو اسٹرپچر پر منتقل کروایا اور اسے ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں لے گیا۔

گاڑی دوبارہ چلی تو انسپکٹر میری طرف متوجہ ہوا۔ اس کا لب و لہجہ بے حد درشت تھا۔ وہ مجھ سے الٹے سیدھے سوال کرنے لگا۔ میں نے نہایت تحمل اور اعتماد سے اس کے تمام سوالوں کے جواب دیئے، لیکن جب اس نے مجھ سے میرا نام اور پتہ پوچھا تو میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ میں نے اسے اپنا نام وجے بتایا اور کہا کہ میں ایک غریب ہندو نوجوان ہوں اور اپنی بوڑھی ماں کا واحد سہارا۔ بی اے کرنے کے بعد جب مجھے مرشد آباد میں کوئی نوکری نہ ملی تو میں نے کلکتہ میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ انسپکٹر نے میری باتوں پر برملا شک و شبہ کا اظہار کیا۔ وہ کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ جسٹس چوہدری کو کسی اور نے قتل کیا ہے۔ وہ بار بار یہی پوچھتا تھا کہ میں نے کس کے اشارے پر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا؟ جب میں نے دیکھا کہ وہ کسی طرح میری بات پر یقین نہیں کر رہا تو میں نے اسے پوجا کے ہوش میں آنے تک انتظار کرنے کو کہا۔ وہ کچھ دیر غصیلی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

بمشکل پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ ساتھ والے کمپارٹمنٹ سے دلدوز نسوانی چیخیں بلند ہوئیں۔ یہ پوجا کی چیخیں تھیں جواب ہوش میں آ چکی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے باپ کو اس جہان سے واپس بلانے کی کوشش کر رہی تھی، جہاں سے آج تک کوئی لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ اس کی چیخوں کی آواز سن کر انسپکٹر تیزی سے باہر لپکا۔ وہ یقیناً اس کمپارٹمنٹ میں گیا تھا، جہاں پوجا تھی۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے پھر چیخوں کی آواز آہستہ ہو گئی۔ شاید ڈاکٹر نے اسے سنبھال لیا تھا۔ کچھ دیر بعد بالکل خاموشی چھا گئی۔ گھنٹہ بھر بعد انسپکٹر واپس لوٹا تو میں نے اس کے چہرے پر خجالت کے واضح آثار دیکھے۔ اس نے کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ میری ہتھکڑیاں کھول دی جائیں۔

”کیوں کیا ہوا سر؟“ ایک کانسٹیبل نے اچنبھے سے پوچھا۔

”یہ مجرم نہیں ہے!“ انسپکٹر کی آواز گھمبیر ہو گئی۔ پھر وہ شرمندہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

”مجھے افسوس ہے نوجوان ہم نے تمہیں غلط فہمی کی بنا پر ہتھکڑی لگائی۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ ان حالات

میں بالکل فطری امر تھا۔ اب ہم تمہیں باعزت بری کرتے ہیں۔“



میرا بی چاہا اسے ہوں کہ یہ بی خوب ہے۔ پہلے بے مری کری، پھر باعزت طور پر بری کر دیا۔ یہ کام قانون کے محافظ ہی کر سکتے ہیں۔ مگر میں مصلاً چپ رہا۔ انسپکٹر اب خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلما رہے تھے۔ میں نے کہا۔

”انسپکٹر صاحب، کاش آپ اس وقت میری بات کا اعتبار کر لیتے تو مجرم اب تک قانون کے شکنجے میں آگئے ہوتے۔ اب تو ان کی گرفتاری تقریباً ناممکن ہے۔“

”سالے بچ کر کدھر جاسکتے ہیں؟“ اس نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ ”چوہا کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو، ایک نہ ایک روز بلی کے ہتھے ضرور چڑھتا ہے۔“ پھر وہ میری بہادری کی تعریف کرنے لگا کہ کیسے میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر قاتلوں کو پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ کہنے لگا:

”یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ پستول دیکھ کر بڑے بڑے سوراخوں کی روح فنا ہو جاتی ہے۔“

میں نے اس کی تعریف کے جواب میں شکریہ ادا کیا۔ وہ بولا۔ ”تمہیں تکلیف تو ہوگی مگر ایک آدھ دن کے لئے ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ تم اس واردات کے عینی شاہد ہو۔ ایف آئی آر کے اندراج اور ابتدائی تحقیقات کے لئے تمہارا بیان بڑی اہمیت کا حامل ہوگا۔ مجھے اُمید ہے تم پولیس کے ساتھ تعاون کرو گے۔ ویسے بھی تم نے بتایا ہے کہ تم نوکری کی تلاش میں کلکتہ جا رہے ہو اور تمہارا وہاں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ ایسے میں ایک آدھ روز کے لئے پولیس کی مہمان نوازی کا لطف اٹھانے میں کیا مضائقہ ہے؟“

میں جواب میں کہنا چاہتا تھا کہ پولیس کی مہمان نوازی کا لطف میں چند روز پہلے خوب اٹھا چکا ہوں، لیکن بات میرے منہ پر آتے آتے رہ گئی۔ اس کی بجائے میں نے مصنوعی خوش دلی سے کہا۔ ”کیوں نہیں..... پولیس کے ساتھ تعاون کرنا ہر شریف شہری کا فرض ہے۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“

انسپکٹر میرے خیالات کی تعریف کرنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر ہر شہری اسی طرح ذمہ داری کا مظاہرہ کرنے لگے تو ہمارا دیش امن کا گہوارہ بن جائے۔

میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ انسپکٹر نے میرے بارے میں مزید کچھ نہیں کی تھی۔ اس کا دھیان اس بات کی طرف نہیں گیا تھا کہ میں سامان کے بغیر سفر کر رہا ہوں۔ میرے بیان کے مطابق اگر میں ایک بی اے پاس نوجوان تھا جو روزگار کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا تو میرے پاس میری اسناد، چند جوڑے کپڑے، فوری ضرورت کا سامان اور کچھ رقم ضرور ہونی چاہیے تھی جبکہ میرے پاس تو ٹکٹ بھی نہیں تھا..... لیکن انسپکٹر اس خوف آگیز واردات کے واقعاتی گرداب میں کچھ اس طرح گھرا ہوا تھا کہ ان جزئیات پر غور کرنے کا اسے موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

گاڑی سہ پہر کے وقت کلکتہ پہنچی۔ پلیٹ فارم پر پولیس کی بھاری نفری موجود تھی۔ کرشنا نگر سے انسپکٹر

نے کلکتہ پولیس کو واردات کی اطلاع دے دی تھی۔ ان کی تعیناتی ٹیم لاش وصول کرنے اور دیگر کارروائی کے لئے پہنچ چکی تھی۔ ریلوے پولیس کے انسپکٹر نے انہیں واردات کی تفصیل بتائی۔ ایک فوٹو گرافر نے اندر آ کر لاش کی مختلف زاویوں سے تصاویر بنائیں۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی نقشہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے کاغذ پر بہت سے اشارات نوٹ کئے اور پھر فیتے سے کمپارٹمنٹ کی پیمائش کی اور مختلف سمتوں سے دروازوں، کھڑکیوں کا جائزہ لیا۔ اس ساری کارروائی میں پندرہ بیس منٹ لگے۔ جب کارروائی مکمل ہو گئی تو جسٹس چوہدری کی لاش وہاں سے ہٹا دی گئی۔ ریلوے اسپتال کے عملے نے لاش اسٹریچر پر ڈالی، اسے سفید چادر سے ڈھانپا اور باہر لے گئے۔ ڈاکٹر منگل سین کے پہلو میں اب ایک اور ڈاکٹر کھڑا تھا جسے وہ سارے معاملے کے متعلق بریف کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں پولیس کی معیت میں پلیٹ فارم پر اترا۔ اسٹیشن پر انسانوں کا ایک اثر دھام تھا۔ گاڑی سے پولیس کی بھاری نفری، ڈاکٹر اور ایک لاش اترتی دیکھ کر ہمارے ارد گرد لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔

ساتھ والے کمپارٹمنٹ سے جسٹس چوہدری کی بیٹی پوجا کو بھی اتار لیا گیا تھا۔ اسے لینے اس کا چچا، چچی اور کئی بھی خواہ آئے ہوئے تھے۔ وہ ان کے گلے لگ کر رو رہی تھی۔ اس کی سسکیاں اور آہیں سن کر ہر آنکھ اشکبار ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جسٹس چوہدری کوئی مشہور اور ہر دلعزیز شخص تھا۔ اس کے قتل کی خبر ابھی پوری طرح پھیلی نہ ہوگی مگر پلیٹ فارم پر اس کے مداحوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع تھی۔ کئی جو شیلے نوجوان پولیس اور انتظامیہ کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ جو جسٹس چوہدری کی جان کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی تھی۔

اسٹیشن کے باہر ایک ایمبولینس، پولیس کی چند گاڑیاں، ایک دوسرکاری جیپیں، پولیس وین، اور جسٹس چوہدری کی سیاہ ماروتی کار کھڑی تھی۔ مجھے پولیس کی ایک کھلی جیپ میں بٹھایا گیا۔ اس کے بعد یہ قافلہ جسٹس چوہدری کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ پیچھے پیچھے جسٹس چوہدری کے مداحوں کا ہجوم تھا۔

کلکتہ کے متعلق سنا تھا کہ بہت بڑا شہر ہے، انسانوں کا کوئی جنگل! جس طرف دیکھو سر ہی سر نظر آتے ہیں۔ لاکھوں انسان تھڑوں، پارکوں اور فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں۔ بھوک، افلاس اور بیماری عام ہے۔ جب تک یہ سب نہیں دیکھا تھا، تین نہیں آتا تھا۔ مگر اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی سب کچھ سچ لگنے لگا۔

گاڑیاں پہلے ایک ایسے علاقے سے گزریں جہاں سڑکیں تنگ تھیں اور دونوں جانب کھڑی سال خوردہ دکانیں ایک دوسرے پر گرتی محسوس ہوتی تھیں، لیکن جلد ہی ہم ایک کشادہ، جدید اور صاف ستھرے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں سڑکیں کھلی تھیں اور عمارات تقریباً نئی۔ جگہ جگہ پارک اور فوارے نظر آ رہے تھے۔ یہ علاقہ افلاس زدہ کلکتہ شہر کا حصہ ہرگز معلوم نہ ہوتا تھا۔ جلد ہی ہم ایک جدید پوش آبادی میں داخل ہو گئے۔ اس میں بڑی بڑی پرائیویٹ اور سرکاری کوٹھیاں تھیں۔ جسٹس چوہدری کی کوٹھی وہیں واقع تھی۔



جب گاڑیاں اس وسیع وعریض کوٹھی کے سامنے جا کر ٹھہریں تو دیکھتے ہی دیکھتے وہاں جمع لگ گیا۔ ارد گرد کی کوٹھیوں کے مکین اطلاع ملتے ہی دوڑے آئے۔ فضا میں سسکیوں اور آہوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ہر آنکھ اشک بار تھی، ہر چہرہ سوگوار تھا۔ کئی لوگ بلند آواز میں رورہے تھے۔ ایک غریب عورت ہجوم کا سینہ چیرتی ہوئی کہیں سے نمودار ہوئی، جسٹس چوہدری کی لاش کو پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور بے ہوش ہو گئی۔ کئی دیگر عورتیں ماتم کرنے لگیں۔ جسٹس چوہدری کی بیٹی بمشکل گاڑی سے اتری۔ اب تک تو وہ کسی حد تک خود کو سنبھالے ہوئے تھی، مگر جب لوگوں کو یوں روتے بلکتے دیکھا تو باپ کی جدائی کا احساس پہلے سے سوا ہو گیا۔ وہ نڈھال ہو کر اپنی چچی کے بازوؤں میں جھول گئی۔

میں اس جگہ بالکل اجنبی تھا مگر لوگوں کو اس شخص کے لئے روتا دیکھ کر میں بھی سوگوار ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا کوئی قریبی عزیز فوت ہو گیا ہو۔ وہ یقیناً لوگوں کا خیال رکھنے والا، ایک ہمدرد اور اچھا انسان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے بہیمانہ قتل نے سب کو رلا دیا تھا۔ لاش ایسبولینس سے اتار کر کوٹھی میں نہیں لے جائی گئی۔ لواحقین کی اجازت سے اسے پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا گیا۔ ایسبولینس روانہ ہوئی تو ہم لوگ لان میں آ گئے۔ لان لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر کوئی مقتول جسٹس کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ ارد گرد کھڑے لوگوں کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا اس کے مطابق وہ ایک نہایت با اصول اور فرض شناس نج تھا۔ اس کی بیوی کینسر میں مبتلا ہو کر جوانی ہی میں فوت ہو گئی تھی اور پیچھے ایک بیٹی چھوڑ گئی تھی۔ جسٹس چوہدری نے اپنی پوری زندگی اپنی بیٹی کے نام کر دی تھی۔ وہ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ بیٹی کے علاوہ اس کا کوئی اور عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ ہاں ایک سوتیلا بھائی تھا جس سے بوجہ اس کے تعلقات سالہا سال سے کشیدہ چلے آ رہے تھے۔ کوئی جائیداد وغیرہ کا جھگڑا تھا۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی سے نہیں ملتا تھا تاہم پوجا ایک مختلف لڑکی تھی۔ وہ اپنے سوتیلے چچا سے ملتی رہتی تھی اور اس سے حسن سلوک سے پیش آتی تھی۔ یہ آدمی ایک متوسط درجے کا پراپرٹی ڈیلر تھا اور کیلا بگان کے علاقے میں رہتا تھا۔ لوگوں کی باتوں سے میرے ذہن میں پوجا کے چچا اور چچی کی تصویر ابھری۔ میں نے انہیں تھوڑی دیر پہلے پلیٹ فارم پر نہایت قریب سے دیکھا تھا۔ اگرچہ کسی شخص کے باطن کا غماز ہوتا ہے تو میں نے اس کے چچا کا چہرہ دیکھ کر جو پہلا تاثر قائم کیا تھا وہ اتنا اچھا نہیں تھا۔ میں نے اسے جس انداز میں پوجا کو دلا سادیتے دیکھا تھا، وہ انداز خاصا بناوٹی تھا۔ میرے وجدان نے کہا تھا کہ یہ آدمی پوجا کے ساتھ ہرگز مخلص نہیں ہے۔

پولیس انسپکٹر نے مجھے ڈرائنگ روم میں چلنے کو کہا تو میں اس کی معیت میں اندر داخل ہوا۔ ڈرائنگ روم کا فرنیچر ہٹا کر ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ جوتے اتار کر قالین پر بیٹھے ہوئے تھے اور اس سانچے کے بارے میں اپنے اپنے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ جسٹس چوہدری کو دہشت گردوں نے قتل کیا ہے۔ انہیں اودہشت گردی کے جج کی حیثیت سے انہوں

نے کئی لوگوں کو موت کی سزا سنائی تھی اور مجرموں کے ساتھیوں کی طرف سے انہیں مسلسل قتل کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔ تاہم کچھ لوگ دبے لفظوں میں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ یہ کسی اور شخص کی کارروائی بھی ہو سکتی ہے جو جسٹس صاحب سے کوئی دیرینہ مخالفت رکھتا ہو..... اشارہ پوجا کے سوتیلے چچا کی طرف تھا۔

ڈرائنگ روم میں اکثر لوگوں کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے کہ میں ہی وہ نوجوان ہوں جس نے حملہ آوروں کو پکڑنے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔ وہ لوگ مجھے ہیرو کا درجہ دے رہے تھے جبکہ میں اندر سے بری طرح ڈرا ہوا تھا۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں ایک پاکستانی نوجوان ہوں اور غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہوا ہوں تو نہ جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ پولیس کے علاوہ وہاں شہر بھر کے اخباری نمائندے بھی موجود تھے اور مجھے گھیرنے کی فکر میں تھے۔ وہ تو غنیمت رہی کہ انسپکٹر نے انہیں مجھ سے بات کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ مجھے لے کر ایک ماحقہ کمرے میں چلا گیا جہاں دو پولیس آفیسر اور ایک مجسٹریٹ پہلے سے موجود تھے۔ اس جگہ شام تک پولیس نے اپنی تفتیش اور کاغذی کارروائی جاری رکھی۔ درحقیقت اس کمرے میں ایک عارضی تفتیشی اور تحقیقاتی عدالت قائم کی گئی تھی۔ پولیس کے افسروں نے بہت سے لوگوں سے پوچھ گچھ کی، جن میں پوجا کا چچا، چچی، گھریلو ملازمین اور ہمسائے بھی شامل تھے۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ چند روز پہلے جب پوجا اور اس کے پتاجی، پوجا کی ایک سہیلی کی شادی کی شرکت کے لئے مرشد آباد روانہ ہوئے تھے تو سکوتر پر سوار دو مشتبہ نوجوانوں نے گھر سے ریلوے اسٹیشن تک ان کی کار کا تعاقب کیا تھا۔ شواہد بتاتے تھے کہ وہی دو نوجوان جسٹس چوہدری کے قتل میں ملوث تھے۔

مغرب کے بعد جب پوجا کی طبیعت قدرے سنبھلی ہوئی تھی، مجھے اس کے کمرے میں لے جایا گیا۔ کمرے میں موجود سب لوگوں کو باہر بھیج دیا گیا۔ ان میں پوجا کے چچا اور چچی بھی شامل تھے۔ ایک پولیس آفیسر اور مجسٹریٹ کی موجودگی میں پوجا نے مجھے اپنے ایک ہمدرد اور محسن کے طور پر شناخت کیا اور بتایا کہ اگر میں نہ ہوتا تو وہ غنڈے اسے بھی قتل کر ڈالتے۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پولیس پہلے ہی میرا تفصیلی بیان لے چکی تھی۔ علاوہ ازیں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی انہیں موصول ہو چکی تھی۔ اس لئے پوجا کے بیان کے بعد نا معلوم دہشت گردوں کے خلاف ایف آئی آر کاٹ دی گئی اور پولیس آفیسر نے پوجا کے چچا کو آخری رسومات کی اجازت دے دی۔ پھر پولیس آفیسر نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر وجے آپ فی الحال ہماری طرف سے فارغ ہیں۔ تاہم ضرورت پڑنے پر ہم آپ کو دوبارہ طلب کریں گے۔ آپ کے تعاون کا بہت شکریہ!“

پوجا نے اس وقت اپنی بڑی بڑی اشک بار آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں دنیا جہان کی ممنونیت تھی۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے بچانے اور پتاجی کے قاتلوں کو پکڑنے کے



لئے آپ نے جس طرح اپنی جان خطرے میں ڈالی، میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں چکا سکتی۔ عام حالات ہوتے تو میں آپ کو اپنے ہاں چند روز مہمان ضرور رکھتی، مگر غم کا یہ پہاڑ..... خیر سب کچھ بھگوان کی طرف سے ہوتا ہے۔ آپ کسی روز دوبارہ ضرور آئیے گا، بلکہ میں آپ سے خود ملنا چاہوں گی۔ آپ..... آپ مجھے اپنا پتہ دیتے جائیے.....“

”میں نے جو کچھ کیا، یہ کوئی احسان تو نہیں تھا۔“ میں نے شائستگی سے کہا۔ ”یہ تو بحیثیت انسان میرا فرض تھا۔ بلکہ مجھے تو لوگوں کی محبتیں دیکھ کر بے حد رنج ہو رہا ہے کہ میں آپ کے عظیم پتاجی کو بچانے یا ان کے قاتلوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا..... آپ کا غم ہمالہ سے بڑا ہے۔ آپ کو جو زخم لگا ہے اسے مندمل ہونے میں یقیناً ایک عرصہ لگے گا۔ میں آپ کے لئے بھگوان سے پراختنا کروں گا اور جب بھی موقع ملا آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔ اب مجھے آگیا دیجئے۔“

میری باتوں کے جواب میں اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں کوئی انسان نہیں، دیوتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں عقیدت و محبت کے دیئے جلنے لگے تھے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل سے ایک پیڈ اور بال پوائنٹ پین نکال کر میری طرف بڑھایا۔

”یو ریڈر لیس پلیز.....!“

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہوں اور کیا لکھوں۔ میرا کوئی ٹھکانہ ہوتا تو پیڈ پر پتہ لکھتا۔ میں نے چند لمحے توقف کیا اور پھر پیڈ پر انگریزی میں لکھا۔

”میں ایک بے روزگار نو جوان ہوں اور نوکری کی تلاش میں کلکتہ آیا ہوں۔ فی الحال میرا کوئی ایڈریس نہیں۔ یہاں سے نکل کر کوئی ہوٹل یا سرائے تلاش کروں گا۔“

میں نے یہ لکھ تو دیا لیکن فوراً ہی پچھتاوا بھی ہونے لگا کہ نہ جانے وہ کیا سمجھے۔ میں نے ہاتھ روک لیا تھا۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ آگے بڑھادیا۔ اب پیڈ اس کے ہاتھ میں دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پوجانے میرے تحریر کردہ الفاظ پڑھے تو چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے بے اختیار انگریزی میں کہا۔ ”آپ، آپ کچھ اور نہ سمجھے گا۔ آپ نے ایڈریس پوچھا تھا، اس لئے مجھے مجبوراً یہ لکھنا پڑا۔“

پولیس انسپکٹر باہر جا چکا تھا۔ کمرے میں پوجا اور اس کے چچا، چچی کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ انگریزی سے نابلد لگتے تھے، مگر ان کی پوری توجہ ہماری گفتگو کی طرف تھی۔ پوجانے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف۔ کچھ سوچ کر اس نے ہولے سے سر ہلایا اور پیڈ کا صفحہ الگ کر کے اسے فولڈ کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ”آپ ابھی جائیے گا نہیں، ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیے۔ میں آپ سے دوبارہ بات کروں گی۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی سے باہر آ گیا۔

کلکتہ میں میری پہلی رات ایک فور اسٹار ہوٹل میں گزری۔ اس ہوٹل کا نام ”سن فورٹ“ تھا اور یہ ہاوڑا کے علاقے ایئر پورٹ روڈ پر واقع تھا۔ رات گئے پوجا سے میری دوسری ملاقات ہوئی تھی تو اس نے مجھ سے استدعا کی تھی کہ میں اس کی کوٹھی میں اس وقت تک بطور مہمان قیام کروں، جب تک مجھے کوئی مناسب نوکری نہیں ملتی۔ مگر میں نے اس کی یہ پیشکش شکریے کے ساتھ رد کر دی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ رنج و غم کی اس اندوہناک کیفیت میں، میں اس کے گھر میں مہمان نوازی کا لطف اٹھاؤں، یہ بات مناسب ہے نہ مروج۔ اب ایک تعلق قائم ہو ہی چکا تھا تو اس کی مہمان نوازی کا لطف پھر کسی وقت اٹھایا جا سکتا تھا۔ تب اس نے مجھ سے یہ درخواست کی کہ میں ہوٹل سن فورٹ میں ٹھہر جاؤں۔ یہ ہوٹل اس کی ایک کروڑ پتی اینگلو انڈین سہیلی مس فلورا کی ملکیت تھا۔ وہ مجھے وہاں اپنے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرانا چاہتی تھی..... میں انکار کرتا رہا مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ میں نے اس کے سامنے ایک شرط رکھی جو معقول ہونے کی وجہ سے اس نے فوراً قبول کر لی۔ میں نے اس سے کہا۔

”پوجا جی۔ زیادہ مناسب تو یہ ہوگا کہ آپ اپنی دوست سے کہہ کر مجھے اسی ہوٹل میں کوئی جاب دلادیں۔“

”ٹھیک ہے میں اس سے کہہ دوں گی۔ لیکن آپ فی الحال چند روز کے لئے وہاں منتقل ہو جائیے۔“ اس نے کہا اور پھر اپنے ڈرائیور کو طلب کیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ مجھے ہوٹل سن فورٹ چھوڑ آئے۔ اس کی سہیلی مس فلورا جسٹس چوہدری کے قتل کی خبر سن کر پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی اور پوجانے اس سے شاید بات بھی کر دی تھی۔ یوں کلکتہ میں قیام و طعام کا مسئلہ بطریق احسن حل ہو گیا۔ بعد ازاں پوجا کی سہیلی نے مجھے ہوٹل کے کیٹرنگ منیجر کا اسٹنٹ لگا دیا تھا۔

اس دوران میں کئی مرتبہ پوجا کے گھر گیا۔ میں نے آنجنمانی جسٹس کی آخری رسومات میں بھی شرکت کی تھی۔ قتل کے اگلے روز ان کی چتا کو آگ دکھائی گئی۔ شمشان گھاٹ پر بہت بڑا ہجوم تھا۔ ہر طرف سسکیوں اور آہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ پوجانے آگے بڑھ کر خود لکڑیوں کو آگ لگائی۔ میں اس لمحے اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اپنے پتا کی ارٹھی کو نذر آتش کر کے وہ بلک بلک کر رو دی۔ میرا جی چاہا تھا کہ اسے آگے بڑھ کر اپنے سینے میں بھر لوں۔ وہ ایسی لڑکی تھی جسے صرف ہنسنے اور مسکرانے کے لئے تخلیق کیا گیا تھا۔ نہ جانے اسے کس کی نظر لگ گئی تھی۔ اس کا سوتیلا چچا، چچی اور ان کا بیٹا کیلاش اس وقت بھی اس کے ساتھ چپکے کھڑے تھے۔ چچی اسے سینے سے لگا کر دلاسا دے رہی تھیں۔ مجھے اس کا یہ انداز مصنوعی اور اوپرالگا۔ میں اس سے نظریں ہٹا کر ارٹھی کو دیکھنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جسٹس چوہدری کا بدن راکھ ہو گیا۔



پانچ روز گزر گئے مگر جسٹس چوہدری کے قاتلوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ پولیس کو شبہ تھا کہ قتل اس گروہ کی کارستانی ہے، جس کے ارکان دہشت گردی کے مقدموں کا سامنا کر رہے تھے اور جسٹس چوہدری نے ان میں سے کئی ایک کو موت کی سزا سنائی تھی۔ لیکن میرا خیال اس سے قطعاً مختلف تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ جسٹس صاحب کے قتل میں اس کا سوتیلا بھائی یعنی پوجا کا چچا ملوث ہے۔ اس شبے کو ان باتوں نے تقویت پہنچائی تھی جو مجھے پوجا کے پرانے گھریلو ملازم پیارے لال سے معلوم ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ پوجا کے دادا جان نے دو شادیاں کی تھیں۔ پوجا کی اصل دادی ماں ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی تھیں جس کے بعد دادا جان نے دوسری شادی رچائی۔ دونوں بیویوں سے ان کا ایک ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ ان کی دوسری بیوی، پہلی بیوی کی اولاد یعنی پوجا کے والد سے اچھا سلوک نہیں کرتی تھی جس کی وجہ سے دادا جان نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور وہ تمام عمر اپنے والدین کے گھر بیٹھی رہی تھی۔ پوجا کے والد کو بعد ازاں ایک اینگلو انڈین گورنس نے پالا تھا۔ پوجا کے دادا جان کی اچھی خاصی جائیداد تھی جو انہوں نے پوجا کے والد کے نام کر دی تھی۔ اپنی دوسری بیوی اور اس کی اولاد کو انہوں نے پھوٹی کوڑی بھی نہ دی تھی۔ اس بات نے دونوں بھائیوں میں رنجش کا بیج بو دیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ البتہ ان کے بچے آپس میں مل لیتے تھے۔ پوجا کبھی کبھار کسی تہوار پر اپنے سوتیلے چچا کی فیملی سے ملنے کیلا بگان چلی جاتی تھی۔ جسٹس صاحب اس بات پر اپنی بیٹی سے خفا ہوتے تھے مگر وہ انہیں پیار سے منالیتی تھی۔ جسٹس صاحب کا خیال تھا کہ ان کا سوتیلا بھائی ایک لالچی آدمی ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح وہ جائیداد ہتھیانا چاہتا ہے جو جسٹس چوہدری کی وفات کے بعد پوجا کو ملے گی۔ چچا کا بیٹا کیلاش انڈین آرمی میں لیفٹیننٹ تھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ ان کا سوتیلا بھائی اپنے بیٹے کے ذریعے ان کی معصوم بچی کو پھانسا چاہتا ہے۔ یہ خدشہ ایسا بے بنیاد بھی نہیں تھا۔ برسوں پہلے جب پوجا اور کیلاش سکول میں پڑھتے تھے تو ایک بار چچا نے جسٹس صاحب سے اپنے حصے کی جائیداد کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر جسٹس صاحب نے اسے بری طرح دھتکار دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اس عورت کے بیٹے کو ایک دمڑی بھی نہ دیں گے جس کی بدسلوکی کی وجہ سے ان کے باپ نے بچپن میں انہیں ایک گورنس کے سپرد کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر وہ ان کے ساتھ عدالتی جنگ لڑ سکتا ہے تو لڑ لے، اسے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ چچا اپنی اس بے عزتی پر بیچ و تاب کھاتا واپس چلا گیا مگر جاتے جاتے یہ کہہ گیا:

”فکر نہ کرو چوہدری! یہ جائیداد میں عدالت کے ذریعے نہیں اپنے بیٹے کے ذریعے حاصل کروں گا۔“

جسٹس صاحب نے اس وقت اس کی یہ بات ہنسی میں اڑا دی تھی مگر جب بچے جوان ہو گئے اور آپس میں ملنے لگے تو انہیں اپنے سوتیلے بھائی کی کہی ہوئی پرانی بات کچھ کے لگانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پوجا کو ان لوگوں سے ملنے سے روکتے تھے۔ وہ چاہتے تو اسے سختی سے وہاں جانے سے منع کر دیتے مگر وہ اس پر سختی

کر ہی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی بیٹی کو اوجھی آواز میں مخاطب نہیں کیا تھا۔ یہ وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے میں پوجا کے چچا پر شک کرنے لگا تھا کہ اس نے جائیداد ہتھیلانے کے لئے یہ قتل کروایا ہوگا۔ اس کے پاس جائیداد ہتھیلانے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ کسی طرح اس کے بیٹے کیلاش اور جسٹس چوہدری کی بیٹی پوجا کی شادی ہو جائے۔ لیکن جسٹس چوہدری کے جیتے جی ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے اس نے ضروری سمجھا ہوگا کہ یہ کاٹنا بیچ میں سے نکال دیا جائے۔ اگر اس واردات کو یہ رنگ دیا جا سکتا کہ جسٹس صاحب کو دہشت گردوں نے قتل کیا ہے تو اس پر پوجا سمیت کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بعد ازاں یتیم بھتیجی کو ہمدردی دکھا کر اور اس کے سر پر ہاتھ رکھنے کا نالک رچا کر اپنے بیٹے سے اس کی شادی کرنا چنداں مشکل نہ تھا۔

لیکن یہ باتیں میں نے کسی کے گوش گزار نہیں کیں۔ پوجا سے ایسی بات کہنا بے حد دشوار تھا۔ ایک تو مجھے اس سے تفصیلی ملاقات کا موقع نہ ملتا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ کے سوا میں جب بھی اس سے ملنے گیا، پیارے لال نے یہی بتایا کہ اس کی طبیعت ناساز ہے اور وہ اپنے کمرے میں دوا کھا کر لیٹی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے اسے مسکن ادویات تجویز کر رکھی تھیں تاکہ وہ پرسکون رہے۔ دوسرے میں نے ہر بار چچا اور چچی کو کوٹھی پر موجود پایا۔ وہ مجھے بہت عجیب اور ناگوار نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ میں پوجا سے ملنے نہ پاؤں۔ وہ مجھے وہاں آنے سے روک نہیں سکتے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ پوجا مجھے خصوصی اہمیت دیتی ہے۔ اور میری بہت عزت کرتی ہے۔ بہر کیف مجھے اس سے تفصیلی ملاقات کا موقع مل بھی جاتا تو شاید میں برملا اس سے یہ سب کچھ نہ کہہ پاتا۔ پیارے لال نے بتایا تھا کہ وہ اپنے پتا جلی کے منع کرنے کے باوجود ان سے ملتی تھی۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ وہ انہیں اچھا سمجھتی تھی۔ عین ممکن تھا وہ کیلاش کو پسند کرتی ہو، پھر بھلا وہ ان کے متعلق ایسی ویسی بات سننے کی روادار کیسے ہو سکتی تھی؟

دو ہفتے گزر گئے۔ ایک اتوار صبح ہی صبح میرا جی چاہا کہ پوجا سے ملنے جاؤں۔ میں نے لباس بدلا اور خوشبو لگا کر ٹیکسی میں بیٹھ کر کوٹھی پہنچ گیا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ گزشتہ روز کے ابر آلود موسم کی بدولت اوس پڑی تھی جس کے ننھے ننھے قطرے لان کی مٹلیں گھاس پر جھلملا رہے تھے۔ پیارے لال نے مجھے لان میں بچھی کر سیوں پر بیٹھنے کو کہا اور بولا۔

”بٹیا کو ادھر ہی بلاتا ہوں ایک دو روز سے وہ صبح ہی صبح لان میں ٹہلنے لگی ہیں!“

”یہ تو بہت اچھی علامت ہے!“ میں نے مسکرا کر کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ لان کے ایک کونے میں المٹاس کا پیڑ تھا۔ اس کی شاخوں پر زرد اور نیلے رنگ کی چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ نرم ہوا بدن کو گدگداتی ہوئی گزر رہی تھی۔ فضا میں گلابوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میں اس دل فریب منظر میں کھوسا گیا۔ دفعتاً مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ میرے عقب میں پوجا



لگ رہی تھی۔  
 ”نمستے!“ میں نے جلدی سے ہاتھ جوڑے۔  
 ”نمستے!“ اس نے بھی ہاتھ باندھے۔ مگر انداز میں سوگواری کی ہلکی سی آمیزش تھی۔ پتاجی کی موت نے اسے جو صدمہ پہنچایا تھا اس سے نکلنے کے لئے ابھی اسے مزید وقت درکار تھا۔  
 ”میں آج بیدار ہوا تو آپ کی یاد آئی اور ملنے کو جی چاہنے لگا۔ میں اسی لمحے اٹھ کر ادھر چلا آیا، آ..... آپ کو برا تو نہیں لگا؟“ میں نے جھکتے جھکتے کہا۔  
 ”نہیں۔ بلکہ مجھے اچھا لگا۔ میں خوش نصیب ہوں کہ سنسار میں ابھی کچھ لوگ ہیں جنہیں میں یاد آ سکتی ہوں!“ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔  
 ”دیکھئے آپ روئیں گی نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اگر آپ مجھے کچھ سمجھتی ہیں تو میری خاطر یہ رونا بند کر دیں۔“  
 ”آنسوؤں پہ اب کسے اختیار ہے۔“ وہ آنچل سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔  
 ”مجھے پیارے لال نے بتایا تھا کہ آپ روزانہ صبح لان میں ٹہلنے نکلتی ہیں۔ یہ ایک صحت مندانہ علامت ہے۔ آپ کو آہستہ آہستہ جیون کی طرف واپس لوٹنا چاہیے۔“ میں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔  
 ”جیون..... جیون میں میرے لئے اب رہ ہی کیا گیا ہے؟ پتاجی کے سوا میرا تھا ہی کون؟“ اس کی آواز لرز نے لگی۔

”دیکھئے مایوسی پاپ ہے۔“ میں نے اسے سمجھانا شروع کیا۔ ”مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ آپ اپنے ارد گرد دیکھئے۔ کیا آپ کو کچھ نظر نہیں آتا؟ اتنے بہت سے لوگ ہیں جو آپ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کے چچا ہیں، چچی ہیں، ان کا بیٹا کیلاش ہے..... آپ کے پتاجی کے دوست، آپ کی کلاس فیلوز اور سہیلیاں، وفادار ملازم..... ہمسائے اور..... میں..... میں بھی تو ہوں۔“  
 اس نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ ”آپ..... آپ میرے لئے ان سب سے زیادہ اہم ہیں۔“

میں نے حیرت سے یہ کلمات سنے۔ اس نے چچا، چچی اور ان کے بیٹے کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔  
 ”اگر آپ مجھے اس قدر اہم سمجھتی ہیں تو میں بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو مصیبت کی کسی گھڑی میں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے جوش سے کہا۔

”مجھے پورا وثوق ہے۔“ اس نے سرکواشات میں جنبش دی۔ ”آپ بہت اچھے انسان ہیں!“  
 ”دراصل آپ خود اتنی معصوم، اچھی اور پیاری ہیں کہ آپ کے لئے میں کچھ بھی کروں، کم معلوم ہوتا

ہے۔ میں اس کی اسوں میں دیکھے ہوئے ہوں۔ وہ شرم سے سرخ ہو گئی۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے ایک ہی زقند میں تکلف کی حد پار کر لی۔ خدا جانے وہ میرے بارے میں کیا تاثر لے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ میں نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ رخ بدل کر املتاس پر بیٹھی چڑیوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر اب ایک خوشگوار تاثر تھا۔ کہیں سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس نے میری بات کا برا منایا ہے۔

”آپ کیا دیکھ رہی ہیں؟“ میں نے اس کے قریب ہو کر پوچھا۔  
 ”میں دیکھ رہی ہوں کہ یہ چڑیاں کتنی خوبصورت ہیں اور موسم بھی کس قدر اچھا ہو رہا ہے۔“  
 ”خوبصورتی اور موسم تو انسان کے اندر ہوتا ہے پوجاجی! من میں شانتی ہو تو ہر چیز اچھی لگتی ہے، دل ناشاد ہو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔“

”ہاں، یہ آپ نے درست کہا۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کی باتوں سے میرے من کی اداسیاں دور ہونے لگی ہیں۔ شاید اسی لئے ایک دم سب کچھ اچھا لگنے لگا ہے!“  
 ”میری دعا ہے کہ بھگوان آپ کو ہمیشہ ایسا ہی رکھے..... ہنستا مسکراتا.....!“ میں نے خلوص سے کہا۔  
 ”بھگوان آپ کو بھی ایسا ہی رکھے..... پر خلوص، خیال رکھنے والا اور محبت کرنے والا!“  
 پھر ہم کتنی ہی دیروہاں لان میں بیٹھ کر بات کرتے رہے یہاں تک کہ پیارے لال نے ہمیں ناشتہ لگنے کی اطلاع دے دی۔

☆.....☆.....☆

مہینہ بھر میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بچہ قریب آ گئے۔ اب ہم ایک دوسرے کو آپ کی بجائے تم کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور گھنٹوں اکٹھے گھومتے تھے۔ میں اپنے دل میں اس کے لئے حقیقی محبت محسوس کرنے لگا تھا۔ نیلم کے بعد میں نے کسی لڑکی کو دل سے پسند کیا تھا تو وہ پوجا ہی تھی۔ وہ بھی مجھے ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی اور میری محبت میں اس قدر آگے جا چکی تھی کہ اس نے باقاعدہ مجھے شادی کی دعوت دے ڈالی تھی۔ عام حالات ہوتے تو میں اسے اپنی خوش بختی سمجھتا، مگر اپنی مخصوص حالت کی وجہ سے پوجا کی یہ بات سن کر میں پریشان ہو گیا۔ میرے ساتھ جو مسئلہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد شادی کے تصور سے ہی مجھے ہول آتا تھا۔ چپون کے ساتھ گزارے ہوئے وصل کے لمحات کی بدولت میرے خون میں زہر پھیل گیا تھا۔ سلمیٰ کی ہلاکت اس کا واضح ثبوت تھی۔ میں اپنے جسم میں پھیلے ہوئے زہر سے پوجا کو کس طرح ہلاکت میں ڈال سکتا تھا؟ پوجا ہی پر کیا موقوف تھا، میں جانتے بوجھتے کسی بھی لڑکی کو اپنے قرب و وصال سے ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ سلمیٰ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد میں نے اس وقت تک خود پر جبر کرنے کا فیصلہ کیا تھا، جب تک میں اس مسئلے کا کوئی علاج نہ کروالوں۔ اگرچہ میرے لئے اپنے جذبات ضبط کرنا



بے حد مشکل تھا۔ میری رگوں میں ہر وقت آنکھن ہوتی رہتی تھی اور بدن سلگتا رہتا تھا۔ یہ کیفیت میرے لئے کسی عذاب سے کم نہ تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں زیادہ دیر تک اپنے جسم میں ابلنے اور کھولنے والے اس لاوے کو پھوٹ بہنے سے روک نہیں پاؤں گا۔ جسمانی تقاضے شعور کے اس درجہ تابع نہیں ہوتے کہ انہیں طویل عرصے تک دبایا جاسکے۔ خصوصاً بھوک اور جنسی خواہشات کے سرکش گھوڑے عقل کی چابک سے زیادہ عرصہ رام نہیں کئے جاسکتے۔ بہر حال پوجا کی طرف سے شادی کے تقاضے کو میں نے وقتی طور پر ٹال دیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اس کے پتاجی کے دھیانت کو ابھی ایک مہینہ گزرا ہے، لوگ کیا کہیں گے۔ اسے ایک دو ماہ مزید صبر کرنا چاہیے۔ میرے سمجھانے بجھانے پر وہ خاموش ہو گئی، لیکن میرے لیے اس کی دیوانگی پہلے سے سوا ہو گئی تھی۔ اس کے لئے یہ بات انوکھی سرخوشی کا باعث تھی کہ دو ماہ بعد ہی سہی میں اس سے شادی کرنے کو تیار تھا۔

میں یہ ذکر کرتا چلوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ کیلاش کو پسند کرتی ہوگی محض ایک واہمہ تھا۔ اسی طرح یہ گمان کہ وہ اپنے سوتیلے چچا اور چچی کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی، درست نہ تھا۔ پوجا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ محض اس لئے ان لوگوں سے ملتی تھی کہ آپس کی دشمنی ختم نہیں ہو سکتی تو کم از کم بڑھے بھی نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا چچا بہت لالچی ہے اور جائیداد ہتھیلانے کے لئے کسی حد تک بھی جاسکتا ہے۔ اس لئے اس نے انہیں یہ یقین دلا کر رام کر رکھا تھا کہ وہ کیلاش ہی سے شادی کرے گی اور یوں جائیداد کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ وہ اپنے چچا کو اطمینان دلا چکی تھی کہ وقت آنے پر وہ کسی نہ کسی طرح اپنے پتاجی کو راضی کر لے گی۔ ابھی تو کیلاش کو ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون سے پاس آؤٹ ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے۔ جب تک وہ کیپٹن کارینک نہ لگا لیتا، سرکاری طور پر اسے شادی کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ اس لحاظ سے انہیں دو اڑھائی سال انتظار کرنا تھا۔ کیلاش جب کبھی چھٹی لے کر آتا تھا تو پوجا اپنے چچا چچی کو مطمئن رکھنے کے لئے اس سے ملنے چلی جاتی تھی اور کلب یا کسی ہوٹل میں کھانے کی دعوت بھی قبول کر لیتی تھی۔ مگر حقیقتاً اسے کیلاش سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ یہ سب محض اس لئے کرتی تھی کہ چچا کا سانپ قابو میں رہے۔ جو اس کے پتاجی کو کسی وقت بھی ڈس سکتا تھا۔ مگر اب جبکہ اس کے پتاجی نامعلوم حملہ آوروں کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے، اس نے اس فیملی سے قطع تعلق کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

اس کی باتیں سن کر میں نے اولاً یہی خیال کیا کہ وہ اپنے سوتیلے چچا ہی کو اپنے پتاجی کے قتل کا ذمہ دار سمجھتی ہے مگر جب میں نے اس کے متعلق بات کی تو اس نے مجھ سے اختلاف کیا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ اس کی اس یقین دہانی کے بعد کہ وہ کیلاش ہی سے شادی کرے گی، چچا کو ایسا قدم اٹھانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ خصوصاً اس لئے بھی پولیس کی طرف سے ان پر شبے کا موہوم سا اظہار بھی اسے (پوجا کو) ان سے برگشتہ کر سکتا تھا۔ پھر بھلا وہ یہ رسک کیوں لیتے؟ اس نے اس طرف بھی میری توجہ دلائی کہ نقاب پوش

نوجوان محض اس کے پتاجی کو قتل کرنے نہیں آئے تھے بلکہ وہ اسے بھی مار ڈالنا چاہتے تھے۔ اگر چچا ہی نے حملہ آوروں کو بھجوا دیا تھا تا کہ وہ اس کے پتاجی کو قتل کر کے راستے کا پتھر ہٹا دیں اور وہ کیلاش سے اس کی شادی کروادیں تو پھر وہ لوگ پتاجی کے قتل ہی پر اکتفا کرتے، اسے مارنے کی کوشش ہرگز نہ کرتے، جبکہ یہ حقیقت تھی کہ ایک نوجوان نے اسے بھی نشانے پر رکھ لیا تھا اور اگر میں بروقت اسے پرے نہ دھکیلتا تو وہ پوجا پر فائر کر دیتا!

پوجا کے دلائل میں خاصا وزن تھا۔ میں نے اس کی ذہانت کی داد دی لیکن ساتھ ہی اسے متنبہ کیا کہ وہ اپنے چچا سے حد درجہ محتاط رہے۔ اگر یہ فرض کر بھی لیا جاتا کہ اس کے پتاجی کے قتل میں اس کے چچا کا کوئی کردار نہیں تو اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا تھا کہ پوجا آئندہ ان کی دست برد سے محفوظ رہے گی۔ اس کے پتاجی کے قتل کے کچھ عرصہ بعد اس بات کا پورا امکان تھا کہ وہ لوگ اسے اپنا وعدہ یاد دلانیں گے۔ اس کے انکار کی صورت میں حالات بگڑ سکتے تھے۔ وہ اس کا انکار کبھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کرتے۔

میری بات سن کر پوجا نے خاصی فکر مندی کا اظہار کیا۔ پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہنے لگی۔ ”اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ میں فوراً شادی کر لینی چاہیے۔ اگر چچا نے کوئی اعتراض کیا تو میں کہہ سکتی ہوں کہ کیلاش تو ابھی نیانیا لیفٹیننٹ بنا ہے۔ اسے کیپٹن بننے میں ابھی دو اڑھائی سال لگیں گے اور اس سے پہلے اسے شادی کی اجازت نہیں۔۔۔۔۔ جبکہ میں پتاجی کی موت کے بعد خود کو یکدم تنہا محسوس کرنے لگی ہوں۔ اور اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں۔ اگر اس کے بعد بھی انہوں نے کوئی سرکشی دکھائی تو میرے پتی ہونے کی حیثیت سے تم معاملہ سنبھال لینا۔

”ہم شادی کریں گے، ضرور کریں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے، دو ماہ بعد۔۔۔۔۔!“

”مجھے اتنا پریم دے کر بے وفائی نہ کرنا وجہ۔ ورنہ میں جان دے دوں گی اور میرا خون تمہارے سر ہوگا۔“ اس نے جذباتی ہو کر کہا اور میں نے پیار سے اسے اپنے سینے میں بھر لیا۔

☆.....☆.....☆

زندگی کے ایام سکون سے گزر رہے تھے کہ ایک رات میں نے ایک پریشان کن خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں کراچی کے ساحل ہاکس بے پر کھڑا ہوں اور سمندر میں زبردست طغیانی ہے۔ پھرے ہوئے سمندر کی چنگھاڑ سے دل دہل رہا ہے۔ آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے ہیں اور بجلی میت ناک آواز سے کڑک رہی ہے۔ تیز طوفانی جھکڑ چل رہے ہیں۔ ایسے میں سمندر کی مہیب موجوں پر ایک شکستہ کشتی نمودار ہوتی ہے جس میں میرے گھر کے سارے افراد سوار ہیں۔ کشتی طوفان میں گھر جاتی ہے اور یکدم الٹ جاتی ہے۔ سب لوگ چیخنے چلانے لگتے ہیں اور مجھے مدد کے لئے پکارنے لگتے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں



آواز میری پیاری اور لاڈلی بہن نوشین کی ہے۔ وہ چیخ رہی ہے۔

”بوبی بھائی..... بوبی بھائی خدا کے لئے ہمیں بچاؤ!“ اور میں چاہتے ہوئے بھی اسے بچا نہیں پاتا کیونکہ ساحل کی چٹانوں سے یکا یک ایک اڑدھانمودار ہوتا ہے اور مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے.....! میں بے بسی کے عالم میں چلاتا ہوں تو اڑدھایا یکا یک چپون کا روپ دھار لیتا ہے اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہتا ہے۔ ”دیکھا؟ یہ ہوتا ہے میری بات نہ ماننے والوں کا انجام.....!“ اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور حلق بے حد خشک ہو رہا تھا۔ ٹیبل لیپ جلا کر میں نے وقت دیکھا تو تین بج رہے تھے۔ میں نے پانی کا گلاس پیا اور پریشانی کے عالم میں اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ میں جب کا گھر سے نکلا تھا، میرا گھر والوں سے کوئی رابطہ نہ ہوا تھا۔ خدا جانے وہ کس حال میں تھے؟ میرے یوں گھر سے نکل جانے پر امی اور نوشین کا کیا حال ہوا ہوگا۔ ابو کے دل پر کیا گزری ہوگی، مجھے یہ احساس کچوکے لگا رہا تھا۔ میں نے سوچا مجھے گھر فون کرنا چاہیے۔ انہیں اپنی خیریت کی اطلاع اور ان کا احوال پوچھنا چاہیے۔ مگر یہ صبح سویرے ہی ممکن تھا۔ یہ سوچ کر میں لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا، مگر نیند مجھ سے روٹھ گئی تھی۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ میرے کمرے میں ایکسچینج سے منسلک فون تھا۔ ان دنوں ڈائریکٹ ڈائلنگ کا نظام مروج نہیں تھا۔ میں نے آپریٹر کا نمبر ڈائل کیا اور اسے کراچی کا نمبر بک کروایا۔ رش کا وقت نہیں تھا، اس لئے کال پانچ منٹ میں مل گئی۔ جب آپریٹر نے مجھے بتایا کہ مطلوبہ نمبر پر رنگ جا رہا ہے تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

☆.....☆.....☆



”ہیلو.....“ میرے حلق سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

”ہیلو.....!“ جواب میں چوڑیوں کی کھنک اور ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ یہ ناہید کی آواز تھی۔ میں اسے بخوبی پہچان سکتا تھا۔

”مم میں بوبی بول رہا ہوں ناہید.....“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف قبرستان کا سانسٹا چھا گیا۔ میں نے کئی دفعہ ہیلو ہیلو کیا مگر دوسری طرف وہی مہیب خاموشی تھی۔ اس خاموشی سے میرا دل ہولنے لگا۔ میں نے جیسے خلا میں اسے مخاطب کیا ”ناہید کیا مسئلہ ہے تم مجھ سے بات نہیں کر رہیں.....؟ ٹھیک ہے اگر تم بات نہیں کرنا چاہتیں تو فون کسی اور کو دے دو.....“ وہ بدستور خاموش رہی۔ البتہ چوڑیوں کی کھنک سے مجھے اس کی دوسری طرف موجودگی کا احساس ضرور ہوا۔

”دیکھو گھر میں کسی اور کو بلا دو مجھے ایک ضروری بات پوچھنی ہے.....“ اس بار میں نے قدرے تلخی سے کہا۔

”آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں.....؟“ بلاآ خراس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

”تم..... تم سب لوگ ٹھیک تو ہونا؟“ میں نے بمشکل کہا

”آپ کو کب سے ہماری خیریت کی فکر لاحق ہونے لگی؟“

”کیوں..... کیا میرا آپ لوگوں سے کوئی تعلق نہیں؟“

”جن کا تعلق ہوتا ہے..... وہ یوں گھر چھوڑ کر نہیں جاتے.....!“

”وہ..... وہ میری ایک مجبوری تھی!“ میں نے شرم ساری سے کہا ”لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ شاید

میرا فیصلہ غلط ہی تھا..... بہر حال مجھے بناؤ امی ابو اور سب گھر والے کیسے ہیں؟“

”اب بہت آرام سے ہیں.....!“ اس کی آواز یکدم بھرا گئی۔

”کک..... کیا مطلب؟“ میرا دل انجانے خدشے سے ڈولنے لگا۔ ”صاف صاف بات

کرو ناہید.....“



”کیا تم کچھ نہیں جانتے؟“ اس کی ہلکتی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

”نن..... نہیں..... میں کیسے جان سکتا ہوں؟“ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔  
”واقعی.....؟“ وہ سسکی۔

”ناہید! میں کچھ نہیں جانتا..... خدا کی قسم میں.....“

”چار روز پہلے یہاں تو قیامت گزر گئی، بوبی۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ”تم کھل کر بات کیوں نہیں کرتیں..... کیا ہوا ہے؟“ میں نے چیختے ہوئے کہا۔

”ہم برباد ہو گئے، تباہ ہو گئے بوبی.....“ وہ دھاڑیں مارنے لگی ”فرشتہ اجل نے سب کو ہم سے چھین لیا۔ چچا جان، چچی جان، مہرین، عنبرین، سب سمندر میں ڈوب گئے۔ وہ موٹر بوٹ پر سیر کر رہے تھے کہ طوفان نے انہیں آ لیا۔ صرف نوشی زندہ بچ گئی، مگر اس کی بھی خبر نہیں کہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ اسے لالچ میں سوار اسمگلر اغوا کر کے پتہ نہیں کدھر لے گئے ہیں صرف یہ پتہ چل سکا ہے کوئی انڈین اسمگلر تھے.....“

”نہیں.....!!!“ میری چیخ سے کمرہ گونج اٹھا۔ فون میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میں شدت غم سے سینہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”نہیں..... یہ جھوٹ ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ چپون تم ایسا بھیا نک انتقام نہیں لے سکتیں..... اوہ! میرے خدا!“ میں بے اختیار رو پڑا اور پچھاڑیں کھانے لگا۔

میں نے جو بھیا نک خواب دیکھا تھا وہ سچ ثابت ہوا تھا! ضرور یہ چپون کا کیا دھرا تھا۔ اس نے مجھے انتباہ کیا تھا کہ میں اس کی دوستی اور محبت کا ہاتھ جھٹک کر دشمنی نہ خریدوں، مگر میں نے اسے بری طرح دھتکار دیا تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے اپنے انتقام کا نشانہ بنا ڈالا تھا۔ میری پیاری اور چہیتی بہن نوشین کو بھی اسی نے جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھوں اغواء کروا ڈالا تھا۔ اسے زندہ رکھنے کا مقصد سوائے اس کے کیا ہو سکتا تھا کہ میں اس کی بازیابی کیلئے چپون کی منت سماجت کروں اور اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں؟

جو حادثہ پیش آیا تھا وہ غم کا ایک کوہ گراں تھا جسے اٹھانے کی مجھ میں سکت نہ تھی۔ میرے آنسو تھننے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ سینہ دکھ سے بھر گیا تھا۔ ذہن ماؤف تھا اور مجھے کچھ بھائی نہیں دیتا تھا کہ کیا کروں؟ دیار غیر میں کوئی اپنا بھی نہ تھا کہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو سکوں اور اپنا غم ہلکا کروں۔ پوجا سے میں اپنا دکھ بانٹ نہیں سکتا تھا۔ اس سے میں نے جھوٹ بول رکھا تھا کہ میں ایک ہندو نو جوان ہوں اور میرا نام وجے ہے۔ وہ مجھے اسی حوالے سے جانتی تھی۔ اس سے میں کیا کہتا؟ چنانچہ میں اپنے کمرے میں مقید ہو گیا اور تکیے میں منہ چھپا کر روتا رہا۔ مجھے اب پچھتاوا ہو رہا تھا کہ میں نے ایک لڑکی کی خاطر اپنا گھر بار کیوں چھوڑا تھا۔ اپنے پیاروں کو چھوڑ کر میں نے سوائے دکھوں اور تکلیفوں کے کیا حاصل کیا تھا؟ کاش میں خود کو

تھام کر رکھتا اور آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟

میں دو دن طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر کمرے ہی میں لیٹا رہا۔ ذہن پرسکون رکھنے کیلئے میں نیند کی گولی کھا کر سو جاتا تھا۔ بھوک لگتی تو چند لقمے زہر مار کر لیتا۔ دو ہی دنوں میں میں آدھا ہو گیا تھا۔ گھر والے یاد آتے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔ مرجانے والوں پر تو کچھ نہ کچھ صبر آ گیا تھا، لیکن نوشین کی یاد زندہ درگور کئے دے رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ کہاں تھی اور کس حال میں تھی؟ ناہید نے کہا تھا کہ اسے اغواء کرنے والے انڈین اسمگلر تھے۔ اگر یہ بات درست تھی تو کراچی سے انڈیا کی قریب ترین بندرگاہ اور بڑا شہر ممبئی ہی تھا۔ اسے ان دنوں اسمگلروں کی جنت کہا جاتا تھا۔ ممبئی کو انسانی اسمگلنگ خصوصاً عورتوں کی خرید و فروخت کی ایک بین الاقوامی منڈی کی حیثیت حاصل تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ لوگ اسے ممبئی لے آئے ہوں اور پھر..... اس سے آگے سوچتا تو میرا دماغ سلگنے لگتا تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا کسی طور درست نہیں۔ مجھے فوراً ممبئی جانا چاہیے اور وہاں نوشین کو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگرچہ یہ ریگزار میں سوئی تلاش کرنے کے مترادف تھا، مگر میں اپنی سی کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔

جب ایک بار ذہن بن گیا تو میں بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور اپنا سامان، جو نہایت مختصر تھا، سمیٹنے لگا۔ ابھی پوجا کے معاملات پوری طرح سیٹ نہیں تھے اور میں اس کے سوتیلے چچا کے بارے میں ذہنی تحفظات رکھتا تھا، لیکن نوشین کی بازیابی اور اس کی عزت و حرمت کی حفاظت ان سارے معاملات پر فوقیت حاصل کر چکی تھی۔ مجھے فوری طور پر اس کیلئے کچھ کرنا تھا، ورنہ چپون اسے کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ سامان باندھ کر میں مینجر کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر میں ملازمت چھوڑ رہا ہوں، وہ میرے واجبات کلیئر کر دے۔ مینجر کے لئے میرا یہ اچانک اقدام باعث حیرت تھا، مگر میں نے ادھر ادھر کے عذر تراش کر اسے مطمئن کر لیا۔ اس نے میری تنخواہ اور واجبات مجھے ادا کئے اور پھر اپنے ساتھ الوداعی چائے پینے کی دعوت دی جو میں نے بادل خواستہ قبول کر لی۔ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں پوجا وہاں نہ آن ٹپکے۔ تین دن سے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی نہ فون پر بات چیت ہوئی تھی۔ اس لئے مجھے اس کی آمد کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ خیر غنیمت رہی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور میں ہوٹل سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ایئر پورٹ روانہ ہو گیا۔ آتے ہوئے میں نے اس کے نام ایک مختصر خط لکھا تھا کہ بعض ناگزیر وجوہات اور حالات کے جبر کے تحت میں اس کا شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ زندگی نے وفا کی تو جلد لوٹوں گا۔ وہ پریشان نہ ہو!

☆.....☆.....☆

ممبئی کی زندگی بڑی تیز رفتار تھی۔ کلکتہ کی نسبت وہاں گہما گہمی اور رونق بھی زیادہ تھی، لیکن اس ہنگام



میں میرے لئے کوئی کشش نہیں تھی۔ میری آنکھیں ہر جگہ نوشی کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ میں دیوانوں کی طرح ہر لڑکی کا چہرہ دیکھتا تھا۔ میری اس حرکت پر لوگ مجھے عجیب نظروں سے گھورنے لگتے تھے۔

ممبئی میں میرا قیام باندہرہ کے ایک سستے سے ہوٹل میں تھا۔ یہ ساحلی علاقہ تھا اور جرائم پیشہ لوگوں کا گڑھ۔ اس کا انتخاب میں نے سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ان لوگوں کے بچ رہ کر مجھے نوشی کو تلاش کرنے میں آسانی ہو سکتی تھی۔ باندہرہ کے علاقے کا نقشہ ان دنوں کچھ یوں تھا کہ ساحل کے ساتھ ساتھ اونچی نیچی خستہ حال عمارتوں کے پہلو بہ پہلو ماہی گیروں کے جھوپڑے، گودی پر مزدوری کرنے والوں کے نیم پختہ گھر وندے اور ٹیڑھے میڑھے تنگ بازار دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہیں کشتیاں مرمت کرنے کی ورکشاپیں، کباڑ خانے، گودام اور مال بردار ٹرکوں کے اڈے بھی تھے۔ سستے ہوٹل، جوا خانے، ناچ گھر، قحبہ خانے اور منشیات کے اڈے برسات کی کھمبیوں کی طرح جگہ جگہ اگے ہوئے نظر آتے تھے۔ میری روٹین یہ بن گئی تھی کہ صبح ناشتہ زہر مار کر کے ہوٹل سے نکلتا اور آدھی رات کے بعد واپس لوٹتا۔ اس دوران میں مذکورہ بالا جگہوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ جوا خانوں، منشیات کے اڈوں، کلبوں، ہوٹلوں اور قحبہ خانوں میں ملکی اور غیر ملکی لڑکیوں کی بھرمار تھی، جو جسم فروشی کا دھندہ کرتی تھیں۔ کلبوں اور جوا خانوں میں انہیں بطور فلورڈ انس رکھا جاتا تھا۔ منشیات کے اڈے انہیں سپلائر کے طور پر استعمال کرتے تھے، جبکہ قحبہ خانے تو تھے ہی اس لئے کہ وہاں بندرگاہ پر لنڈرا انداز ہونے والے ملکی اور غیر ملکی ملاح رات کے اندھیرے میں آئیں اور گناہ کا کھیل کھیلیں۔ دنیا کے اس قدیم ترین پیشے سے وابستہ لڑکیاں اور عورتیں باندہرہ کے بازار میں سرشام سچ سنور کر اپنے چوباروں کی کھڑکیوں میں بیٹھ جاتی تھیں اور سرعام دعوت گناہ دیتی تھیں۔ نیچے گلیوں میں ان کے دلال اور بھڑوے پھرتے تھے جو کمیشن لے کر ان کیلئے گاہک گھیر کر لاتے تھے۔ میں تو اتر سے ان جگہوں پر جاتا اور ہر لڑکی کا چہرہ بغور دیکھا کرتا، مگر ان میں نوشین کہیں نظر نہ آتی۔ ویسے میں دل ہی دل میں دعا کرتا تھا کہ اے خدا وہ یہاں نہ ہو۔ اسے یہاں پا کر میں جیتے جی مرجاؤں گا! لیکن منطق کی رو سے وہ اسمگلر اسے یہیں لا سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کی بازیابی کے حوالے سے مجھ پر مایوسی غالب آنے لگی۔ ادھر پیسے ختم ہو گئے تو میں نے اونے پونے اپنا سامان بیچ دیا۔ وہ پیسے بھی ختم ہو گئے تو ہوٹل سے بندرگاہ کے ایک پرانے شید میں منتقل ہو گیا۔ میں دن بھر سڑکوں پر جوتے چٹختا پھرتا تھا۔ میرے پاس صرف تن کے کپڑے رہ گئے تھے جو رفتہ رفتہ اتنے میلے ہو گئے کہ خود مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ ممبئی میں میرا کوئی شناسا نہ تھا۔ اس حلیے میں کسی نے مجھے ملازمت کیا دینی تھی؟ نتیجہ یہ نکلا کہ فاقوں کی نوبت آ گئی۔ زیادہ بھوک لگتی تو مزدوری کی ٹوکری اٹھا لیتا جس سے چند پہر گزر جاتے۔ اس حالت میں میں نے کلابہ مالا بارمل، ٹرام بے اندھیری اور ماہم کے علاقے بھی دیکھ ڈالے مگر نوشین کا کچھ سراغ نہ ملا۔ ایک روز مجھے آٹھ پہر کا فاقہ تھا۔ ساتھ میں بخار بھی تھا۔ زندگی سے بے زاری محسوس ہونے لگی۔ میرے

مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ چپون نے اس کا کیا حشر کیا ہے؟ خود میں اس کا بے زنجیر قیدی بن گیا تھا۔ اس نے میری رگوں میں زہر اتار دیا تھا۔ زندگی عملاً ایک جہنم بن چکی تھی۔ میں نے اس جہنم جیسی زندگی سے نجات حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ سمندر شید سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں پاؤں گھسیٹا ایک اونچی چٹان پر جا چڑھا اور ایک آخری نگاہ اپنے چاروں طرف دوڑائی۔ ہر سوشام کا ملگجا اندھیرا چھا چکا تھا۔ کائنات بھی سوگوار ہو گئی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور پھر اپنا بوجھ لہروں کے حوالے کرنے کے لئے جست لگانے کا ارادہ کیا۔ عین اسی لمحے کس نے لپک کر مجھے کمر سے پکڑا اور پیچھے کھینچ لیا۔

”ارے یہ کیا کرنے لگا تھا سالا! سوئی سائیڈ؟ ویری بیڈ..... جانتے نہیں سوئی سائیڈ حرام ہے۔ گاڈ اس سے بہت اینگری ہوتا ہے.....“ ایک بھاری آواز سنائی دی۔

”چھوڑ دو! چھوڑ دو مجھے.....!“ میں نے مچلتے ہوئے کہا ”مجھے مرجانے دو..... میں زندہ نہیں رہنا چاہتا!“

”وائی؟ لائف تو گاڈ کا بہت بڑا گفٹ ہے۔“ وہ جو کوئی بھی تھا، مجھے کھینچتے ہوئے پرے لے جانے لگا۔

”میرے لئے زندگی گفٹ نہیں، کانٹوں کا بستر ہے۔ دکھوں کا گھر ہے۔ ایک مسلسل آزار۔ میں یہ آزار مزید برداشت نہیں کر سکتا!“ میں نے تیزی سے کہا اور اس سے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کی مگر وہ مجھے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ میں نے اندھیرے میں محسوس کیا کہ وہ چھوٹے قد اور گھٹے ہوئے جسم کا مزدور پیشہ آدمی ہے۔ لہجے سے اینگلو انڈین لگتا تھا۔

”او یو بلڈی کا ورڈ! ادھر ممبئی میں اکھا لوگ سکھی ہے کیا؟ ہاف ملین اوگ فٹ پاتھ پر سوتا ہے۔ ایک وقت کی روٹی کو ترستا ہے۔ کیا وہ سب سوئی سائیڈ کر لیتا ہے؟ تم یگ مین ہو کر ایسا بزدلی کی بات کرتا ہے۔ نان سنس! ہٹو اور..... اور وائز تم جانی کو نہیں جانتا.....“

”تم غلط سمجھ رہے ہو.....“ میں نے اس کی تقریر کے جواب میں بے زاری سے کہا ”میرا مسئلہ غربت نہیں، کچھ اور ہے۔ میرا مسئلہ تم نہیں سمجھ سکتے!“

”تم اپنا مسئلہ جانی سے بیان تو کرو، سویٹ ہارٹ۔ جانی تمہاری ہیلپ کریں گا۔“ وہ خلوص سے بولا

”حالات سے گھبرا کر تمہارے جیسا یگ مین سوئی سائیڈ کر لے جانی کو یہ بات ایکسپٹ نہیں ہے!“

”تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو اپنی راہ لو.....“ میں نے ترشی سے کہا۔ ”مجھے تمہاری ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں۔“



رہا اور آخر مجھے رام لرنے میں کامیاب ہوئی کیا۔ میں پاؤں صیبتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے لگا۔ چار پانچ سو گز دور سڑک تھی اور وہاں اسٹریٹ لائٹ تھی۔ لائٹ کے نیچے پہنچے تو میں نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا۔ وہ ٹھکنے قد کا فربہ مائل شخص تھا۔ عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ جسم پر میلا سا کوٹ تھا اور سر پر ایک پرانا ہیٹ۔ اس کی سیاہی مائل پینٹ خاصی ڈھیلی تھی۔ پاؤں میں اس نے پرانے مرمت شدہ بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس تمام ترکیبیں کے باوجود اس کی زندہ دلی قابل رشک تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بڑی سے بڑی بات ہنس کر ٹال دینے کا عادی ہے۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں میری غم گساری کرتا رہا۔ میں نے اسے راستے میں بتا دیا تھا کہ میرے سب گھر والے سمندر میں ڈوب کر مر گئے ہیں اور صرف ایک بہن زندہ بچی ہے جسے اسمگلروں نے اغواء کر لیا ہے اور غالباً ممبئی لے آئے ہیں۔ تاہم میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں پاکستانی ہوں۔ میں نے خود کو جونا گڑھ کے ساحلی قصبے پور بندر کا رہنے والا ظاہر کیا تھا۔ یہ علاقہ کراچی کے قریب ہندوستان میں واقع ہے۔

”لائف بس ایسا ہی ہے سویت ہارٹ۔“ وہ مجھے سمجھانے لگا ”نیچر انسان کے ساتھ خوف ناک مذاق کرتی ہے۔ ایک دم باری بل جوک۔ انسان کو چاہیے کہ جواب میں سالادہ بھی اسے ٹھیکہ دکھا دے۔ اف یو اسکمی۔ ہم دونوں کی کنڈیشن آل موسٹ ایک جیسی ہے بس اتج کا فرق ہے۔ تم سالاینگ ہے۔ ہم پرانے ماڈل کی پھٹچر موٹر ہے!“ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ چلتے چلتے ہم بازار پہنچ گئے۔ وہ مخلص اور عجیب وضع کا شخص مجھے چائے پلانے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے مجھے گرم چائے کے ساتھ بن بھی کھلائے۔ پیٹ میں کچھ پڑا تو حواس ٹھکانے معلوم ہونے لگے۔ چائے نوشی کے دوران اس نے مجھ سے میرے ٹھکانے کے بارے میں پوچھا اور پھر میرا جواب سن کر فیصلہ صادر کر دیا کہ میں آئندہ اس کے ساتھ رہوں گا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا

”ویسے ہاؤ اسٹریج!“ وہ ایک دم ہنسنے لگا ”ہم دونوں میں فرینڈ شپ بھی ہوئی، لیکن اپن نے تم سے تمہارا نام بھی نہیں پوچھا!“

”مجھے تم بولی کہہ کر بلا سکتے ہو۔ ویسے میرا پورا نام محبوب احمد خان ہے“ میں نے جواب دیا۔

”میرا نام جان نائیڈو ہے۔ آئی ایم اینگلو انڈین۔“

”وہ تو تمہارا لہجہ ہی بتا رہا ہے۔“

”چلو اب ہم اپنے کالج چلیں۔ وہاں ٹو نائٹ ہم پارٹی کریں گے اس فرینڈ شپ کی خوشی میں.....“ یہ کہہ کر وہ ٹیبل سے اٹھ گیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گوداموں کے آخر میں ایک کچرا گھر تھا جو دو تین کنال رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے کونے میں ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی نظر آئی جس کی آدھی ٹین کی چھت زنگ آلود ہو چکی تھی۔ وہ مجھے اس کے اندر لے گیا۔ یہ اس کا ”کالج“ تھا.....!“

فائیو ایر سے اپن یہاں ایلون رہتا ہے“ اس نے لاسین جلاتے ہوئے خر سے کہا ”آج تک اپن نے کسی اور کو یہ کالج آ کو پائی نہیں کرنے دیا!“

”کوئی اور اسے کیوں آ کو پائی کرے گا؟“ میں نے اس کے دیوار و در کی خستہ حالی پر نگاہ ڈالتے ہوئے قدرے تمسخر سے کہا۔

”تم ممبئی شہر کو نہیں جانتا اس لئے یوں بولتا ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا ”ایدر تو فٹ پاتھ پر قبضہ کرنے کے لئے لڑائی ہوتی ہے۔ بلڈی وار!“ مجھے محسوس ہوا کہ میری بات کا اس نے برا منایا ہے۔

”میں تو مذاق کر رہا تھا تم شاید برامان گئے.....“ میں نے اسے منانے کے لئے کہا۔

”ارے نہیں سویت ہارٹ!“ وہ ہنس پڑا ”بس کالج کے بارے میں تمہارا فرینڈ تھوڑا بچی ہے!“ یہ کہہ کر اس نے مجھے ایک پھٹے ہوئے اسٹول پر بٹھایا جس کے ریکیسن کور سے فوم باہر جھانک رہا تھا۔ ”لو میں تمہارے لئے اب ڈنر تیار کرتا ہوں“ اس نے ایک کونے میں رکھنے برتنوں کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ وہ شاید اس کا ”کچن“ تھا۔ سب سے پہلے اس نے ایک اسٹو و جلا کر فرائی پین اس کے اوپر رکھا اور دو تین انڈے پھینٹ کر سالن بنایا۔ انڈوں میں اس نے باریک آلو کتر کر ڈالے تھے۔ اس کے بعد گتے کے ڈبے سے اس نے آدھی ڈبل روٹی نکالی اور اسٹو پر سلاؤں گرم کرنے لگا۔ سلاؤں اور انڈوں کا سالن ایک بڑی پلیٹ میں ڈالنے کے بعد اس نے مجھے چٹائی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ جو غالباً اس کا بستر بھی تھا۔

”مجھے تھیلے سے سالاد ہنٹر بیف نہیں ملا۔ شاید اسے شومی نے اچک لیا ہے!“ وہ ڈبل روٹی کے سلاؤں پر انڈوں کا سالن ڈالتے ہوئے بولا۔

”شومی کون ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ایک بلی ہے۔ ایدر کچرے پر گھومتی رہتی ہے۔ مجھ سے بہت مانوس ہے۔ نائی اینمل!“

”کھانا تم نے بہت اچھا بنایا ہے۔ تم ایک اچھے کک ہو!“ میں نے اس کی تعریف کی۔

”ارے کہاں!“ وہ ہنسنے لگا ”بس ٹوٹل پورا کرتا ہوں۔ خود بنانا کر پریکٹس ہو گئی ہے!“

ہم دونوں کھانا کھاتے ہوئے اسی طرح ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ کھانے کے بعد اس نے دیسی ٹھرے کی بوتل نکال لی اور مجھے پیش کی مگر میں نے معذرت کر لی۔ اس پر ہنستے ہوئے اس نے بوتل منہ سے لگائی اور فٹ ساری بوتل چڑھا گیا۔ اس کے بعد نشے کی حالت میں وہ اول فول بولنے لگا۔

☆.....☆.....☆

جانی گودی پر مزدور تھا۔ اس نے ٹھیکیدار سے بات کر کے مجھے بھی کام پر لگوا دیا۔ ہم دونوں سارا دن ٹھیکہ کھینچتے، شام کے وقت ٹھیکیدار چند روپے ہماری ہتھیلی پر رکھ دیتا اور ہم سڑکوں پر ہوٹلوں میں وقت گزاری کرتے۔ نوشین کی مجھے اب بھی تلاش تھی اور جانی اس سلسلے میں میرا ساتھ دیتا تھا، لیکن اکثر وہ مجھے



”بونی ڈیئر..... یہ لائف سلا سب ڈرامہ ہے۔ اس میں ہر کریکٹر اپنے ٹائم پر ایئر ہوتا ہے اور پھر سین سے غائب ہو جاتا ہے۔ ہم سب ایکٹر ہیں اور اوپر والا اس سارے ڈرامے کا ڈائریکٹر ہے۔ وہ جیسی اسٹوری چاہتا ہے، پیش کرتا ہے۔ جب ہمارا اسٹوری لکھنے میں کوئی رول ہی نہیں تو ہم سالا، وری کیوں کریں۔ سب کچھ ڈائریکٹر ہی پر کیوں نہ چھوڑ دیں.....!“

حقیقتاً جانی خود ایک نہایت دکھی آدمی تھا۔ قدرت نے اس کے ساتھ بڑے بھیانک مذاق کئے تھے۔ ایک سردرات جب ہم آگ تاپ رہے تھے تو اس نے مجھے اپنے مخصوص انداز میں اپنی درد بھری کہانی سنائی۔ خیال سے میں سادہ اور سلیس اردو میں بیان کروں گا۔

”میں گوا میں پیدا ہوا۔ میرا باپ گھاٹ گھاٹ پھرنے والا ایک انگریز ملاح تھا اور ماں ایک بے سہارا غریب عورت۔ دونوں کی ضرورت انہیں ایک دوسرے کے قریب کھینچ لائی۔ اس تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ آٹھ دس سال تک وہ وقفے وقفے سے اکٹھے رہے۔ پھر میرا باپ مجھے اور میری ماں کو چھوڑ کر واپس اپنے ملک چلا گیا۔ میں بارہ سال کا ہوا تو میری ماں بھی مر گئی اور میں بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ پناہ میں ایک ہوٹل کے مالک نے ترس کھا کر مجھے برتن دھونے کی مزدوری دے دی۔ میں روٹی کے بدلے سارا دن گاہکوں کے چھوڑے ہوئے جھوٹے برتن مانجتا تھا اور رات کے وقت ہوٹل کے کسی کونے کھد رے میں بے سدھ سو جاتا تھا۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ میں اسی نوعیت کی چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے زندگی کی گاڑی کھینچتا رہا، یہاں تک کہ میری عمر انتیس سال ہو گئی۔

”میری جوانی ڈھل رہی تھی اور اب تک میں عورت کی محبت اور اس کے لمس سے نا آشنا تھا۔ عورتوں کو دیکھ کر میرے دل میں بھی گدگدی ہوتی تھی، مگر ان سے بات کرنے کی مجھ میں بالکل ہمت نہ تھی۔ ایک تو میری شکل اور قد بت واجبی تھا، دوسرے غربت کی وجہ سے میرا لباس بھی میلا ہوتا تھا۔ پھر بھلا کوئی لڑکی میری طرف کیسے متوجہ ہو سکتی تھی؟ سچ تو یہ ہے کہ آہستہ آہستہ میرے دل سے یہ خواہش ہی ختم ہو گئی تھی کہ کبھی میری زندگی میں بھی کوئی عورت آئے گی جسے میں اپنا کہہ سکوں گا۔

”لیکن اوپر والے کے کام نرالے ہیں۔ اس نے میری زندگی میں ایک لڑکی داخل کر دی! اس کا نام جولین تھا اور اس سے میرا تعارف میری ایک شناسا خاتون نے کرا دیا تھا، جسے میں بطور احترام مدر مارگریٹ کہتا تھا۔ وہ سائنٹا کروڑ ہاسپٹل میں ہیڈنرس تھی۔ میں ایک دن اس سے ملنے گیا تو اس نے مجھ سے کہا:

”جانی بیٹا جب میں یہ دیکھتی ہوں کہ تمہاری عمر کے نو جوانوں کے تین تین چار چار بچے ہیں تو مجھے تمہاری صورت دیکھ کر بہت ترس آتا ہے کہ تم ابھی تک کنوارے ہو.....!“

جن مدریہ کو قسمت نے میں میں! میں نے آٹھ برس گزرے ہیں نہ صرف غریب اور وابستہ صورت وقامت کا ہوں، بلکہ میری عمر بھی انتیس سال ہو چکی ہے۔ بھلا کوئی لڑکی مجھ سے کیوں شادی پر رضامند ہوگی؟“

مدر مارگریٹ نے میری بات سن کر میری طرف ایسے دیکھا جیسے اس کے سامنے میں نہیں، کوئی بہت ہی احمق شخص بیٹھا ہو۔ کہنے لگیں ”اگر تم غریب ہو تو کچھ لڑکیاں بھی بے آسرا اور بے سہارا ہیں، جنہیں زندگی گزارنے کے لئے کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ کمزور بیل کے لئے معمولی اور ٹنڈ منڈ درخت کا سہارا بھی کافی ہوتا ہے۔ میں ایک ایسی لڑکی کو جانتی ہوں جس کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں اور وہ بھری دنیا میں اکیلی ہے۔ آج کل وہ لوگوں کے گھروں میں صفائی کر کے وقت گزارتی ہے۔ کل میرے پاس آئی تھی اور اپنا دکھڑا سنار ہی تھی۔ تم کہو تو میں اس سے تمہاری شادی کی بات چلاؤں؟ مجھے یقین ہے وہ فوراً مان جائے گی۔ یقین کرو لڑکی اچھی ہے اور خاصی خوبصورت ہے!“

مدر مارگریٹ کی بات سن کر میرے دل میں لڈو پھوٹنے لگے، لیکن مجھے یہ فکر ہو رہی تھی کہ میں اسے رکھوں گا کہاں اور کھلاؤں گا کیسے؟ میں نے فوراً ہی اپنی اس پریشانی کا اظہار کر دیا۔ میری بات سن کر مدر مارگریٹ نے کہا۔

”وکتوریہ روڈ پر ایک فیکٹری کا مالک میرا واقف کار ہے۔ اسے اپنے دفتر کے لئے چڑا سی کی ضرورت ہے۔ میں اس سے بات کروں گی۔ اس فیکٹری کی اپنی کالونی ہے۔ وہ تمہیں معمولی کرائے پر وہاں کوارٹر بھی دے دے گا۔ دونوں آرام سے رہنا۔“

الغرض انہوں نے مجھے پوری طرح گھیر کر وہیں بیٹھے بیٹھے شادی پر راضی کر لیا۔ پھر جب میری اس لڑکی سے ملاقات ہوئی تو میں دل و جان سے اس پر فدا ہو گیا کیونکہ وہ واقعی بہت اچھی اور خوبصورت لڑکی تھی۔ پھر جلد ہی ہماری شادی بھی ہو گئی۔

مدر مارگریٹ نے وعدے کے مطابق مجھے فیکٹری میں نوکری دلادی تھی اور کوارٹر کا بندوبست بھی ہو گیا تھا۔ دو کمرے کا کوارٹر تھا مگر ہمارے لئے کافی تھا۔ اس پرانے کوارٹر کو جولین نے سادگی مگر سلیقے سے سجا کر نہایت اچھا بنا دیا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر اس میں سفیدی کی۔ جولین نے رنگین کاغذوں کے پھول بنا کر گلدان سجائے۔ مقدس صلیب اس نے دروازے کے عین اوپر نصب کی تاکہ بلائیں اس گھر سے دور رہیں۔ جولین بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی اور میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ میں بھی اسے بہت چاہتا تھا۔ حقیقتاً اس نے میری زندگی میں رنگ بھر دیئے تھے۔ میں بہت خوش اور سرشار تھا۔ شادی کا پہلا سال نہایت خوش گوار گزرا۔ پھر زندگی کی تلخ حقیقتوں نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ ہم دونوں میں گھر کے خرچے پر جھگڑے ہونے لگے۔ میری تنخواہ پچاس روپے تھی جس میں ہمارا گزارا



بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ اوپر سے جنگ عظیم کے بعد مرتب ہونے بد اثرات کی بدولت ملک میں کساد بازاری اور مہنگائی کا طوفان آ گیا، جس نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ ایک شام ہم دونوں میں پیسوں پر تکرار ہوئی اور میں نے جو لین کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ اس کے بعد میں غصے کے عالم میں گھر سے نکل گیا۔ رات گئے میں واپس لوٹا تو وہ چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ میں سخت نادم تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا اور رونے لگا۔ وہ بھی رونے لگی۔ ہم دونوں دل شکستہ تھے۔ اسی رات ہم دونوں نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ ہم آپس میں لڑیں گے نہیں بلکہ آمدن بڑھانے کے لئے کوئی عملی قدم اٹھائیں گے۔

جولین آنٹی مارگریٹ سے ملنے جاتی رہتی تھی۔ ایک دن وہ اس سے مل کر واپس آئی تو اس نے مجھ سے کہا ”جانی“ ہم دونوں اپنی قلیل آمدن سے پریشان تھے۔ آسمانی باپ نے ایک سمبل پیدا کر دی ہے۔“ اس کے بعد اس نے بتایا کہ آنٹی مارگریٹ کا ایک رشتہ دار کو لہا پور سے ملازمت کے سلسلے میں گوا آیا ہے۔ وہ گورنمنٹ کوآپریٹو اسٹور میں ملازم ہے۔ جو ہمارے گھر سے ایک میل دور ہے۔ اسے رہائش اور کھانے کا مسئلہ ہے۔ اگر ہم اپنے کوارٹر کا ایک کمرہ اسے رہائش کے لئے دے دیں اور دو وقت کا کھانا مہیا کر دیں تو اس کے بدلے میں وہ ہمیں بیس روپے ماہانہ دینے کو تیار ہے۔ جانی ایک کمرہ ہمارے کوارٹر میں بالکل فالتو ہے۔ باقی جو گھر میں کھانا پکا ہوگا ہم اسے بھی کھلا دیں گے۔ اس سے ہمیں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ بیس روپے اچھی خاصی رقم ہے۔ اس سے ہمارے سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔“ جولین نے مجھے قائل کرنے کے لئے کہا۔

تجویز معقول تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں اضافی رقم مل رہی تھی اس لئے تھوڑی رد و قدح کے بعد میں نے اجازت دے دی۔

”مارٹی..... ہاں یہی اس کا نام تھا“ مجھے پہلی نظر میں ایک معقول نو جوان لگا۔ اس کی عمر بیس اکیس سال تھی۔ خاصا ہنس مکھ اور زندہ دل نو جوان تھا۔ جلد ہی وہ ہمارے ساتھ گھل مل گیا۔ وہ میری عزت کرتا تھا۔ اور جولین کے ساتھ بھی تمیز سے پیش آتا تھا۔ وہ اسے بھابی کہتا تھا۔ اس کے اور ہمارے کمرے کے بیچ ایک دروازہ تھا جسے ہم نے قفل لگا کر بند کر دیا۔ وہ اپنے کمرے میں آنے کے لئے بیرونی دروازہ استعمال کرتا تھا جو برآمدے میں تھا۔ دو وقت کا کھانا جولین اسے اس کے کمرے میں دے دیتی تھی۔ البتہ کبھی کبھار ہم اکٹھے بھی کھانا کھا لیتے۔ ایسے مواقع پر وہ خوب چہکتا اور لطیفے سنا کر ہمیں اتنا ہنساتا کہ ہمارے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ اسی طرح ہمیں اکٹھے رہتے ایک سال گزر گیا۔ اس دوران میرے ہاں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی۔ ہم بیٹا پا کر بے حد خوش تھے۔ مارٹی کو بھی اس کی بے حد خوشی تھی۔ اس نے منے کے لئے ایک اونٹنی سیٹ کا تحفہ دیا۔ اس کا نام بھی اسی نے تجویز کیا تھا۔ وکٹر۔ پھر وہ اسے پیار سے وکی کہنے

لگا اور یہی نام ہم سب کی زبان پر چڑھ گیا۔ میرے اور مارٹی کے اوقات کار میں فرق تھا۔ میں صبح آٹھ بجے کام پر جاتا اور شام چار بجے لوٹتا تھا جبکہ اس کی ڈیوٹی اکثر شام کی ہوتی تھی جو تین بجے شروع ہو کر رات گیارہ بجے ختم ہوتی تھی۔ اس طرح ہماری ملاقات عموماً اتوار والے دن ہی ہوتی تھی، لیکن جولین اور وکی سے وہ دن کے اوقات میں مل لیتا تھا جس کی خبر مجھے جولین سے مل جاتی تھی، کیونکہ وہ اس کے لطیفے اور دلچسپ باتیں اکثر مجھے سناتی رہتی تھی۔ میں نے ان باتوں میں کبھی کوئی منفی پہلو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ مارٹی، جولین کو بھابی کہا کرتا تھا اور مجھے جانی بھائی۔ ویسے بھی اب اسے ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تیسرا سال ہو رہا تھا اور اس نے ہمیں کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا تھا۔ لیکن پھر ہماری زندگی میں ایک ایسا طوفان آیا جس نے سب کچھ تہہ وبالا کر دیا۔

ایک دن میں ڈیوٹی پر تھا کہ دفتر کے سامنے سے فیکٹری کا پلمبر، چھٹن گزرا۔ وہ سارا دن فیکٹری اور کوارٹروں کے نلکے، ٹوٹیاں کسنے کی ڈیوٹی دیتا تھا اور اس سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اس نے مجھے اشارے سے ایک طرف بلایا اور بڑے عجیب لہجے میں بولا ”جانی“ تمہاری میرے بارے میں کیا رائے ہے؟ یعنی میں سچا آدمی ہوں یا جھوٹا اور یہ کہ تم مجھے اپنا خیر خواہ سمجھتے ہو یا بد خواہ؟“

”میری رائے میں تم بہت اچھے اور سچے آدمی ہو اور میں نے تمہیں اپنے بارے میں ہمیشہ خیر خواہی کی بات ہی کرتے پایا ہے۔“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر سنو۔ تم نے اپنے کوارٹر میں مارٹی نام کا جو نو جوان رکھا ہوا ہے اسے فی الفور گھر سے نکال دو۔ میں نے آج صبح اسے تمہاری بیوی کے ساتھ ہم آغوش دیکھا ہے۔!“

”کیا بک رہے ہو!“ میں نے اچک کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ”تمہیں میری بیوی کے بارے میں ایسی واہیات بات زبان سے نکالنے کی جرات کیسے ہوئی!“

”میں تمہاری بیوی کے بارے میں نہیں اس نو جوان کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ پیش قدمی ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتی ہے۔ عورتیں تو کمزور اور بے وقوف ہوتی ہیں جو اس پیش قدمی کی لپیٹ میں آ جاتی ہیں۔!“

”میں تمہارا خون پی جاؤں گا!“ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے اس کا گریبان مروڑنا شروع کر دیا ”تم بہتان تراشی کر رہے ہو“

”میرے خیال میں اب تم مجھ پر زیادتی کر رہے ہو“ اس نے میری کلائی پکڑ کر جھٹکا دیا اور اپنا گریبان چھڑا کر کہا ”اگر میں بہتان تراش ہوں تو خود جا کر محلے کی عورتوں سے تصدیق کر لو جو روزانہ صبح نو سے بارہ بجے دو پہر تک اس عشقیہ ڈرامے کا شوق رکھتی ہیں!“ یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ میری حالت وہ تھی



خدا خدا کر کے چھٹی ہوئی تو میں واپس گھر لوٹا۔ مارٹی کے کمرے پر تالا پڑا نظر آیا۔ وہ کام پر جا چکا تھا۔ جو لین نے والہانہ انداز میں میرا استقبال کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح پیار سے پیش آرہی تھی۔ اس نے میرے نہانے کے لئے غسل خانے میں پانی کی بالٹی بھر کر رکھ دی اور میرے لئے صاف ستھرا دھلا ہوا کرتا پا جامہ نکالا۔ پھر وہ روٹی پکانے کیلئے باورچی خانے میں چلی گئی۔ مجھے اس کی چاہت و محبت دیکھ کر بالکل یقین نہ آیا کہ اس جیسی گھریلو اور اپنے خاوند سے محبت کرنے والی بیوی ایسے گھناؤنے کردار کی مالک بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں چھٹن کو ایک ہزار گالیاں دیں اور کھانا کھا کر سو گیا۔

لیکن جلد ہی مجھ پر واضح ہونے لگا کہ چھٹن غلط نہیں کہتا تھا۔ وال میں کچھ کالا ضرور تھا۔ میں نے کچھ باتیں نوٹ کی تھیں۔ جن سے ان کے خاص تعلق کا پتہ چلتا تھا۔ مثلاً ایک اتوار کی شام ہم کھانا کھا رہے تھے تو اثنائے گفتگو میں مارٹی نے بتایا کہ محکمہ کی طرف سے اسے اسٹور ہی سے ملحق ایک کمرہ آفر ہوا ہے مگر اس نے وہاں رہنے سے انکار کر دیا ہے۔

”بھئی میں یہ گھر چھوڑ کر وہاں کیسے جاسکتا ہوں؟ کیا وہاں مجھے ایسا پیار اور مزیدار کھانے مل سکتے ہیں ہرگز نہیں..... یہ گھر تو میں قیامت تک نہیں چھوڑ سکتا!“

”بس بس یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں.....“ جو لین نے ایک ادا سے اس کی طرف دیکھ کر کہا جسے میں نے صاف محسوس کیا ”اگر آج تمہاری دلہن آجائے تو کل تم یہاں نظر بھی نہ آؤ گے.....“

جواب میں مارٹی شرارت سے مسکرایا اور کچھ کہنے کیلئے لب کھولے مگر پھر شاید اسے میری موجودگی کا احساس ہوا اور وہ چپ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے یہ جملہ کہا ”ہم نے دلہن کیا کرنی ہے.....!“ اور پھر خود ہی ہنسنے لگا۔ جو لین بھی ہنس پڑی تھی۔ حالانکہ اس جملے میں ہنسنے والی کوئی بات نہ تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ پانی واقعی سر سے اونچا ہو چکا ہے..... اور مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا، ورنہ سب کچھ خاک ہو جائے گا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں مارٹی کو اپنے گھر سے نکال دوں گا۔ شام کو مارٹی ہوا خوری کیلئے باہر نکلا تو میں بھی تھوڑی دیر بعد بہانے سے گھر سے باہر نکل آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ واپسی پر قریبی بار میں جائے گا اور ایک پیگ ”لال پری“ پیئے گا۔ جو اس کی پسندیدہ شراب تھی۔ چھٹی کے دن وہ اسے ضرور پیتا تھا۔ آٹھ بجے جب میں بار میں بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہا تھا وہ حسب توقع اندر داخل ہوا۔ مجھے وہاں بیٹھا دیکھ کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی اور وہ سیدھا میری میز پر آ گیا ”حیرت ہے میں آج شریف النفس جانی کو اس بدنام جگہ بیٹھا دیکھ رہا ہوں!“ اس نے مجھ سے کہا۔

”زمانے کے رنگ بدل رہے ہیں مارٹی“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”شریف لوگ شراب خانوں میں آ بیٹھے ہیں جبکہ بد معاشوں نے شریفوں کے گھروں کا رخ کر لیا ہے!“

”باہر آؤ.....“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا اور اسے ملحقہ نیم تاریک گلی میں لے گیا۔ گلی بالکل سنسان تھی ”میں تم سے صرف ایک بات کروں گا اور وہ تمہارے لئے کافی ہونی چاہیے“ میں نے سرد لہجے میں کہا

”میرے گھر سے دفع ہو جاؤ اور دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔“

”جانی بھائی لگتا ہے آپ کو میرے بارے میں ضرور کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے.....“ اس نے جلدی سے کہا۔

”مت کہو مجھے بھائی.....“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا ”بھائی بھی کہتے ہو اور میری بیوی پر ڈورے بھی ڈالتے ہو؟“

یہ سن کر اس نے گہرا سانس چھوڑا۔ پھر نہایت ڈھٹائی اور بے حیائی سے بولا۔ ”اگر تمہیں پتہ چل ہی گیا تو سنو۔ ڈورے میں نہیں ڈال رہا بلکہ وہ خود تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اسے تمہاری ڈھلتی جوانی کی نہیں، میری مچلتی جوانی کی ضرورت ہے۔ تم نے مجھے گھر سے نکالا تو وہ بھی میرے پیچھے بھاگ آئے گی، سمجھے!“

”او بے غیرت! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں میری بیوی کے بارے میں بدزبانی کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔“ میں نے چیخ کر کہا اور ایک دم نیفے سے رام پوری چاقو نکال کر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ پے درپے وار کر کے میں نے اس کی آنتیں باہر نکال دیں۔ وہ بری طرح ڈکارا، چیخا، تڑپا، مگر میں نے اس وقت تک اسے نہیں چھوڑا جب تک وہ ٹھنڈا نہیں پڑ گیا! اسی لمحے میرا جی چاہا کہ گھر جاؤں اور جو لین کا کام بھی تمام کر دوں مگر پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ میرے معصوم بچے کا کیا قصور۔ اسے ماں کی ضرورت ہے۔ ماں کو زندہ رہنا چاہیے۔ مارٹی کی چیخ و پکار لوگوں تک پہنچ گئی تھی۔ شور سن کر لوگ وہاں دوڑے آئے۔ کسی نے قریبی تھانے میں فون کر دیا۔ پولیس آئی اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ چلا تو مجھے عمر قید کی سزا ہوئی اور مجھے گواسنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ جو لین اپنے کئے پر پشیمان تھی اس لئے میں نے اسے کبھی عار نہیں دلائی۔ وہ جیل میں مجھ سے ملنے آتی تھی اور ہر وقت روتی رہتی تھی۔ میں نے اسے کبھی کچھ نہیں کہا۔ اس کی پشیمانی دیکھتے ہوئے میں نے دوران مقدمہ یہ موقف اختیار کیا کہ مارٹی سے میرا پیسوں کے لین دین پر جھگڑا ہوا گیا تھا اور میں نے اشتعال کی حالت میں اسے قتل کر دیا۔ درحقیقت میں نے جو لین سے سچی محبت کی تھی۔ اس کی بدکرداری کا چرچا کر کے میں اسے رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

عمر قید ہو جانے کے بعد فیکٹری میں میری نوکری ختم ہو گئی تھی۔ فیکٹری والوں نے جو لین سے کواریٹ بھی خالی کروا لیا۔ چنانچہ وہ مدر مارگریٹ کے پاس چلی گئی اور اس کے ساتھ رہنے لگی۔ دو سال بعد مدر



مارگریٹ کا انتقال ہو گیا تو وہ وہی کو لے کر شولا پور چلی گئی، جہاں اسے ایک ہوسٹل میں آیا کی نوکری مل گئی تھی۔ شولا پور، گوا سے بہت دور تھا۔ جولین کیلئے وہاں سے مجھے ملنے آنا دشوار تھا اس لئے میں نے اسے جیل آنے سے منع کر دیا۔ ویسے بھی وہی اب بڑا ہو رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے ملنے جیل آئے اور اس کے ذہن پر اس کا کوئی برا اثر مرتب ہو۔ جولین مجھے خط لکھ دیتی تھی جس سے مجھے اس کی خیریت کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ وہ اپنے خطوط میں وہی کے بارے میں بھی لکھتی تھی کہ اب وہ کتنا بڑا ہو گیا ہے اور کیسی دلچسپ باتیں کرتا ہے۔ وہ اس کی شرارتوں کا تذکرہ بھی کرتی تھی۔ جنہیں پڑھ کر میرا دل اداس ہو جاتا تھا۔

دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے مجھے جیل میں سترہ سال بیت گئے۔ اب میری رہائی کا وقت قریب تھا۔ میں بے تابی سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا۔ زندگی کے بارے میں میری اب کوئی خواہش تھی تو بس یہی کہ اب اپنے جوان بیٹے کے سہارے زندگی کے باقی دن سکھ سے کاٹوں اور اپنے پوتے کھلاؤں۔ جولین کا مجھے ایک خط آیا۔ وہ میری رہائی پر مجھے لینے آنا چاہتی تھی، مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ میں نے اسے لکھا کہ وہ شولا پور کے ریلوے اسٹیشن پر میرا استقبال کرے اور وہی کو بھی ساتھ لائے۔

آخر خدا خدا کر کے میری رہائی کا دن آ گیا۔ جیلر نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ اس سے میری دیرینہ آشنائی تھی۔ پندرہ برس پہلے وہ اس جیل میں بطور ٹرینی آفیسر آیا تھا اور چھ ماہ جیل میں متعین رہا تھا۔ اسے اس وقت کسی طرح میرے ہاتھوں مارٹی کے قتل کی اصل وجہ معلوم ہو گئی تھی۔ تب اس نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے اس آدمی کو قتل کر کے اپنی زندگی خراب نہیں کرنی چاہیے تھی بلکہ بیوی کو طلاق دے کر اس سے اپنا بچہ چھین لینا چاہیے تھا اور کسی دوسری عورت کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہیے تھا۔ اب جبکہ میں اپنی قید کاٹ کر رہا ہو رہا تھا وہ ایک بار پھر جیلر کی حیثیت سے یہاں تعینات تھا۔ آخری ملاقات میں اس نے مجھے پہچان کر باقی زندگی کے لئے نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا اور تلقین کی کہ ماضی کو بھول کر نئی زندگی شروع کروں۔

جیل سے نکلا تو باہر کی فضا عجیب لگی۔ پورے سترہ سال بعد مجھے رہائی نصیب ہوئی تھی۔ جیل کی زندگی کیسی عذاب ناک ہوتی ہے یہ صرف وہی سمجھ اور محسوس کر سکتے ہیں جنہیں کبھی پس دیوار زنداں رہنے کا اتفاق ہوا ہو۔ آزاد فضا میں سانس لینے والا شخص اس کرب کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتا جس کا سامنا قیدی کرتے ہیں۔ بہر حال میں شولا پور جانے والی ٹرین پر سوار ہو گیا۔ میرے دل میں اپنے بیٹے وہی کو دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ جب میں جیل گیا تھا اس وقت وہ صرف تین برس کا تھا اور اب وہ بیس برس کا خوب رو جوان تھا۔ جولین خط میں اس کی خوبصورتی اور کڑیل جوانی کی تعریف کرتی تھی لیکن ساتھ ساتھ اشارتاً یہ بھی بتاتی تھی کہ وہ کچھ سرکش اور باغی ہوتا جا رہا ہے۔ میں اسے تسلی دیتا تھا کہ یہ سب سر پر باپ کا سایہ نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ میں آؤں گا تو وہ خود بخود سنبھل جائے گا۔ اسے پریشان ہونے کی ضرورت

نہیں۔ میں سارا راستہ آئندہ زندگی کے منصوبے بناتا رہا۔ میں نے جیل میں لوہے کی ڈھلائی کا کام سیکھا تھا۔ میں چھریاں، چاقو اور دیگر اوزار بنانے میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ میں جیل میں ایک ایسے پراجیکٹ پر کام کر رہا تھا جس میں کام کرنے کی وجہ سے میں نے کچھ رقم بھی پس انداز کر لی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ شولا پور جا کر اپنی بھٹی لگاؤں گا۔

ٹرین غروب آفتاب سے کچھ پہلے شولا پور پہنچی۔ اسٹیشن پر جولین اور وہی مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ جولین کو میں نے کئی برس بعد دیکھا تھا۔ وہ خاصی موٹی اور بھدی ہو چکی تھی۔ سر میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ حوادث زمانہ نے اس کی جوانی اور خوبصورتی کو چاٹ لیا تھا۔ ہم دونوں آمنے سامنے آئے تو وہ رو پڑی۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہاں کی ندائیں تھیں۔ میں نے اسے اس روز صدق دل سے معاف کر دیا۔ جیل کی زندگی انسان کو بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ اس کے اندر ایک ٹھہراؤ اور صبر سا آ جاتا ہے اور وہ دوسروں کو معاف کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ میں نے سوچا ہم سارے ہی خطا کار ہیں۔ ہم میں سے فرشتہ کون ہے؟ ہمیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بجائے آگے دیکھنا چاہیے۔ وہی مجھے گلے لگا کر ملا۔ اس کا ماتھا چومتے ہوئے میری آنکھیں اشکبار تھیں۔ وہ میرے بڑھاپے کا سہارا تھا۔ ہم اسٹیشن سے باہر نکلے تو دور افق پہ سورج ڈوب رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا ”آج میری زندگی کے تاریک دنوں کا سورج ڈوب گیا۔ کل ایک نیا سورج طلوع ہوگا جو ایک نئی اور خوشگوار زندگی کا استعارہ ہوگا۔“

لیکن یہ میری بھول تھی۔ آنے والی زندگی میں بھی میرے لئے خوشی کا کوئی لمحہ نہ تھا۔ اس کا اندازہ مجھے چند ہی دنوں میں ہو گیا۔ میں نے اپنی بھٹی لگائی اور اس پر کام شروع کیا۔ کام چل نکلا۔ میری خواہش تھی کہ وہی میرے ساتھ کام کرے لیکن اسے کام کے نام ہی سے چڑھتی۔ وہ سارا دن آوارہ گردی کرتا اور رات رات بھر غائب رہتا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ جواں کھیلنے لگا ہے اور بری عورتوں کے پیچھے پھرتا ہے۔ ایک دو دفعہ اس نے میری جیب سے پیسے بھی نکالے۔ میں نے اسے سمجھایا تو اس کے کان پر جوں تک نہ رہی۔ میرے لئے اس کا رویہ نہایت تکلیف دہ تھا، لیکن میں نے صبر کیا اور اسے سمجھاتا بچھاتا رہا کہ وہ بری حرکات ترک کر دے۔ اس طرح تین چار ماہ گزر گئے۔ ایک روز شام کے وقت میں بھٹی بند کر کے گھر آیا تو میں نے دیکھا کہ جولین کا منہ سوجا ہوا تھا اور ہونٹ سے خون رس رہا تھا۔ وہ فرش پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں بے تابی سے آگے بڑھا۔

”کیا ہوا جولین؟ کیا ہوا؟“ میں نے اس سے پوچھا ”تمہیں کس نے مارا ہے؟“

”وہی نے!“ اس نے بمشکل یہ کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر اس نے جو تفصیل بتائی، اس سے پتہ چلا کہ وہی زبردستی ماں سے پیسے چھین لیتا تھا اور آوارہ گردی میں اڑا دیتا تھا۔ آج اس نے اسے پیسے دینے سے انکار کیا تو اس نے اسے پیٹ ڈالا۔ جولین کی بات سن کر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔



وہی ہوا جو اس سے پیسٹر ہوا تھا۔ لوگ اٹھتے ہوئے۔ انہوں نے مجھے آلہ لٹسمیت پکڑا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ جو لین اس صدمے کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئی۔ مجھ حراما نصیب پر دوبارہ مقدمہ چلا اور مجھے موت کی سزا سنائی گئی، جو بعد میں عمر قید میں بدل گئی۔ ایک بار پھر میں اسی جیل میں منتقل ہو گیا، جہاں پہلے سزا کاٹی تھی۔ جیلر کو میری دوبارہ آمد کا علم ہوا تو وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے تاسف بھرے لہجے میں استفسار کیا کہ میں نے اب قتل کیوں کیا تھا؟ میں نے اسے ساری بات سچ بتادی۔ میری بات سن کر اس نے کہا۔

”تم نے ایک ہی عورت کے لئے دوبار قتل کیا جانی اور اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ زندگی اتنی ارزاں چیز نہیں کہ انسان ان کی خاطر اسے داؤ پر لگا دے جو کبھی بھی اس کے وفادار نہ رہے ہوں۔“

میں خاموش رہا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ محبت کرنے والے کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کے محبوب نے انہیں کیا دیا؟ وہ اپنی سوچ کے مطابق مجھے نصیحتیں کرتا رہا۔ پھر کہنے لگا ”میں نے سوچ لیا ہے کہ تمہیں زیادہ عرصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں رہنے دوں گا۔ تمہیں اب آزاد فضا میں زندگی گزارنی چاہیے۔ تمہیں آزادی دلانے کے لئے میں ضرور کچھ کروں گا۔“ اور پھر اس نے اپنے قول کو پورا کیا۔ چھ ماہ بعد اس نے مجھے جیل میں ایک ہنگامے کے دوران فرار کروا دیا۔ میں گوا سے بھاگ کر کلکتہ چلا گیا اور وہاں اپنی باقی ماندہ زندگی کے ایام جیسے تیسے گزارنے لگا۔ کلکتہ بڑا شہر تھا۔ اس شہر میں میرے ساتھ ایسے عجیب و غریب اور پر آلام واقعات پیش آئے کہ میں انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہاں کی زندگی سے گھبرا کر ممبئی آ گیا اور اب تمہارے سامنے ہوں.....“

”تمہاری روداد زندگی سن کر مجھے اپنے دکھ کتر لگنے لگے ہیں۔“ میں نے ہمدردی سے کہا۔

”ہر ہیومن بی ایگ کی اپنی اپنی ٹریجڈی ہے مسٹر محبوب!“ وہ آہ بھر کر بولا ”یہ جولا ف ہے ناسالی“ مجھے تو یہ نیچر کا کوئی جوک لگتا ہے۔ اس لئے اپنا تواب یہ پرنسپل بن گیا ہے کہ زندگی کو ٹھینکا دکھاؤ۔ ڈھیٹ بن کر زندگی گزارو۔ یہی رائٹ اپروچ ہے“

”نام کیا ہو گیا ہوگا؟“ میں نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔

”اپن نے رسٹ وائچ کا کبھی تردد ہی نہیں کیا۔ اپن نے سالی کون سی میٹنگ اٹینڈ کرنی ہوتی ہے!“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ پھر ایک کونے سے ٹھرے کی بوتل اٹھا کر منہ کو لگالی ”بہت تیز ہے سالی!“ بڑا سا گھونٹ لینے کے بعد وہ کھانتے ہوئے بولا ”لو گے کیا؟“

”نہیں.....!“ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس لمحے نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

میں نے سوچا ان درواپن آئے۔ میں اس آوارہ مزدور سیدھا مزدوروں کا۔ رات دیر تک میں اس کا انتظار کرتا رہا مگر وہ گھر واپس نہیں لوٹا۔ قریب ہی ایک سینما تھا۔ مجھے سگریٹ کی طلب ہوئی تو میں گھر سے نکلا اور سینما کی طرف چلا گیا۔ آخری شو ٹوٹنے والا تھا اور سینما کی دکانیں ہنوز کھلی تھیں۔ میں کھوکھ سے سگریٹ لے رہا تھا کہ وہی مجھے سینما ہال سے نکلتا دکھائی دیا۔ وہ اس وقت اکیلا تھا۔ جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو میں نے اسے گلی میں روک لیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کیلئے ٹھٹھا مگر پھر یوں لا پرواہی سے کھڑا ہو گیا جیسے میں اس کا نہیں بلکہ وہ میرا باپ ہو۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اس سے باز پرس کے انداز میں کہا۔

”وکی تم نے آج اپنی ماں پر ہاتھ اٹھایا؟ تمہیں چل کر اس سے معافی مانگنی ہوگی ورنہ.....“

”ورنہ کیا.....؟“ وہ تنک کر بدتمیزی سے بولا۔

”ورنہ میں تمہیں گھر سے نکال دوں گا۔ میں تمہاری آوارہ گردی سے تنگ آچکا ہوں“

”مت کرو مجھے نصیحتیں.....!“ وہ حقارت سے بولا ”رہا گھر سے نکالنے کا سوال تو میں خود ایسے گھر میں

نہیں رہنا چاہتا جہاں ایک سزایافتہ قاتل اور ایک آوارہ عورت رہتی ہو.....!“

اس کا یہ جملہ سن کر میرے ذہن میں بھونچال آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سامنے وہی نہیں سترہ سال پہلے کا آوارہ مزاج نو جوان مارٹی کھڑا ہو۔ واقعی اس وقت وہ بالکل اس جیسا لگ رہا تھا اور میں نے اس کی گردن پر دائیں جانب ایک موٹا سا تل بھی دیکھا جس پر اس سے پہلے میری نظر نہ پڑی تھی۔ مارٹی کی گردن پر بھی بالکل اسی جگہ تل تھا۔ اس لمحے یکنخت مجھ پر یہ بھیاں نک انکشاف ہوا کہ جسے اب تک میں اپنا بیٹا سمجھتا تھا وہ درحقیقت اس بد معاش مارٹی کا بیٹا تھا۔ یعنی میرے دشمن کا ناجائز بچہ! یہ عقدہ کھلتے ہی میرا خون کھول اٹھا۔ میں عادتاً اپنے ساتھ ایک شکاری چاقو رکھتا تھا جو میں نے دو ماہ پہلے اپنی بھٹی پر ڈھالا تھا۔ میں نے نیفے میں ہاتھ ڈال کر وہ چاقو نکالا اور اس کے پیٹ میں گھونپ دیا!

”حرام زادے تجھے میری بیوی پر ہاتھ اٹھانے کی جرات کیسے ہوئی!“ میں نے چیخ کر کہا ”تیرے باپ نے اسے پامال کیا تھا اور تو اس پر ہاتھ اٹھاتا اور اسے آوارہ کہتا ہے..... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا!“

وہ بہت چیخا، چلایا مگر میں نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کا کام تمام نہیں ہو گیا اور وہ اپنے باپ کے پاس نہیں پہنچ گیا.....!“

”تمہاری کہانی نے آزدہ کر دیا جانی.....“ اس کی کہانی کے اس موڑ پر میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ اب تک میں دم سادھے اس کی کہانی سن کر رہا تھا اور وہ اپنی گھمبیر آواز میں وہ عبرت اثر داستان سنارہا تھا۔

”پھر کیا ہوا؟“ میں نے سوال کیا۔



ہمیں ساتھ رہتے ہوئے سات آٹھ مہینے لڑے تھے۔ اس دوران میں اور جانی بھائی کے دوست بن گئے تھے۔ اس کی زندہ دل طبیعت نے عمروں کا فرق مٹا ڈالا تھا۔ اس کی معیت میں مجھے غربت کی یہ زندگی اتنی بری نہیں لگتی تھی۔ کرسس آئی تو وہ مجھے اصرار کر کے ایک شراب خانے میں لے گیا۔ میں کبھی کبھار ہی پیتا تھا اور وہ بھی اس کے اصرار پر۔ وہاں پہنچ کر اس نے مجھے اس حد تک مجبور کر دیا کہ اس کا دل رکھنے کی خاطر مجھے بھی شراب کے کچھ گھونٹ حلق سے اتارنے پڑے۔ اس کے بعد وہ ترنگ میں گاتا اور قہقہے لگاتا ہوا مجھے ممبئی کے بازار حسن لے گیا۔

بازار حسن کی رونقیں شباب پر تھیں۔ جانی اپنے خستہ لباس کے باوجود کسی شہزادے کی طرح اکڑا کر چل رہا تھا۔ اس نے چار لبالب جام چڑھائے تھے۔ آدھا پیگ میں نے بھی انڈیلا تھا۔ مجھ پر نشے کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا، مگر وہ آسمان پر اڑ رہا تھا۔ اس وقت وہ کوئی فاتح بادشاہ نظر آتا تھا جو اپنے مفتوحہ علاقے میں تمکنت سے داخل ہو رہا ہو۔ شراب خانے سے نکلتے ہوئے بوتل اس کے بوسیدہ کوٹ کی جیب میں تھی، جس میں اب شاید چند قطرے ہی بچے ہوں گے۔

چلتے چلتے ہم ایک پر رونق چوک میں پہنچ گئے۔ یہ اس بازار کا دل معلوم ہوتا تھا۔ نیچے جی سجائی دکانیں تھیں اور اوپر بالا خانے۔ بالا خانوں کی روشن کھڑکیوں میں حسین و خوش ادا نازنینیں مسکرا مسکرا کر تماش بینوں کو اشارے کر رہی تھیں۔ زرق برق لباس، بل کھاتی زلفیں، دہکتے رخسار، گلابی ہونٹ، شریر غزالی آنکھیں، چمکتے زیور، کھنکھتی چوڑیاں، عشوے، ادائیں، چہلیں، چہچہے اور قہقہے..... غرض ہر نظارہ شوق کی ارزانی تھی۔ کسی جھروکے سے گھنگھروں کی چھنا چھن سنائی دے رہی تھی تو کہیں سے طبلے اور ہارمونیم کی آوازیں آرہی تھیں۔ کہیں کوئی مغنیہ نغمہ سرائی تو کسی جگہ ستار کے تاروں سے سرنگیت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ نیچے ہر عمر اور ہر ڈھب کے تماش بین تھے جو اس ماحول کی رنگینی میں مست و سرشار، کچھ دلالوں کے توسط سے اور کچھ براہ راست مائل بہ کرم حسیناؤں سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھے۔ پنواڑیوں، پھول بیچنے والوں اور عطاروں کی دکانوں پر بے تحاشا رش تھا۔ چائے والوں کی بھی چاندی تھی۔ ہم ایک جگہ رکے تو سامنے پنواڑی کی دکان سے ایک چونتیس پینتیس سالہ دبلا پتلا شخص تیزی سے چل کر ہمارے قریب آیا اور بے باکی سے بولا۔

”لگتا ہے پورے بجا میں آپ کو اپنے مطلب کی کوئی چیز نہیں آئی.....“

”ارے تو پھر کوئی ڈال دکھاؤ نا.....“ جانی جھومتے ہوئے بولا۔

”اوپر ثریا بانی کا چوبارہ ہے ماسٹر..... اس کے پاس ایک پوٹ چھو کری ہے۔ نئی ہے پر کمال کی چیز ہے۔“

”اوپر سیڑھیاں تو چڑھو پیسے پورے نہ ہوئے تو جو چور کی شجادہ کمار گرو کی شجا!“

جانی نے اس کی بات سن کر میرا ہاتھ تھاما اور مجھے اوپر سیڑھیوں کی طرف گھسیٹنے لگا۔ میں نے یونہی پوچھ

لیا ”جانی بھائی جیب میں مال کتنا ہے؟“

”ہم سالا اس وقت کنگ ہے۔ پاکٹ ایسوسی ایشن سے فل ہے۔ دھماکا کریں گا سویٹ ہارٹ، کم آن“

ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے۔ جس وقت ہم اندر داخل ہوئے، دکان بھی ہوئی تھی اور محفل پورے شباب پر تھی۔ طبلے پر طبلے کے ہاتھ جوش و خروش سے پڑ رہے تھے اور ہارمونیم نواز اک عالم مستی میں سرساز چھیڑ رہا تھا۔ ان کے درمیان ایک نوخیز لڑکی جالی کا نقاب اوڑھے ناچ رہی تھی۔ عقب میں ایک مغنیہ نغمہ سرائی۔ ہر ایک کی نظریں نوخیز رقاصہ پر جمی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا سبھی اس کے چہرے سے نقاب اٹھنے کے منتظر ہیں۔ میں نے ایک جانب ایک صحت مند اور گوری چہتی نائیکہ کو دیکھا جو بڑے ٹھسے سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے سازندوں کے قریب بیٹھی تھی۔ اس نے منہ میں گوری ٹھونس رکھی تھی۔ ہم دونوں نے بیٹھنے کیلئے جگہ تلاش کی اور ایک ستون کے قریب بیٹھ گئے۔ اس وقت رقاصہ اپنا رخ موڑے قدرے جھک کر ایک تماش بین کے سامنے محور رقص تھی۔ تماش بین نشے کے عالم میں، اپنی انگلیوں میں نوٹ پھنسائے، اس کے چہرے کے آگے نچا رہا تھا۔ رقاصہ نے اک ادا سے اس کی انگلیوں سے نوٹ اچکا اور پھر اٹھ کر جھومتی رقص کرتی ہماری طرف آئی۔ جونہی اس کی زگسی آنکھیں مجھ سے چار ہوئیں، ہم دونوں کو بیک وقت سکتہ ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ بجلی کی تیزی سے پٹی اور سازندوں کو پھلانگی بالکونی کے پاس جا پہنچی۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا، اس نے کھلی کھڑکی سے نیچے بازار میں چھلانگ لگا دی۔ میں چیختا چلاتا، دیوانہ وار سیڑھیاں پھلانگتا نیچے بازار میں پہنچا۔ اس وقت تک نیچے لوگوں کا مجمع لگ چکا تھا۔ میں ہجوم کو چیر کر اندر داخل ہوا اور لپک کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ لہو لہان ہو چکی تھی۔ سر ایک جانب سے پچک گیا تھا۔

”نوشی..... نوشی!!!“ میں پاگلوں کی طرح چیخا۔

”بوی بھائی میں..... مجھے معاف.....“ ایک لڑکھڑاتی ہوئی آواز اس کے حلق سے نکلی اور اسے خون کی تے آ گئی..... اس نے حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا اور پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ میں نے اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔

☆.....☆.....☆

”نوشی..... میری نوشی! تم نہیں مر سکتیں، تم نہیں مر سکتیں.....“ میں بری طرح چیختے اور پچھاڑیں

کھانے لگا۔ ”ابھی تو میں نے تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھا تھا۔ تمہاری ڈولی کو کندھا دینا تھا۔“

”صبر کرو مائی ڈیئر..... وہ مر چکی ہے۔“ کسی نے افسردگی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ جانی تھا۔

”تم جھوٹ بکتے ہو..... نوشی نہیں مری۔ نوشی سوئی ہوئی ہے..... شش.....!“ میں نے انگلی ہونٹوں پر



رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تنبیہ کی۔ ”شور نہیں کرو جاگ جائے گی۔“  
 ”صدے سے پاگل ہو گیا ہے بیچارہ.....!“ ایک عورت کی زندگی ہوئی آواز سنائی دی۔ پھر بہت سے لوگ ایک ساتھ بولنے لگے۔ میں اول فول بکنے لگا۔  
 ”خود کو سنبھالو سویت ہارٹ..... نہیں سنبھالیں گا تو واقعی پاگل ہو جائیں گا۔ اوگا ڈ! کتنی بڑی ٹریجڈی ہے۔ اس ٹریجڈی نے تو سالا اپن کو بھی رونے پر مجبور کر دیا ہے۔“ جانی مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔ اس کی گریہ زاری سن کر میں بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ پھر یک لخت میرے اندر انتقام کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔

”میں اس کو ٹھے پر کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا!“ میں چیخ اٹھا اور نوشی کو جانی کے حوالے کر کے آندھی و رطوفان کی طرح اس کو ٹھے کی طرف لپکا۔ مجھے سراپا انتقام دیکھ کر میرے سامنے سے مجمع یوں چھٹ گیا جیسے حلوائی کے کپڑا اہلانے سے کھیاں جلیبیوں کے تھال سے چھٹ جاتی ہیں۔ میں آنا فانا سیڑھیاں پھلانگتا اس ہال نما کمرے میں پہنچ گیا جہاں کچھ دیر پہلے محفل رقص و سرود برپا تھی۔ اب وہاں سناٹے کا راج تھا۔ وہاں کوئی نائیکہ تھی نہ مغنیہ۔ سازندے بھی ساز اٹھا کر رنو چکر ہو گئے تھے۔ فرش پر بچھی سلوٹوں بھری چاندنی اور اس پر بکھری گلابوں کی پتیوں کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے وحشیانہ انداز میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ بغلی دیوار میں مجھے ایک دروازہ نظر آیا جو بظاہر بند تھا۔ میں اس دروازے کی طرف لپکا۔ دروازے کو دوسری جانب سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر زور سے اسے کندھا مارا۔ دوسری بار کندھا مارنے سے دروازے کی کنڈی اکھڑ گئی اور دروازہ کھٹاک کی آواز کے ساتھ چوپٹ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی سب سے پہلے میری نگاہ جس عورت پر پڑی وہ نائیکہ تھی۔ وہ پاندان سنبھالے جوتیاں گھسیٹتی دوسرے کمرے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ وہ بری طرح بدحواس اور بوکھلائی ہوئی تھی۔  
 ”یہیں رک جاؤ بائی.....“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”تمہیں اب میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“  
 اور پھر ایک ہی زقند میں میں نے اسے جالیا۔ جب میں نے اس کی گردن اپنے آہنی پنچے میں دبوچی تو وہ بری طرح واویلا کرنے لگی۔

”بچاؤ۔ بچاؤ۔ خدا کے لئے مجھے اس مورکھ سے بچاؤ۔“  
 ”تمہیں اب مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا!“ میں شیر کی طرح دھاڑا۔ ”تمہیں میری معصوم بہن کی موت کا حساب چکانا ہوگا۔ تم نے اس معصوم کو گھنگھر و پہنانے اور اسے سر عام ناچنے پر مجبور کیا..... وہ غیرت والی اپنے بھائی کی صورت دیکھتے ہی بازار میں کود مری۔“  
 ”میں بے قصور ہوں..... میں بے قصور ہوں۔“ وہ ہاتھ جوڑنے لگی۔ ”یقین کرو میں نے اسے اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا تھا۔“

میں نے ایک زنائے دار پھڑاس کے چہرے پر مارا۔  
 ”بیٹیوں کو بھی تم لوگ نچواتے ہی ہو۔ اور کیا کرتے ہو!“ پھر میں نے زور سے اس کا گلا دبایا۔ وہ بری طرح ڈکرانے لگی۔

”بول حرامزادی تم نے اسے کہاں سے حاصل کیا تھا؟ بول ورنہ میں ابھی تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔“ میں نے چیختے ہوئے کہا۔

”اوئے! چھوڑ دے اسے ورنہ تمہاری لاش ہی ادھر سے جائے گی!“ کسی نے میرے عقب میں دھاڑتے ہوئے کہا۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ میرے پیچھے گھٹے ہوئے جسم اور میانہ قامت کا ایک بد معاش کھڑا تھا۔ عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور آنکھوں میں خباثت تھی۔

”سنا تم نے؟“ وہ دوبارہ چیخا۔  
 ”اچھو میری جان! خدا کے لئے مجھے اس موالی سے بچاؤ۔“ نائیکہ نے چلا کر کہا۔ ”نہیں تو یہ ظالم میرا گلا گھونٹ دے گا۔“

”حرام تخم، ہٹو پیچھے.....“ وہ تیزی سے میری طرف لپکا۔ ”عورت ذات پر ہاتھ اٹھاتے تمہیں شرم نہیں آتی.....“  
 ”یہ عورت نہیں ڈائن ہے..... ایسی عورتیں عورت کے مقدس نام پر دھبہ ہیں۔“ میں نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

”چھوڑتا ہے یا.....“ وہ گالیاں بکتا ہوا آگے بڑھا اور ایک جھٹکے سے نائیکہ کو مجھ سے چھڑا لیا۔ میں اشتعال کے عالم میں اس بد معاش کے گلے پڑ گیا۔ ہم دونوں میں گالم گلوچ اور ہاتھ پائی شروع ہو گئی۔ بد معاش مجھے اور میں اسے پیٹنے لگا۔

”مارا سے خوب مار!“ نائیکہ اسے ہلا شیری دینے لگی۔ ”میرا عاشق ہے تو اسے آج جان سے مار دے۔“

”تیرا ہی ہوں ثریا بائی تیرا ہی ہوں۔“ وہ کسی عاشق نامراد کی طرح سوز بھری آواز میں بولا۔ ”تیرے عشق نے کہیں کا نہیں رکھا، مگر ایسا گیا گزرا بھی نہیں ہوں کہ اس چوزے کو ذبح نہ کر سکوں۔“

”تو مجھے کیا ذبح کرے گا بوڑھے سانڈ! ذبح تو تجھے میں کروں گا.....“ میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا اور اڑنگی دے کر اسے نیچے گرا لیا مگر وہ فوراً ہی اٹھ بیٹھا۔ اسی لمحے نائیکہ لپک کر گئی اور کہیں سے بڑے پھل کارام پوری چاقو لے آئی۔ اس نے چاقو اچھو بد معاش کو پکڑا اور بولی۔

”اس حرام تخم کا قصہ چکا ہی دے اچھو ورنہ یہ لونڈیا کے لفرے میں ہمارے لئے مصیبت کا باعث بن



جائے گا.....“

اچھو نے وہ چاقو فوراً اُچک لیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھے چاقو مارتا، میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ہم دونوں میں کشمکش شروع ہو گئی۔ اسی کشمکش اور چھینا چھٹی میں ہم دونوں فرش پر گر گئے اور چاقو اچھو کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ نائیکہ اسے اٹھانے لپکی مگر میں نے وہ چاقو پہلے اٹھا لیا اور عالم وحشت میں ایک دم اسے اچھو کے سینے میں گھونپ دیا۔ وہ کسی بھینسے کی طرح ڈکرایا اور چاقو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ لیکن تیز دھار چاقو اپنا کام کر چکا تھا۔ اس کے سینے سے خون چشمے کی طرح اُبلنے لگا۔ اس کے جسم نے دو چار جھٹکے کھائے اور پھر اس کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی.....!

”ہائے میں مر گئی.....!“ نائیکہ نے سینے پر ہاتھ مار کر پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔ میں بطور انتقام اسے بھی مار ڈالنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے چاقو اچھو کے سینے سے کھینچا اور چیختے ہوئے نائیکہ کے پیچھے بھاگا۔ وہ ”بچاؤ بچاؤ“ پکارتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگ اُٹھی۔ اسی لمحے مجھے بہت سے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ پولیس کے سپاہی تھے۔ ان کے پیچھے لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ لوگ میرے ارادے میں حائل ہو گئے۔ ایک حوالدار میری طرف لپکا اور پستول تان کر کھٹکی سے بولا۔

”ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ ورنہ گولی مار دوں گا.....“ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ ایک سپاہی نے لپک کر مجھ سے چاقو چھین لیا۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ دو پولیس والے آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے ہتھکڑی پہنا دی۔

☆.....☆.....☆

اگلے چھ ماہ کی مختصر روداد یہ ہے کہ مجھ پر دو مقدمے چلے۔ ایک مقدمہ قتل کا تھا جبکہ دوسرے مقدمے میں مجھ پر یہ الزام تھا کہ میں غیر قانونی طور پر بھارت میں داخل ہوا تھا۔ دوران تفتیش پولیس کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی جس نے چو بارے سے چھلانگ لگا کر خودکشی کی تھی، مسلمان تھی اور میری بہن تھی۔ اسے کراچی سے اغوا کر کے ممبئی میں بیچ دیا گیا تھا۔ یوں غیر قانونی طور پر بھارت میں داخل ہونے کے جرم میں مجھے پانچ سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی۔ قتل کے مقدمے میں مجھے پولیس کی مصدقہ شہادتوں اور گواہوں کے بیانات کی روشنی میں سزائے موت سنائی گئی۔

جیل میں جانی مجھے ملنے آتا رہتا تھا۔ وہ میرا واحد دوست تھا۔ اس غریب نے اپنی بساط کے مطابق میری مدد کی۔ نوشین کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری بھی اسی نے نبھائی تھی ورنہ رابطہ کرنے کے باوجود ممبئی میں مقیم کسی رشتہ دار نے میری کوئی مدد نہیں کی تھی۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ جوں جوں پھانسی کا دن قریب آ رہا تھا میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ زندگی کی قدر انسان کو اسی وقت آتی ہے جب یہ نعمت چھنتی نظر آئے۔ میرے سب گھر والے

زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ نوشی بھی مر چکی تھی۔ یوں بظاہر زندگی میں میرے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی، مگر

انسان ہر حال میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا سچ ہے۔ دوسرے میرے سامنے اب بھی ایک مقصد تھا۔ میں ان مجرموں کو تلاش کر کے کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا تھا جنہوں نے نوشی کو اغوا کیا اور ممبئی میں بیچ ڈالا تھا۔ میں اس نائیکہ سروری بیگم سے بھی انتقام لینا چاہتا تھا جس نے نوشی کو گھنگھر و پہنائے اور سر بازار ناچنے پر مجبور کیا تھا۔ وہی بالواسطہ اس معصوم کی موت کی بھی ذمہ دار تھی۔

موت کے منہ سے بچنے کا واحد راستہ یہی تھا کہ میں وقتی طور پر چمپون کے سامنے ہتھیار ڈال دوں اور اسے مدد کے لئے پکاروں۔ وہ ایک ماورائی ہستی تھی، عظیم شکتیوں کی مالک۔ وہی مجھے پھانسی کے پھندے سے بچا سکتی تھی۔ مگر دل اسے پکارنے اس کی مدد حاصل کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ اولاً میں اسے بری طرح دھتکار چکا تھا۔ اس لیے اسے مدد کے لیے پکارنا میری انا کی شکست ہوتی۔ ثانیاً میرے گھر والوں کی کشتی ڈوبنے میں اس کا ہاتھ تھا جس کے سبب میرے دل میں اس کے لیے نفرت کا جذبہ موجزن تھا۔ وہ الگ بات کہ میں اس کا کبھی کچھ نہیں بگڑ سکتا تھا۔ پھر یہ بات کہ وہ اگر میری متوقع نجات دہندہ تھی تو سراپا آزار بھی تھی۔ ان سب عوامل کے سبب میں گو ملو کا شکار تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں آخر وہ رات آن پہنچی جس کے اختتام پر سپیدہ سحر نمودار ہونے سے پہلے مجھے سزائے موت دی جانی تھی۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ جانی مجھ سے آخری ملاقات کر کے روتا ہوا چلا گیا تھا۔ مجھ سے آخری خواہش پوچھ لی گئی تھی۔ میں نے یہ تمنا کی تھی کہ میں اپنی بہن کی قبر کا دیدار کرنا چاہتا ہوں اور وہاں فاتحہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ میری یہ خواہش پوری کر دی گئی تھی۔ اب بیچ میں چند گھنٹے حائل تھے اور زندگی سے میرا ناٹو ٹٹنے والا تھا۔ مجھے ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔ میں کال کوٹھڑی میں ٹہلتا اور سودوزیاں کے تخمینے لگاتا رہتا تھا۔ ایک ہی بات ذہن میں آتی تھی کہ موت سے رستگاری کے بدلے میں ہر آزار بے وقعت اور ہر شے بیچ ہے۔ رات کے پچھلے پہر تین بجے مجھے کال کوٹھڑی سے نکالا گیا اور سخت پہرے میں اس کھلی جگہ لے جایا گیا جہاں پھانسی گھاٹ واقع تھا۔ جیل کے چند ملازمین ڈاکٹر اور پولیس کا عملہ یہ منظر دیکھنے کے لئے وہاں موجود تھے۔ جلاد نے میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور سر پر سیاہ تو بڑا چڑھا دیا۔ جس کی وجہ سے ارد گرد کا سارا منظر ایک مہیب تاریکی میں ڈوب گیا۔

پھر جلاد کے ہاتھوں اور ایک رے سے کالس مجھے اپنے سر پر محسوس ہوا۔ وہ میری گردن میں پھندہ ڈالنے والا تھا۔ میں بزدل نہیں ہوں لیکن سچ بتاؤں تو زندگی ختم ہوتے دیکھ کر میرے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ دل کی دھڑکنیں ڈوبتی محسوس ہوئیں۔ دماغ میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ میں نے چیخ کر جلاد سے رحم کی بھیک مانگنی چاہی، لیکن میرے حلق سے آواز نہیں نکلی۔ ان لمحات میں مجھے معلوم ہوا کہ دہشت کس کو کہتے



”چپون!.....چپون!.....چپون!“

اور اسی وقت جبکہ پھندہ میری پیشانی سے پھسل کر ناک تک پہنچ چکا تھا، مجھے ایک وحشت ناک چیخ سنائی دی۔ یہ جلاد کی چیخ تھی۔ نہ جانے اس پر کیا افتاد آ پڑی تھی کہ وہ بھیا نک انداز میں چیخ اٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ اچھل کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا ہے! پھر مجھے ایک ساتھ کئی لوگوں کی چیخیں سنائی دیں۔ وہ سب بدحواسی میں بھاگ رہے تھے اور بری طرح چیخ چلا رہے تھے۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اضطراری طور پر اپنی گردن پیچھے کی طرف جھکائی تو پھندہ میرے سر سے نکل گیا۔ لیکن تو بڑا اب بھی چڑھا ہوا تھا۔ جسے ہٹانا ممکن نہ تھا۔ میری آنکھیں کچھ دیکھنے سے قاصر تھیں۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔

”آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ تم لوگ کیوں بھاگ رہے ہو؟“ کسی نے چیخ کر پوچھا اور پھر اس کی بھی چیخ نکل گئی۔ میں پریشان اور بوکھلایا ہوا سا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے قریب کوئی موجود ہے۔ پھر میں نے اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ وہ میرے سر سے تو بڑا اتار رہا تھا۔ تو بڑا اترتے ہی میں سب کچھ دیکھنے کے قابل ہو گیا۔

”میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ.....جلدی۔“ تو بڑا اتارنے والے نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں بلکہ جیلر تھا۔ اس نے مجھے تختہ دار سے نیچے اتار لیا۔ پھانسی گھاٹ کے علاقے میں مکمل خاموشی تھی۔ وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا۔ سب لوگ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں سوچ سکا کہ یہ سب کچھ چپون کا کیا دھرا تھا۔ میں نے اسے مدد کے لئے پکارا تھا۔ اس نے جوابی اقدام کے طور پر کوئی ایسی حرکت کی تھی کہ سب لوگ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ اٹھے تھے۔ جیلر نے آ کر مجھے جس طرح تختہ دار سے اتارا تھا۔ اس کا انداز بھی میکانیکی تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت کسی نادیدہ طاقت کے زیر اثر ہے ورنہ ایک جیلر بقائمی ہوش و حواس پھانسی پانے والے مجرم کی مدد کیسے کر سکتا تھا؟

جیلر مجھے وہاں سے سیدھا اپنے دفتر میں لے گیا اور اس کے اندر بنے ایک اسٹور میں بند کرتے ہوئے بولا۔

”تم اس اسٹور میں چھپ جاؤ۔ کاٹھ کباڑ کے باوجود اندر اتنی جگہ ہے کہ تم آسانی سے کھڑے ہو سکتے ہو۔ جب تک میں واپس نہیں آتا، تم یہیں دبکے رہو.....“

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اسٹور میں چھپ گیا۔ اس نے اسے باہر سے مقفل کر دیا۔ اسٹور کے اندر کافی جھس تھی، لیکن دم سادھے اندر چھپا رہا۔ میں چپون کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ مجھے

موت کے دہانے سے باہر نکلائی۔ میں خود اس وقت لہان کی منہ سے کچھ معلوم نہ تھا۔ میں نے اس کے سامنے ہتھیرا ڈال دیئے تھے اور اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا تھا، دل میں اب ایک بے نام سے ملال کی لہر اٹھ رہی تھی۔ مگر میں نے دل کو سمجھایا کہ میں نے کسی انسان کے سامنے ہتھیرا نہیں ڈالے۔ اگر میں ایسا کرتا تو یقیناً یہ بات باعثِ ننگ و عار ہوتی۔ چپون ایک ماورائی ہستی تھی اور میں ایک بے بس انسان۔ میرا اس کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ مجھے بہت پہلے یہ بات سمجھ آ جانی چاہیے تھی!.....

میں اسٹور میں چھپا انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رہا اور کافی وقت گزر گیا۔ کھڑے کھڑے میری ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔ میں دل ہی دل میں جیلر کو برا بھلا کہہ رہا تھا جواب تک واپس نہیں آیا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے گزرنے کے بعد وہ آیا اور مجھے باہر نکال کر بولا۔

”خطرہ کافی حد تک ٹل گیا ہے، لیکن جب تک میں تمہیں جیل کے احاطے سے باہر نہیں نکال لے جاتا، اس وقت تک تم خود کو محفوظ نہ سمجھو۔ کسی قاتل کا پھانسی کے تختے سے فرار ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران اب بھی جیل میں موجود ہیں اور تفتیش جاری ہے۔ وہ یہ پتہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مجرم کوزمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا۔ وہ سب لوگ جو اس وقت پھانسی گھاٹ پر موجود تھے ان کے عجیب و غریب بیانات نے پولیس کو تو چکرا کر رکھ دیا ہے۔ صرف میرا بیان ان لوگوں سے مختلف تھا اس لئے میں پولیس کی نگرانی میں نہیں ہوں۔“

”آپ نے کیا بیان دیا تھا جناب اور ان کے بیانات کیا ہیں؟“ میں نے استعجابیہ لہجے میں پوچھا۔ ”میرا بیان یہ تھا کہ پھانسی گھاٹ پر اچانک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ سب سے پہلے جلاد ہی چیخ مار کر بھاگا تھا۔ اس کے بعد میں نے سب کو عالم بدحواسی میں بیچتے اور بھاگتے دیکھا۔ میں نے انہیں رکنے کا حکم دیا لیکن وہ میرے حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ نکلے۔ پھر اسی وقت میری نظریں قیدی کی طرف اٹھ گئیں تو میں نے دیکھا کہ وہ پھانسی کے تختے سے اتر آیا تھا۔ اس نے رکوع کی حالت میں جھک کر ایک جھٹکے سے وہ تو بڑا گرا دیا جو اس کے سر پر چڑھا ہوا تھا۔ پھر وہ ملحقہ عمارت کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ عمارت کے مرکزی دروازے میں داخل ہوتے ہی دو راہداریاں ہیں۔ ان کے موڑ اتنے نزدیک ہیں کہ پلک جھپکتے ہیں ان راہداریوں کو عبور کر کے دوسری طرف مڑا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں مرکزی دروازے میں داخل ہوا تو قیدی میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں اندازے سے ایک راہداری میں داخل ہو گیا لیکن قیدی وہاں نہیں ملا۔ غالباً اس نے فرار ہونے کے لیے دوسری راہداری کا انتخاب کیا تھا۔ پھر میں نے خطرے کی گھنٹی بجوا دی تھی تا کہ جیل کی محافظ پولیس ہوشیار ہو جائے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ قیدی حیرت انگیز طور پر جیل سے غائب ہو چکا تھا!.....“

”دوسرے لوگوں کا کیا بیان ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔



”ان سب کا ایک ہی بیان ہے۔“ جیلر نے جواب دیا۔ ”ان کا کہنا یہ ہے کہ ان پر شہد کی بے شمار ہر پللی مکھیوں نے حملہ کر دیا تھا، جس کی وجہ سے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ پولیس نے ان کے اس بیان پر بالکل یقین نہیں کیا کیونکہ ارد گرد کے درختوں پر اول تو شہد کی مکھیوں کا کوئی چھتہ نہیں۔ اگر ہو بھی تو شہد کی مکھیاں یوں رات کے اندھیرے میں کسی پر حملہ نہیں کرتیں۔ پھر ان میں سے کسی ایک کو بھی شہد کی مکھی نے نہیں کاٹا۔ جو کہ محلِ نظرات ہے۔ ادھر میرے بیان میں شہد کی مکھیوں کا سرے سے کوئی ذکر نہیں۔ میں نے وہاں کوئی مکھی نہیں دیکھی۔ پولیس کو شبہ ہے کہ وہاں موجود پولیس والوں اور جیل کے عملے کو بھاری رشوت دی گئی ہے اور انہوں نے قیدی کو فرار کرانے کے بعد یہ سوچی سمجھی کہانی بیان کی ہے۔“

میں ان باتوں پر غور کرتا ہوا سر ہلانے لگا۔ چپون نے ایک ایسی حرکت کی تھی جو کافی عرصے تک پولیس کے لئے دردِ سر بنی رہتی۔

”اب میں جیل سے باہر کیسے نکلوں گا؟“ میں نے جیلر سے پوچھا۔

”اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا.....“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”میری ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے اور مجھے گھر جانا ہے۔ میں ابھی باہر جا کر اپنے ڈرائیور سے کہوں گا کہ وہ کمرے سے میری ٹوپی اٹھالائے۔ تم دروازے کے قریب دیوار سے چپک کر کھڑے رہنا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہو، تم یہ وزنی گل دان پوری قوت سے اس کے سر پر مار دینا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گا۔ تم اپنے کپڑے اتار کر اس کی وردی پہن لینا اور باہر نکل آنا۔ میں تمہیں قریب ہی مل جاؤں گا۔ پھر تم میرے ساتھ کار تک چلنا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لینا۔ لوگ تمہیں میرا ڈرائیور سمجھیں گے.....“

”صرف وردی کی وجہ سے تو وہ مجھے ڈرائیور سمجھنے سے رہے.....“ میں نے جرح کی۔ ”میرے چہرے مہرے کا کیا ہوگا؟“

”اس کا حل بھی نکالیں گے.....“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

”اچھا اب میں چلتا ہوں اور ڈرائیور کو بھیجتا ہوں۔ تم دروازے کے پیچھے گل دان لے کر تیار ہو جاؤ۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گل دان اٹھا کر دفتر کے دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی دفتر کی سمت بڑھ رہا تھا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ آنے والے نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا ہے تو میں نے ہاتھ سر سے بلند کر لیا اور اپنی سانس روک لی۔ میرے اعصاب تن چکے تھے اور ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ ایک لمحے کے بعد دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ میرا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور گل دان خاصی آواز کے ساتھ نو وارد کی کھوپڑی سے ٹکرایا۔ میں نے ایک کراہ سنی اور پھر اس

آدمی کو گرتے ہوئے دیکھا۔ گل دان کی ضرب سے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر میرے اوسانِ خطا ہو گئے کہ وہ جیلر کا ڈرائیور نہیں تھا۔ ڈرائیور ہوتا تو اس کے جسم پر وردی بھی ہوتی۔ وہ سادہ لباس میں تھا اور اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی، جس سے اندازہ ہوا کہ بے چارہ جمعدار ہے جو منہ اندھیرے دفتر کی صفائی کرنے آیا تھا۔

ایک بار پھر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں تیزی سے مڑا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور راہداری کے فرش پر ایک سایہ متحرک تھا۔ وہ کمرے ہی کی طرف آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا سمجھتا وہ شخص دروازے پر پہنچ گیا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ مجھ پر پڑی پھر اس نے فرش پر گرے ہوئے لہولہان جمعدار کو دیکھا تو خوف اور حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ اس کے جسم پر وردی ہے۔ بلاشبہ وہ ڈرائیور ہی تھا۔ اس نے چیختے ہوئے بھاگ نکلنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے پکڑ لیا۔ میری گرفت بہت مضبوط تھی۔ میں اسے لئے لئے راہداری کے فرش پر گر گیا۔ گرنے سے پہلے میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا لہذا اس کی چیخ گلے ہی میں گھٹ گئی۔ میرا دوسرا ہاتھ اس کی گردن دبا رہا تھا۔ اس خیال سے مجھ پر گھبراہٹ طاری تھی کہ اس وقت کوئی راہداری میں نکل آیا تو میرا پکڑا جانا یقینی ہے۔

دفعۃً راہداری تاریک ہو گئی۔ شاید فیوز اڑ گیا تھا۔ یہ میرے لئے ایک نیک فال تھی۔ ڈرائیور میرے نیچے بری طرح مچل رہا تھا لیکن میں نے اسے اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیا۔ اب میرا دوسرا ہاتھ بھی اس کی گردن پر پہنچ چکا تھا اور پکڑ اتنی سخت ہو چکی تھی کہ ڈرائیور کے حلق سے کوئی تیز آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ آخر ڈرائیور بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ مر گیا تھا یا بے ہوش ہو گیا تھا، میں کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ میں اسے گھسیٹ کر کمرے میں لے آیا۔ اور جلدی جلدی اس کی وردی اتارنے لگا۔ اندھیرے کی وجہ سے اس کام میں دشواری تو ضرور ہوئی لیکن جیسے تیسے یہ کام ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے کپڑے اتارے اور وردی پہن لی۔ میں بش شرٹ کے بٹن لگا رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر مجھے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ لیکن اب مجھے زیادہ تشویش یا پریشانی نہیں تھی۔ کیونکہ میں نے کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی تھی۔ قدموں کی آہٹ دروازے پر آ کر رک گئی اور پھر کسی نے سرگوشی میں مجھے پکارا۔ وہ آواز جیلر کی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

”تم نے بہت دیر لگا دی؟“ جیلر کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

”ڈرائیور سے پہلے جمعدار آ گیا تھا۔ میں غلطی سے اسے نشانہ بنا بیٹھا..... بعد میں ڈرائیور سے بھی نمٹنا پڑا۔“

”وردی پہن لی ہے نا؟“ اس نے مجھے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔



”بس ٹھیک ہے میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ اس سے پہلے کہ کوئی فیوز لگا دے، ہمیں عمارت سے باہر نکل جانا چاہیے۔“ اس نے کسی معمول کی طرح کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ ذرا دیر پہلے جو واقعات پیش آئے تھے ان کی وجہ سے میرا جسم ابھی تک سنسار ہاتھا۔ دو منٹ بعد راہداری کا اختتام ہو گیا اور ہم باہرنگی سیڑھیوں پر آ گئے۔ سیڑھیاں اترنے سے پہلے ایک کافی بڑا چبوترہ اساتھا جس کے بعد سیڑھیاں تھیں اور پھر ایک کھلی جگہ جہاں گاڑیاں پارک تھیں۔ باہر ملگجا اندھیرا تھا۔ سپیدہ سحر پھوٹنے کے واضح آثار شروع ہو گئے تھے۔ میں نے باہر نکلتے ہی محسوس کیا کہ چند لوگ ادھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں۔ وہ جیل کے الیکٹریشن تھے جو برقی روبحال کرنے کے لئے بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ جیلر یہاں آ کر زیادہ تیزی سے چلنے لگا۔ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر وہ جلد از جلد پارکنگ میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ خود میں بھی یہی چاہتا تھا۔ کیونکہ بجلی آ جاتی تو روشنی میں کوئی اہلکار میری شکل دیکھ سکتا تھا اور یوں بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا تھا۔

اور پھر یہ دھڑکارنگ لا کر رہا!

اچانک بجلی آ گئی اور چبوترے پر آویزاں ایک سرچ لائٹ آن ہو گئی۔ ہم دونوں روشنی میں نہا گئے۔ جیلر ٹھنک کر رک گیا۔ میرے تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ جیل کے کچھ اہلکار جو میرے قریب سے گزر رہے تھے مجھے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے پہچان لیا اور چلا اٹھا۔

”پکڑو..... پکڑو..... یہ تو وہی قاتل ہے جو پھانسی کے پھندے سے فرار ہوا تھا۔“

اس کی آواز سن کر دوسرے بھی چونکے اور مجھے پکڑنے کے لئے لپکے۔ عین اسی لمحے میرا سر بھاری ہوا اور کسی نادیدہ قوت نے جھلاہٹ کے انداز میں مجھے مخاطب کیا۔

”کیا تم اپنے ذہن سے کام لے کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے؟ جھپٹ کر جیلر کا ریوالتور چھین لو اور اسے زد میں لے لو۔“ یہ چپون کی آواز تھی جسے میں لاکھوں آوازوں میں سے بھی بخوبی پہچان سکتا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ایکشن لے لیا۔ چپون کی پراسرار طاقت نے میری قوت ارادی بڑھا دی تھی۔ اب جیلر کا ریوالتور میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس کی نال جیلر کی کمر سے لگا دی اور چیخ کر کہا۔

”خبردار! تم میں سے کوئی آگے بڑھا تو میں جیلر کو گولی مار دوں گا۔“ میری دھمکی سن کر اہلکار ٹھٹھک کر رک گئے۔

”مسٹر جیلر! اپنی کار کی طرف بڑھو۔“ اب میں نے غرا کر اسے حکم دیا۔

جیلر نے سرعت سے تعمیل کی۔ وہ خوف زدہ اور بدحواس نظر آنے لگا تھا۔ گاڑیاں چند گز دور تھیں۔ ہم لپک کر کارتک پہنچے۔ میں نے جلدی سے پتلون کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ کار کی چابی نکال

سکوں میں بھی نہیں تھی۔ میں نے ساری جیبیں کھنگال ڈالیں..... مگر چابی ہوتی تو ملتی! غالباً چابی ہاتھ پائی کے دوران وہیں راہداری میں گر گئی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”روکو اسے! جانے نہ پائے!“ دفعتاً مجھے ایک بلند آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میری روح فنا ہو گئی۔ وہاں تین عدد رائفیل بردار گارڈ پہنچ گئے تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ پھانسی گھاٹ سے فرار ہونے والے مجرم نے جیلر کو ریغمال بنا لیا ہے اور پارکنگ سے گاڑی اڑا کر فرار ہونے والا ہے۔ وہ مجھے زندہ یا مردہ پکڑنے کے لئے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک نے کھڑے کھڑے پوزیشن لی اور مجھ پر فائر کرنے کے لئے آٹومٹک رائفل سیدھی کی۔ اس قیامت کے لمحے میں میں نے عجیب منظر دیکھا۔ یکا یک ایک بجلی کا کوندہ لپکا اور تڑتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ میں اور جیلر پھرتی سے زمین پر گر گئے اور رینگ کر ایک گاڑی کی اوٹ میں ہو گئے ورنہ گولیاں ہمارا کام تمام کر دیتیں۔ کوئی پانچ منٹ گولیاں چلنے اور چیخ و پکار کی قیامت خیز آوازیں آتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے محتاط انداز میں گاڑی کی اوٹ سے جائزہ لیا تو حیران رہ گیا۔ تینوں گارڈ خون میں لت پت زمین پر پڑے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے پر فائر کر کے اپنا کام تمام کر لیا تھا!

”یہ پکڑو چابی۔“ اچانک مجھے اپنے عقب میں سرسراہٹ اور سرگوشی سنائی دی اور پھر چابی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ اٹھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ پھر جیلر کو اندر دھکیل کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اگنیشن میں چابی گھما کر گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ میں اسٹیئرنگ کو صرف ایک ہاتھ سے سنبھالے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ریوالتور تھا جواب جیلر کی کنپٹی پر تھا۔

”تمہیں جیلر سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ میری ذہنی گرفت میں ہے۔ البتہ لوگوں کو دکھانے کے لئے یہ ڈرامہ کرنا ضروری سمجھتے ہو تو جاری رکھو۔“ چپون نے سرگوشی کی۔ وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”ہاں یہ ضروری ہے کہ لوگ اسے ریغالی سمجھیں۔ ورنہ اسے بعد میں اس الزام میں دھر لیا جائے گا کہ مجرم اس کے تعاون سے فرار ہوا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم خاصی ذہانت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔“ اس کی شوخ آواز ابھری۔ ”پہلے تو تم ایسے نہ تھے.....!“

میں اس کی شوخ باتوں کے جواب میں چپ رہا۔ جواب میں کچھ کہنے کا وقت تھا نہ دماغ۔ وہ ایک ماورائی مخلوق تھی جسماں خطرات اور ذہنی تناؤ سے آزاد۔ اس کے لئے یہ سب کچھ ایک دلچسپ کھیل رہا ہو گا جبکہ میری تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں اس وقت اگر کوئی خیال تھا تو بس یہی کہ کسی طرح جیل کے احاطے سے باہر نکل جاؤں۔



میرے سامنے جیل کا فیل قامت دروازہ تھا۔ میری کار آگے بڑھی تو سنتری نے اسے جیلر کی گاڑی سمجھ کر پورا گیٹ مستعدی سے کھول دیا۔ کار تیزی سے باہر نکل گئی۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے کار کے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا اور جیل کی کینٹی سے پستول ہٹا لیا۔ صبح کا وقت ہونے کی بنا پر سڑک بالکل خالی تھی۔ میں منٹوں میں جیل سے کئی میل دور نکل گیا۔ جیلر ابھی تک میرے پہلو میں کسی معمول کی طرح بیٹھا تھا۔ چپوں نے اسے ذہنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ایک راؤنڈ اباؤٹ کے قریب کار کچھ آہستہ ہوئی تو چپوں کی سفاک آواز آئی: ”اسے اب گاڑی سے باہر دھکیل دینا چاہیے۔ یہ اپنا کردار ادا کر چکا!“

”گاڑی کی رفتار اب بھی خاصی ہے۔ باہر دھکا دینے سے اسے شدید چوٹ آئے گی۔“ میں نے ترس کھاتے ہوئے کہا۔

”اپنی جان بچانی ہے تو رحم کا جذبہ تمہیں دل سے نکالنا ہوگا۔“ اس نے بدستور سفاکی سے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر اس نے مجھ سے خاصا تعاون کیا ہے۔ کیا یہ بیچارہ اس تعاون کے سلسلے میں رحم کا مستحق نہیں؟“

”اسے بیچارہ مت سمجھو۔ میں اسے اپنی ذہنی گرفت سے آزاد کرتی ہوں، پھر دیکھنا یہ تمہارا کیا حشر کرتا ہے۔ اس نے تمہارے ساتھ تعاون نہیں کیا بلکہ میں نے اس سے تعاون کروایا ہے ورنہ یہ بڑا سخت گیر اور ظالم جیلر ہے۔ اسے باہر پھینکنا ضروری ہے۔“ وہ غرائی۔

”ٹھیک ہے اگر ضروری ہے تو تم اسے باہر دھکیل دو۔۔۔۔۔“ میں نے سڑک پر نظریں جماتے ہوئے بے دلی سے کہا۔ چپوں نے ایک لمحے کا توقف کیا اور پھر نہ جانے کیا کیا۔۔۔۔۔ اگلے ہی لمحے وہ شخص سڑک پر اڑھک چکا تھا۔ دھپ کی آواز کے ساتھ مجھے ایک بھیانک چیخ سنائی دی۔ میرا دل زور سے دھڑکا اور ایک لمحے کے لئے اسٹیرنگ پر میری گرفت کمزور پڑ گئی مگر میں نے فوراً ہی گاڑی کو سنبھال لیا۔

میں گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑاتا رہا۔ ایک جگہ سڑک شکستہ تھی۔ میں نے گاڑی آہستہ کی تو میری نگاہ کار کے عقبی آئینے پر پڑی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ پولیس کی کئی گاڑیاں ہمارے تعاقب میں آرہی تھیں۔

”ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”ہمارے پیچھے پولیس کی گاڑیاں لگ گئی ہیں۔“

”ہاں تین گاڑیاں ہمارا تعاقب کر رہی ہیں۔“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”لیکن ان تین گاڑیوں ہی پر کیا موقوف ہے۔ اس وقت شہر بھر میں پولیس کی کئی درجن گاڑیاں تمہاری گرفتاری کے لئے حرکت میں آچکی ہیں۔ تم تصور نہیں کر سکتے کہ اس وقت سارے محکمہ پولیس میں کیسی تھر تھلی اور سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ ٹیلی فون بج رہے ہیں، وائرلیس آن ہیں اور کیا افسر کیا سپاہی سب ادھر سے ادھر دوڑ رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس صورت حال سے کیونکر عہدہ براء ہوا جائے۔“ معاً

اس کی فطری شوخی اور شرارت عود کر آئی۔ ہنستے ہوئے بولی۔

”اعلیٰ حکام کے ہاتھوں سے اتنے طوطے اڑ چکے ہیں کہ میں انہیں کوشش بھی کروں تو گن نہیں سکتی!“

چپوں کے لہجے کی شوخی اور اس کی بے فکری نے مجھے خاصا حوصلہ دیا۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ وہ اس صورت حال سے بھی مجھے آسانی سے نکال لے گی پھر اس کی مسلسل خاموشی سے مجھے احساس ہوا کہ وہ گاڑی میں نہیں ہے۔

”میری نظریں عقبی آئینے پر جمی ہوئی تھیں میں سوچ رہا تھا کہ دیکھو ان سے میری جان چھڑانے کے لئے وہ کیا کرشمہ دکھاتی ہے۔ پھر اچانک ایسی بات ظہور پذیر ہوئی جس کی کم از کم مجھے کوئی توقع نہ تھی۔ پولیس کی گاڑیاں یکدم یوں لہرائیں جیسے ان کے ڈرائیور یا تو بالکل اناڑی ہوں یا انہوں نے شراب چڑھا رکھی ہو۔ گاڑیوں کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس طرح لہرانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ ان میں سے ایک الٹ گئی تھی۔ بے حد خوفناک حادثہ تھا۔ اس وقت میں یہی اندازہ لگا سکا کہ ان میں سے ایک دو کے علاوہ شاید ہی کوئی زندہ بچا ہوگا۔ چپوں نے بڑا خوفناک قدم اٹھایا تھا۔ وہ اپنی مقصد براری کے لئے انسانی زندگیوں سے اس بے دردی کے ساتھ کھیل گئی تھی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرا دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا تھا۔ میں گاڑی کو طوفانی رفتار سے بھگائے چلا گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میری منزل کیا ہے۔

کچھ دیر گزری تھی کہ چپوں واپس آ گئی۔ مجھے کان کے قریب اس کی سرگوشی سنائی دی۔

”تماشا دیکھا؟“

”بہت خوفناک تھا۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”زندگی اور موت کا کھیل خوفناک ہی ہوتا ہے۔ اچھا اب تم گاڑی روکو۔ اس سے پہلے کہ پولیس کی دوسری گاڑیاں اس کار کو دیکھ کر تمہارے پیچھے لگ جائیں۔ تمہیں اس کار کو چھوڑ کر دوڑ نکل جانا چاہیے۔ کار کی کچھلی نشست پر ایک صاف ستھرا اور معقول لباس موجود ہے۔ ڈرائیور کی یونیفارم اتار کر اسے زیب تن کرلو۔“

میں نے ایکسلریٹر سے پاؤں ہٹا کر بریک پر رکھ دیا۔

”لیکن میں جاؤں گا کہاں؟“ میں نے استفسار کیا۔

”بتاتی ہوں۔ تم لباس تو بدلو۔“

میں نے گاڑی ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ وہاں ایک بڑا سا خالی پلاٹ تھا اور برگد کا ایک گھنا سایہ دار درخت۔ سامنے چند مکانات تھے۔ میں نے برگد کے نیچے گاڑی روکی اور لباس بدلا تو اس نے مجھے ہدایت کی۔



”مکانوں کے درمیان جوگلی ہے اس میں کھس جاؤ۔ اس کے دوسرے سرے پر تمہیں ایک سڑک ملے گی۔ وہاں سے ٹیکسی پکڑ لینا اور اسے کہنا کہ وہ تمہیں تاج محل ہوٹل لے جائے۔“

”اور..... تم؟“ میں نے جھکتے ہوئے پوچھا۔

”میں بھی کچھ دیر بعد وہاں پہنچ جاؤں گی۔ فی الحال کچھ کام پٹانے ہیں!“

میں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور گلی کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرے سرے پر سڑک کنارے ایک خالی ٹیکسی کھڑی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ڈرائیور میرا ہی منتظر ہو۔ میں نے پچھلا دروازہ کھولا اور اسے تاج محل ہوٹل چلنے کی ہدایت کی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مستعدی سے گاڑی اشارت کی اور سڑک پر فرائے بھرنے لگا۔ دو چوک کر اس کرنے کے بعد وہ ایک بڑی سڑک پر مڑ گیا جہاں خاصی رونق تھی۔ یہ ایک فیشن ایبل اور جدید علاقہ تھا۔ درختوں سے گھری ایک کئی منزلہ خوبصورت عمارت کے سامنے ٹیکسی رک گئی۔ بلڈنگ پر جلی حروف میں ہوٹل تاج محل لکھا ہوا تھا۔ میں ٹیکسی سے اتر گیا اور کرایہ دے کر اسے چلتا کیا۔ چپون نے جس لباس کا انتظام کیا تھا اس کی جیب میں نوٹوں کی ایک گڈی بھی تھی۔ اس وجہ سے مجھے کرایہ ادا کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد میں سیدھا لابی میں گیا۔ وہاں قدم رکھتے ہی میری نگاہ چپون پر پڑی۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے سبز رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جس نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ بہت دنوں کے بعد اسے اصل روپ میں دیکھا تھا۔ میں اس کے سحر انگیز حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لابی میں موجود سبھی لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ مردوں کی نگاہوں میں ستائش تھی اور عورتوں کی نظروں میں حسد۔ میں سب کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے قریب پہنچا۔ مجھے دیکھ کر وہ بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی اور میرا بازو پکڑ کر جلدی سے بولی۔

”میں نے ایک سویٹ بک کروالیا ہے۔ چابی میرے پاس ہے۔ چلو اور پرچلیں۔“

”چلو۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ مجھے تقریباً کھینچتے ہوئے لفٹ کی طرف لے جانے لگی۔ لابی میں موجود سب لوگوں کی نگاہیں ہم پر مرکوز تھیں۔ میں نے ان نگاہوں کی پیش اپنی پشت پر محسوس کی۔ میرا دل کسی عجیب احساس سے۔۔۔ جگمگ انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے پہلو میں چلتے ہوئے مجھے وہ دن یاد آ رہے تھے جب ہم نے چٹا گانگ میں اپنا گھر بسایا تھا اور اسی طرح بازو میں بازو ڈال کر خوش و خرم گھومتے پھرتے تھے۔ اس وقت اور اس وقت میں کتنا فرق تھا۔ تب مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں کوئی فاتح ہوں جس نے حسن کی ایک سلطنت فتح کر لی ہے، لیکن اب میری حیثیت کسی مفتوح کی سی تھی۔ اب میں اس ملکہ حسن کا مالک نہیں غلام تھا۔ وہ مجھے ایک غیر مرئی زنجیر پہنائے اپنے ساتھ لئے جا رہی تھی۔

ہم لفٹ میں داخل ہوئے تو چپون نے لفٹ اوپر پٹو پانچویں منزل کا بٹن دبائے کو کہا۔ لفٹ نے دھیرے دھیرے پانچویں منزل کا سفر شروع کر دیا۔ پانچویں منزل پر اتر کر چپون نے ہائیں طرف راہداری کا رخ کیا اور سویٹ نمبر 505 کے سامنے جا کر رک گئی۔ چابی لگانے کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر لائٹ جلائی۔ پھر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ اپنی مخصوص مسکان ہونٹوں پر سجائے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز میں اپنائیت اور پیار کی ملائمت تھی۔ اسے اپنے اس قدر قریب پا کر مجھے اپنا وجود پکھلتا ہوا محسوس ہوا۔ میرے قلب و ذہن سے اس کی سفاکی اور ہیبت زائل ہونے لگی اور اس کا دوسرا دل نشیں روپ مجھے اپنی گرفت میں لینے لگا۔ اس روپ میں وہ ایک حسین و خوش ادا اور جوانی سے بھرپور نوجوان لڑکی تھی جسے میں نیلم کے نام سے پکارتا اور دیوانوں کی طرح چاہتا تھا۔ یہ اس کی کوئی سحر کاری تھی یا مسور کن شخصیت کا اثر کہ میرے دل میں جاگزیں تمام تر نفرت و کدورت مٹنے لگی تھی اور مجھے اپنے دل میں اس کے لئے محبت کے نئے سوتے پھونٹے محسوس ہو رہے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ تختہ دار سے زندگی کی طرف یہ نیا سفر اسی کے مرہون منت تھا۔ مجھے اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے مجھے مرنے سے بچالیا ورنہ اس وقت میرا جسم پھانسی کے پھندے میں جھول رہا ہوتا اور روح قصر عنصری سے پرواز کر چکی ہوتی۔ اسی احساس ممنونیت کے زیر اثر میں نے اس کے حسین چہرے پر نگاہ ڈالی اور دھیرے سے کہا۔

”میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے پھانسی کے پھندے سے بچالیا۔“

”اس میں شکر گزاری کی کیا بات ہے۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ یہ تم تھے جس نے مجھ سے برملا نفرت کا اظہار کیا.....“ وہ شکوہ کرنے لگی۔

”جو ہوا میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”صرف اتنا کہوں گا کہ تمہاری اصلیت ظاہر ہونے کی وجہ سے میں بدک گیا تھا۔ ورنہ تم سے میں نے بھی شدید محبت کی تھی۔ تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے اتنا مار جن ضرور دیتیں کہ میں بہر حال انسان ہوں۔ میرا بدکنا بالکل فطری تھا۔ مگر تم نے بھی انتقامی کارروائیوں میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آج یہ حالت ہے کہ میں دنیا میں تنہا ہوں۔ میری پیاری بہن نوشی بھی مر گئی۔ اس کا کیا قصور تھا؟“ میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

اس نے آگے بڑھ کر بے اختیار مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور میرے ماتھے پر اپنے نرم ہونٹ رکھتے ہوئے بولی۔

”آئی ایم سوری..... آئی ایم ریلی سوری بولی۔ جو گزر گیا اسے بھول جاؤ۔ آگے کی طرف دیکھو۔ یقین کرو میں تمہاری زندگی میں دنیا کی ہر خوشی بھردوں گی۔ تمہیں ایسی آسودگی ایسی راحت اور ایسی نعمتیں مہیا کروں گی کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گے۔ تمہیں میرے بارے میں ابھی کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں وہ



طاقت ہوں جو حالات کے تند و تیز دھاروں کا رخ بدل سکتی ہے۔ میرے ایک اشارہ ابرو پر دہشتی آک میں چشمے ابل سکتے ہیں اور رخ بستہ پانی میں شعلے لپک سکتے ہیں۔ مجھے کوئی دنیاوی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ میں جاوداں ہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ رواں دواں ہوں۔ میں نے صدیوں کا ذائقہ چکھا ہے اور قرنوں کے فاصلے طے کئے ہیں۔ میں جس پر مہربان ہو جاؤں اس کے لئے وجہ آسودگی بن جاتی ہوں۔ میں تمہارے لئے سراپا آسودگی بنوں گی۔ تم خاطر جمع رکھو.....“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور مجھے بے تحاشا چومنے لگی مگر میں آنسو بہاتا رہا۔ پھر کافی دیر بعد اس کے پیار سے پکھل کر اس کا ساتھ دینے لگا۔ رات بھر اس نے مجھے جگائے رکھا۔ وقت سحر وہ تھک کر سو گئی تو میری بھی آنکھ لگ گئی۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز صبح دیر گئے اٹھا تو دھوپ کھڑکی کے پردوں سے چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ چپون نہادھو کر لباس بدل چکی تھی۔ جب میں بھی حوائج ضروریہ سے فراغت پا کر لباس بدل چکا تو اس نے ناشتہ منگوالیا۔ میں نے میز پر موجود اخبارات میں سے ایک انگریزی اخبار اٹھالیا۔ مجھے یقین تھا کہ اخباروں میں میرے بارے میں ضرور کوئی خبر چھپی ہوگی۔ میرا یہ خیال غلط ثابت نہیں ہوا۔

اخبار نے تختہ دار سے میرے فرار کی خبر نہایت سنسنی خیز انداز میں شائع کی تھی۔ فرار کی مکمل کہانی کے ساتھ شدید زخمی جیلر کا بیان چھاپا گیا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ سحری کے وقت جب وہ نائٹ ڈیوٹی ختم کر کے گھر جانے لگا تو اسے یاد آیا کہ وہ اپنی ٹوپی دفتر کی میز پر بھول آیا ہے۔ اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ جائے اور دفتر سے اس کی ٹوپی لے آئے۔ ڈرائیور ٹوپی لینے چلا گیا۔ جب اس کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو اس نے اس کے پیچھے دفتر جانے کا فیصلہ کیا کہ شاید اسے ٹوپی ڈھونڈنے میں دشواری ہو رہی ہے۔ وہ دفتر کے دروازے کے قریب پہنچا تھا کہ اچانک برقی رو بند ہو گئی۔ اندھیرے میں اس نے دفتر کا دروازہ کھلتے اور ڈرائیور کو باہر آتے دیکھا۔ اندھیرے میں وہ اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ جیلر نے تاخیر کی بنا پر ڈرائیور کو ڈانٹ پلائی اور واپس پلٹ گیا۔ جب وہ راہداری سے باہر تنگی سیڑھیوں پر پہنچے تو اچانک بجلی آ گئی۔ تب اس پر انکشاف ہوا کہ وہ ڈرائیور نہیں، مفرور قیدی تھا جس نے ڈرائیور کو ہلاک کر کے اس کی وردی پہن لی تھی..... اس سے آگے وہی کچھ بیان کیا گیا تھا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ خبر میں اس امر پر بھی حیرت کا اظہار کیا گیا تھا کہ مفرور کا تعاقب کرنے والی پولیس کی گاڑیاں عجیب پر اسرار انداز میں ٹکرا گئی تھیں اور کچھ اس طرح تباہ ہوئی تھیں کہ ان میں سوار پولیس والوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ اخبار میں ان اہلکاروں کے نام بھی دیئے گئے جو پھانسی کے وقت پھانسی گھاٹ پر موجود تھے اور جنہیں پولیس نے تفتیش کی غرض سے حراست میں لے لیا تھا۔ ان لوگوں کا بیان تھا کہ یکا یک ان پر شہد کی مکھیوں کے ایک بھرے ہوئے غول نے حملہ کر دیا تھا

جس کی بدولت وہ جان بچانے کے لئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک حیرت انگیز خبر یہ بھی تھی کہ مفرور قیدی کی وہ تمام تصویریں جو اخبارات اور پولیس کے ریکارڈ میں تھیں، پراسرار طور پر غائب ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات میں میری کوئی تصویر شائع نہ ہوئی تھی۔ ”صرف اخبار ہی پڑھتے رہو گے یا ناشتہ بھی کرو گے؟“ ناشتہ آ گیا تو اس نے ابلے ہوئے انڈے کاٹ کر پلیٹ اور نمک دانی میری طرف بڑھائی۔

”ناشتہ ضرور کروں گا“ پہلے تم میرے چند سوالات کے جواب دو۔“

”میں جانتی ہوں تمہارے ذہن میں کیا سوالات اُٹھ رہے ہیں۔“ وہ انڈے کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”شہد کی مکھیوں کا غول میں نے ہی ان لوگوں پر مسلط کیا تھا“ تا کہ وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوں..... اور سرکاری ریکارڈ اور اخبارات کے دفاتر سے تمہاری تصویریں بھی میں نے ہی غائب کروائی ہیں۔“

”یہ سردردی تم نے کیوں مول لی؟“

”میرے لئے یہ کوئی سردردی نہیں۔ اس طرح کے کام تو میں انجوائے کرتی ہوں۔ ویسے یہ کرنا ضروری تھا۔ تصویر چھپنے کی صورت میں تم پہچانے جاسکتے ہو.....“

”میں تمہارا ممنون ہوں۔ تم میری خاطر اتنا کچھ کر رہی ہو۔“

”نہیں..... یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ابھی میں تمہارے لئے بہت کچھ کروں گی۔ اتنا کچھ کہ تم نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔“ اس نے مسکرا۔ تے ہوئے کہا۔

”کیا اب ہمارا قیام اسی ہوٹل میں رہے گا؟“ کچھ دیر تو وقف کے بعد میں نے سوال کیا۔

”نہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ آج ہی رات ہم مدراس چلے جائیں۔ وہاں میں تمہارے لئے کوٹھی کا راور زندگی کے دیگر لوازمات کا بندوبست کر دوں گی۔ تم وہاں عیش اور ٹھاٹ سے رہنا۔“

”کیا تم نہیں رہو گی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں..... میں کہیں اور رہوں گی۔ لیکن میرا جب جی چاہے گا میں تمہارے پاس آ جایا کروں گی۔ تمہیں ذہنی خلفشار اور پریشانی سے بچانے کے لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے اس طرح ہم دونوں میں زیادہ موانست رہے گی۔“

”تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔ یقین کرو مجھے اب بھی تم سے محبت ہے.....“

اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا جیسے باور کرانا چاہتی ہو کہ وہ دل کا بھید جاننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میں شرمندہ شرمندہ سا چپ چاپ چائے پیتا رہا۔

☆.....☆.....☆



مدرس پہنچ کر ہم نے ایک بڑے ہوٹل میں قیام کیا۔ وہاں اگلی صبح ناشتے کی میز پر چمپون نے مجھ سے کہا۔

”میں چاہتی ہوں سب سے پہلے تمہارے لئے سرمایہ فراہم کروں۔ اس سلسلے میں تمہیں میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔ اگر تم نے میری ہدایات پر عمل کیا تو تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

”تم بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟“ میں نے مستعدی سے کہا۔ ”میں تمہاری ہدایت کے عین مطابق عمل کروں گا۔“

”تمہیں ریس سے دلچسپی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کراچی ریس کلب میں میں نے کئی دفعہ گھوڑوں کی ریس دیکھی ہے۔“

”میں ریس دیکھنے کی نہیں اس پر شرط لگانے کی بات کر رہی ہوں۔“

”ایک دفعہ لگائی تھی کچھ فائدہ نہیں ہوا۔“

”اب لگا کر دیکھو۔ فائدہ ہی فائدہ ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ جو گھوڑا میں بتاؤں گی وہ جیتے گا ہی جیتے گا!“

”ویری انٹر سٹنگ!“ میں نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”پھر تو میں ضرور بازی لگاؤں گا۔“

”میرے ساتھ رہو گے تو یونہی مزے کرو گے!“ اس نے ناز سے کہا اور سلاٹس پر مکھن لگانے لگی۔

شام کو ہم دونوں اکٹھے ریس کورس گئے۔ اسٹیڈیم شائقین سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ ابھی ریس شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ جو کی اپنے اپنے گھوڑوں کو ریس کے لئے تیار کر رہے تھے۔ بکی ہاٹ فیورٹ گھوڑوں کے لئے شرطیں طے کر رہے تھے۔ چمپون نے سیاہ رنگ کے ایک اسٹالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”بوی وہ رہا آج کا فاتح گھوڑا۔ آنکھیں بند کر کے اس پر شرط لگا دو۔“

”وہ گھوڑا مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا جو کی بھی کمزور تھا مگر میں نے اس کی ہدایت پر بلا چوں چراں عمل کیا۔ جب ریس شروع ہوئی تو ایک چکر کے بعد وہ گھوڑا پہلی تین پوزیشنوں میں بھی کہیں نہیں تھا۔ میں نے بے چینی سے چمپون کی طرف دیکھا تو اس نے ہولے سے میرا ہاتھ دبا دیا۔ اس کے بعد وہ کسی بہانے سے وہاں سے اُٹھ گئی اور واش روم کی طرف چلی گئی۔ اتنی دیر میں دوسرا چکر مکمل ہو رہا تھا۔ اب وہ گھوڑا پانچویں نمبر پر بھاگ رہا تھا۔ پھر یکا یک ایک معجزہ ہوا۔ اس گھوڑے کے جو کی نے ایک جھرجھری سی لی اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا تھوڑا سا اچھلا اور پھر اس نے جان توڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔

اگلا آدھا چکر مکمل ہونے سے پہلے وہ سارے گھوڑے کراس کر چکا تھا۔ تماش بین یہ منظر دیکھ کر اپنی سیٹوں پر اچھل پڑے۔ پورے اسٹیڈیم میں شور مچ گیا۔ پھر سیٹوں، تالیوں اور چیخوں کے درمیان وہ گھوڑا پہلی پوزیشن جیت گیا۔ میں ریس کورس اسٹیڈیم سے باہر نکلا تو میری جیمیں بڑے بڑے نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں وہاں سے ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور سیدھا ہوٹل پہنچا۔ وہاں چمپون میری منتظر تھی۔

”کیسا رہا آج کا ایڈ ونچر؟“ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

”ویری ایکسٹنٹنگ!“ میں نے خوشی سے مغلوب آواز میں کہا۔ ”تم نے تو کمال کر دیا۔ اتنے زیادہ نوٹ اتنی آسانی سے کمائے جاسکتے ہیں اس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔“

”تم اب روزانہ وہاں جانا اور میرے بتائے ہوئے گھوڑے پر شرط لگانا۔ تمہارے پاس اتنے زیادہ نوٹ آئیں گے کہ انہیں گننا ممکن نہ ہوگا۔“ اور پھر واقعی ایسا ہوا۔ اگلے چند ہی روز میں میرے پاس اتنی دولت آگئی کہ میرے لیے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ تب چمپون کے مشورے سے میں نے ایک پوش علاقے میں ایک خوبصورت بنگلہ خریدا اور نہایت ٹھاٹھ سے تنہا اس میں رہنے لگا۔ بنگلے میں قیمتی فرنیچر، آسائش اور تمام سہولیات زندگی موجود تھیں۔ میں نے چند ملازم بھی رکھ لیے۔ خانساں میرا کھانا بناتا تھا ایک ملازم باہر کے کام کرتا تھا جبکہ ڈرائیور نئے ماڈل کی اس قیمتی کار کو چلاتا تھا جو میں نے سیر سپاٹے کے لئے خریدی تھی۔ چمپون نے ایک جنگلی بوٹی کھلا کر مجھے اس زہر سے بھی نجات دلادی تھی جو میری رگوں میں بھر گیا تھا اور جس کی بدولت میں صنف مخالف کی ہلاکت کا سبب بن جاتا تھا۔ اس آزار سے نکلنے کے بعد میری اکثر شا میں کلب میں گزرنے لگی تھیں جہاں کئی حسین لڑکیاں میری دوست بن چکی تھیں۔ میرے جسم سے اٹھنے والی بو بھی اب ماضی کا قصہ بن گئی تھی۔ البتہ ماتھے پر چمکادڑ سے مشابہہ ہلکا سا نشان باقی تھا۔ وہ چمپون سے میرے قرب کی علامت تھی۔ چمپون کبھی کبھار رات کو اس وقت آتی تھی جب ڈرائیور اور خانساں گھر چلے جاتے اور گھریلو ملازم سرونٹ کو ارٹھر میں سوچکا ہوتا تھا۔ ایسا دس پندرہ روز کے بعد ہوتا تھا۔ ایک رات وہ اسی طرح میرے پاس آئی تو وصل کے شہد آگیاں لمحوں کے بعد اس نے میرے سینے کے بالوں سے کھیلنے ہوئے کہا۔

”زندگی کیسی گزر رہی ہے بوی؟“

”بہت اچھی۔ کسی شے کی کمی نہیں۔“ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔

”واقعی کسی شے کی کمی نہیں؟“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“

”پوچھا یاد آتی ہے؟“ اس نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔ اس کا یہ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ



میں ایک لمحے کے لئے گنگ ہو گیا۔ وہ اسے جانتی تھی اور اس حقیقت سے واقف تھی کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ ان ایام میں میں نے پوجا کو بے حد یاد کیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس سے رابطہ کروں اور معلوم کروں کہ وہ کس حال میں ہے۔ لگ بھگ ڈیڑھ برس پہلے میں اسے چھوڑ کر اچانک بمبئی چلا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کی بالکل خبر نہیں لی تھی۔ لیکن اس کی یاد مجھے اکثر آتی تھی۔ وہ تھی ہی ایسی۔ اسے آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا تھا۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے۔“ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر ٹھوکا دیا۔

”ہاں میں اکثر اسے یاد کرتا رہتا ہوں۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”کیا تمہیں اس سے محبت ہے؟“ اس نے اگلا سوال کیا۔ مجھے جواب دینے میں دقت ہوئی۔ میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے چمپون کے سامنے اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے یا نہیں مگر پھر یہ سوچ کر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا کہ اس کے سامنے جھوٹ بولنا بیکار ہوگا کیونکہ وہ اپنے مقابل کے خیالات پڑھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

”ہونہہ.....“

میرا اعتراف سن کر اس نے سر ہلایا پھر کہنے لگی۔

”میں نے سوچا ہے کہ یہ ایک کمی جو رہ گئی ہے اسے بھی پورا کر دوں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ میں پوجا کے

ساتھ تمہاری شادی کروانے جا رہی ہوں۔“

”کیا.....؟“ میں حیرت سے اچھل پڑا۔

”تمہیں اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے بوبی؟“ اس نے سوال کیا۔

”ظاہر ہے حیرت تو ہونی ہے۔ تم عورت ذات ہو۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن

اپنے مرد کے ساتھ کسی دوسری عورت کی شراکت برداشت نہیں کر سکتی.....“

”یہ میں تمہاری خوشی کی خاطر کر رہی ہوں۔ آخر میں نے تم سے دوستی کی ہے۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”یقین کرو تمہاری کسی بھی خواہش کو پورا کرنا میرے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تم مجھ سے جو

خواہش کرو گے وہ ضرور پوری ہوگی، لیکن اس کے لئے میری بھی ایک شرط ہے.....“

”وہ کیا.....؟“ میں نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”یہی کہ میری دوستی کے جواب میں تم بھی حق دوستی ادا کرو گے.....!“

”میں اس کا وعدہ کرتا ہوں۔“ میں نے بلاسوچے سمجھے کہہ دیا۔

”ایک اچھے دوست کی حیثیت سے میں تمہارا ہر کام فوراً کروں گی۔ اس کے عوض تمہیں میرا

صرف ایک کام کرنا ہوگا۔ خود مجھے وہ کام کرنے کی اجازت نہیں.....“

”وہ کیا کام ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”جب کام کا وقت آئے گا۔ اس وقت میں تمہیں بتا دوں گی۔ فی الحال تم اسے کرنے کا وعدہ کر لو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا وہ کام ضرور کروں گا۔“

”سوچ لو.....“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پراسرار سے لہجے میں کہا۔

”ایک بار وعدہ کر لینے کے بعد اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو ہماری دوستی دشمنی میں بدل جائے

گی..... ہو سکتا ہے پھر میں تمہیں کوئی نقصان پہنچا دوں۔“

”اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور پیار سے اسے بانہوں میں لے

لیا۔ اگلے ہی لمحے ہم ایک بار پھر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

☆.....☆.....☆

میں نے سات آٹھ دن انتظار کیا کہ شاید چمپون از خود پوجا کا دوبارہ تذکرہ کرے مگر وہ اس

معاملے میں بالکل خاموش تھی۔ آخر ایک رات جب وہ میرے پاس آئی تو میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ ایک دو روز میں کلکتہ کا چکر لگاؤں.....“

”وہ کیوں؟“ اس نے سوال کیا۔

”یونہی..... گھومنے پھرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ وہاں کچھ لوگوں سے بھی مل لوں گا۔“

میری بات سن کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا اور

کہنے لگی۔

”جن ”لوگوں“..... سے تم ملنا چاہتے ہو۔ وہ ”لوگ“ وہاں موجود ہی نہیں تو پھر جانے کا فائدہ؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ پوجا کلکتہ چھوڑ چکی ہے اور اس وقت دلی میں ہے۔“

”وہ دلی چلی گئی ہے؟ مگر کیوں۔ اس نے کلکتہ کیوں چھوڑ دیا؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”تمہارے اچانک غائب ہو جانے سے اسے بے حد رنج اور صدمہ پہنچا تھا۔ چھ سات ماہ وہ

تمہاری منتظر رہی پھر مایوس ہو گئی۔ زندگی اور اس کی دلچسپیوں سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ ایک دن

اس نے اپنی تمام جائیداد اور دولت ایک آشرم کو عطیہ کی اور ہر دوار چلی گئی۔ وہاں اس نے گیان

دھیان اور پوجا پاٹھ میں دل لگا لیا تھا، مگر میں نے اسے ہندومت سے برگشتہ کر دیا ہے۔ اس کے لئے

مجھے بڑے پاپڑ بیلنا پڑے۔ اب وہ مذہب اسلام کی طرف مائل ہے اور مجھے اُمید ہے کہ جلد ہی کلمہ

پڑھ لے گی۔ اس وقت وہ ایک بزرگ سیدزادی بی بی کلثوم کے ساتھ خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر

حاضری دے رہی ہے.....!“



”واقعی؟“

”ہاں میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔“

”تم نے اسے ہندومت سے برگشتہ کیوں کیا؟“

”ظاہر ہے تمہاری خاطر۔ میں جانتی ہوں جب تک لڑکی مسلمان نہ ہو تم لوگ اس سے شادی نہیں کرتے۔“

”میں تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ تم نے واقعی ایک بڑی الجھن کو حل کر دیا ہے۔“ میں نے احساس ممنونیت سے کہا۔

”بولی صاحب۔ چمپون نے آپ سے دوستی کی ہے کوئی مذاق نہیں کیا۔ اب دیکھتے ہیں اس دوستی کا جواب آپ کس طرح دیتے ہیں۔“ اس نے ہنسیوں اچکا کر کہا۔

”تم نے مجھے کبھی کسی خدمت کا موقع ہی نہیں دیا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”جب کوئی موقع آیا تم مجھے پیچھے نہیں پاؤ گی۔“

”فکر نہ کرو موقع آنے والا ہے۔“ اس نے معنی خیز انداز سے کہا۔

”دس بارہ دنوں کے بعد پورن ماشی کی رات ہے۔ اس رات میں تمہیں خدمت کا موقع دوں گی۔“ میں نے اسے کریدنے کی بہتری کوشش کی تاکہ پتہ چل سکے کہ وہ مجھ سے کیا خدمت لینا چاہتی ہے لیکن اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اسی رات بتاؤں گی فی الحال کچھ نہیں بتا سکتی!

”ہم پوجا سے ملنے دلی کب جائیں گے؟“ کچھ دیر کے بعد میں نے مچلتے ہوئے پوچھا۔

”اس کام کے بعد۔۔۔۔۔“ اس نے ستم ظریفانہ لہجے میں کہا اور مجھ سے رخصت طلب کر کے غائب ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ چمپون کے تعاون سے میرے پاس بے اندازہ دولت آگئی تھی۔ ریس کے علاوہ میں نے سٹہ بھی کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں جا کر جوا کھیلنا تو میرا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔ غرضیکہ میں جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا قسمت میرا ساتھ دیتی تھی۔ میرا بینک بیلنس لاکھوں تک جا پہنچا تھا۔ چمپون کے مشورے سے میں نے یہ رقم مختلف بینکوں میں رکھی تھی تاکہ کسی کو میرے ذرائع آمدنی کے بارے میں شبہ نہ ہو۔ اسی خیال سے میں نے اشوک پلازہ میں امپورٹ ایکسپورٹ کا ذاتی دفتر بھی قائم کر دیا تھا جہاں میرا ایک منیجر اور سات ملازمین کا عملہ ہر وقت چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ مجھے یہاں یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ دولت مند ہو جانے کے بعد میری روایتی رنگین مزاجی عود کر آئی تھی اور میں حسین لڑکیوں سے راہ و رسم بڑھانے لگا تھا۔ میرا ہر روز روز عید تھا اور ہر شب شب برات۔ مگر بہت سی حسیناؤں سے بیک وقت دوستی کے باوجود مجھے پوجا اکثر یاد آتی

تھی۔ میں اس کا خیال دل سے نہیں نکال سکتا تھا۔ دنیا کی ہر آسائش مجھے میسر تھی۔ اب کوئی ارمان باقی تھا تو یہی کہ چمپون مجھ سے اس کی شادی کا انتظام کر دے۔ لیکن وہ اس طرف آ ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے ایک اہم کام لینے کے بعد ہی اس سے میری ملاقات کروائے گی۔

چودھویں کی رات تھی۔ آٹھ بجے شب میں کلب سے واپس لوٹا تو نینا نامی ایک حسین و جمیل دوشیزہ میرے ساتھ تھی۔ گداز جسم کی اس پرکشش لڑکی سے میری ملاقات چند ہی روز پہلے ہوئی تھی۔ میں گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے میرے دام میں آ جائے گی۔ وہ فلرٹ ٹائپ لڑکی لگتی نہیں تھی۔ اکثر وہ درمیانی عمر کی ایک ماڈرن سی خاتون کے ساتھ کلب آتی تھی جو غالباً اس کی خالہ تھی۔ خالہ خود ماڈرن ہونے کے باوجود اپنی بھانجی کی سخت نگرانی کرتی تھی۔ لیکن میں نے کسی طرح اسے شیشے میں اتارنے کا معرکہ سرانجام دے ہی ڈالا۔ میں نے اس پر ایک دو آرمودہ نسخے آزمائے تھے جس کے بعد وہ پکے ہوئے آم کی طرح میری جھولی میں آ گری تھی اور اب میرے ساتھ میری کار میں بیٹھی تھی۔ کار میں خود چلا رہا تھا۔ ڈرائیور کو میں نے کلب ہی سے چھٹی دے دی تھی۔ راستے میں ایک شاپنگ پلازہ دیکھ کر نینا نے کچھ ملبوسات خریدنے کی فرمائش کر دی۔ میں اسے اندر لے گیا اور پانچ چھ ہزار روپے کی شاپنگ کروادی جس سے وہ اتنی خوش ہوئی کہ مجھ پر کچھ نچھی جارہی تھی۔ اس زمانے میں ہندوستانی کرٹسی میں یہ اچھی خاصی رقم تھی مگر مجھے اس رقم کے خرچ ہونے کا کوئی ملال نہ تھا۔ وہ اتنی حسین لڑکی تھی کہ اس کے حصول کے لئے اتنی رقم خرچ کرنا معمولی بات تھی۔ اس سے بڑی بڑی رقمیں تو میں یونہی گنوا چکا تھا۔

نینا کو ساتھ لے کر میں اپنے بنگلے پہنچا تو گھر میں میرے خاص ملازم کے سوا کوئی نہ تھا۔ نینا کو میں نے خواب گاہ میں چھوڑا اور خود ایک کام سے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ وہاں ملازم کو طلب کر کے میں نے اسے تاکید کی کہ اگر کوئی ملاقاتی آئے تو اسے ٹال دیا جائے۔ چند دیگر ہدایات دے کر میں نے اسے چلتا کیا۔ اس کے بعد میں نے خواب گاہ کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ اچانک چمپون وہاں نمودار ہو گئی۔

”تم۔۔۔۔۔؟“ میں نے ٹھٹھک کر کہا۔ ”اس وقت یہاں۔۔۔۔۔؟“

”کیوں میں یہاں نہیں آ سکتی؟“ وہ بھنویں اچکا کر بولی۔ اس کے لبوں پر ایک شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ ضرور آؤ مگر۔۔۔۔۔“

”فکر نہ کرو میں تمہارے رنگ میں بھنگ ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی! میں تو تمہیں ایک اچھی خبر سنانا چاہتی ہوں۔“

”کیا؟“

”تمہاری پوجا مسلمان ہو گئی۔“



”واقعی؟ یہ تو تم نے بہت اچھی خبر سنا لی ہے!“

”مت بھولو کہ یہ سب میرا کارنامہ ہے۔“ اس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”یو آر ریلی گریٹ!“ میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”بونی..... ایک بات پوچھوں؟“ اس نے میری ٹھوڑی اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا اس لمحے اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”جو پوچھنا ہے جلدی پوچھو اندر نینا میرا انتظار کر رہی ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اس نے میرے سر پر چپٹ لگائی اور بڑی رازداری سے سرگوشی کی۔

”تم میری نظروں کے عین سامنے جس ارادے سے اندر جا رہے ہو اس پر تمہیں شرم نہیں آ رہی.....؟“

”میری بات چھوڑو اپنی بات کرو۔“ میں نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”تمہیں خود اس وقت یہاں کھڑے رہنے پر راج نہیں آ رہی؟“

وہ شرمندہ ہو گئی۔

”تم سے باتوں میں نہیں جیتا جاسکتا..... خیر چھوڑو میں تمہیں ایک اور بات بتانا چاہ رہی تھی مگر کچھ دیر بعد بتاؤں گی۔ فی الحال تم اندر جاؤ۔“

”نہیں۔ تم نے جو بتانا ہے وہ ایک ہی مرتبہ بتادو۔“ میں نے اصرار کیا۔

”نہیں۔ تم جاؤ.....“ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔

میں خواب گاہ میں چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ نینا ایک صوفے پر نیم دراز تھی اور ”پلے بوائے“ کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں بلوریں جام تھا جس میں شیمپین بھری ہوئی تھی۔ وہ بڑی ادا سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کا ہلکا سا گھونٹ بھر لیتی تھی۔ مجھے نینا کا یہ بے تکلفانہ انداز بہت اچھا لگا۔ ایسی لڑکیاں مجھے بے حد پسند آتی تھیں جن کے ہاں کوئی جھجک نہ ہو۔ جھجک کھل کھیلنے میں مانع ہوتی ہے اور میں خلوت کے لمحوں میں جھجک اور حجاب پسند نہیں کرتا۔ بہر حال میں مسکراتا ہوا نینا کی طرف بڑھا اور اس کے پہلو میں نیم دراز ہو کر مے نوشی میں مصروف ہو گیا۔ نینا کا حسین اور گداز قرب مجھ پر مدہوشی طاری کرنے لگا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میرا سرور اور جوش پہلے سے سوا ہوتا گیا۔ نینا بھی کھلنے لگی تھی۔ اس نے مجھے سرشار کر دیا۔

وال کلاک نے ساڑھے گیارہ بجائے تو نینا چونک کر اٹھ بیٹھی اور مجھ سے درخواست کرنے لگی کہ اب میں اسے گھر پہنچا دوں۔ میرا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ واپس جائے مگر جب اس نے اسی ہفتے دوبارہ آنے پر رضامندی ظاہر کی تو میں نے اجازت دے دی۔ وہ اٹھ کر واش روم گئی اور واپسی کی تیاری کرنے لگی۔

میں کی تیاری ہو گیا۔ دروازے کے قریب وہ مجھ سے پیٹ کی اور میرے کندھے پر اپنا سر رکھتے ہوئے بولی:

”میرا تمہارے پاس سے جانے کو دل نہیں چاہ رہا مگر مجبوری ہے میری آنٹی بارہ بجے کے بعد میرا گھر سے باہر رہنا پسند نہیں کرتیں۔“

”تمہاری آنٹی دیکھنے میں تو خاصی ماڈرن ہیں پھر اتنی سختی کیوں؟“ میں نے اسے بھیختے ہوئے کہا۔

”بس بڑی جوہنیں! بڑے اپنا وقت گزار کر چھوٹوں پر سختی کرنے لگتے ہیں.....“

”میرے خیال میں ٹھیک ہی کرتے ہیں..... اپنے تجربے سے انہیں پتہ ہوتا ہے کہ چھوٹوں کو آزادی دی جائے تو وہ کیا کیا گل کھلاتے ہیں.....!“ میں نے اس کی گدگدی کی۔

”تم کون سے بزرگ ہو چھوٹوں ہی میں شامل ہو۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ”اور گل بھی خوب کھلاتے ہو.....!“

میں نے اس کی کان کی ٹو پر کاٹ لیا۔ اس نے ہلکی سی سسکاری بھری۔

”میری طبیعت پتہ نہیں کیوں متلا رہی ہے؟“ وہ مجھ سے الگ ہو کر اچانک پریشانی سے کہنے لگی۔

”یوں لگ رہا ہے جیسے قے آنے لگی ہو۔“

”واش روم چلی جاؤ۔ اور دوش کر دو۔ میں نے اسے مشورہ دیا۔

وہ واش روم چلی گئی۔ اس اثناء میں میں گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر آ گیا تاکہ گاڑی پورج سے باہر نکال لوں۔ میں گاڑی کے قریب پہنچا تو ستون کی آڑ سے چمپون نمودار ہوئی۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

”بونی..... اب تم اس لڑکی کو گاڑی میں بٹھاؤ اور سیدھے سائل سمندر پر لے جاؤ۔“ اس نے سامنے آتے ہی نہایت واضح اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا انداز حکمیہ تھا۔

”کیوں؟“ بے اختیار میرے منہ سے یہ سوال نکل گیا۔

”میں جس طرح کہہ رہی ہوں اسی طرح کرو۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اور سنو۔ کیا تم جانتے ہو یہ لڑکی کون ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ اس نائیک ٹریا بانی کی اکلوتی بیٹی ہے جس نے تمہاری بہن نوشی کو گھنگرو پہنا کر ناپنے پر مجبور کیا تھا..... اور جسے تم جہنم واصل کرنا چاہتے تھے۔“

”نہیں.....!“

”میری بات کا یقین کرو۔ یہ اسی کی بیٹی ہے۔ یہاں اپنی خالہ کے پاس رہتی ہے اور ماڈلنگ سیکھ رہی ہے۔ اس کی ماں نے اسے کوٹھے پر بٹھانے کی بجائے یہ راہ اس لئے اختیار کی ہے کہ اس میں



زیادہ پیسہ ہے اور موتی آسامیاں پھانسنے کے زیادہ چاس ہیں۔ یہ چالاک لڑکی تمہارے قریب یوہی نہیں آگئی۔ اسے معلوم ہے کہ تمہارے پاس بہت دولت ہے۔ یہ تمہیں پھانسنے کے چکر میں ہے۔ بہر حال تمہیں یہ سب کچھ بتانے کا مقصد یہ تھا کہ دشمن سے بدلہ اتارنے کا یہ سنہری موقع ہے۔۔۔۔۔

چمپون کے انکشاف نے میرے جذبہ انتقام کو یکدم جگا دیا۔ میرا دماغ تیزی سے اس رخ پر سوچنے لگا کہ مجھے نائیکہ سے انتقام لینے کا یہ شاندار موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ لیکن میرا ذہن واضح نہیں تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ چمپون میرا ذہن پڑھ چکی تھی۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نہایت پراسرار انداز میں سرگوشی کی۔

”تم اس لڑکی کو قتل کر دو بوبی۔“

”قتل؟“

”ہاں! تمہیں ویسے بھی اسے میری خاطر مارنا ہی تھا۔ یاد کرو تم نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔۔۔۔۔ اس وعدے کی رو سے ہر پورن ماشی (چودھویں) کی رات تمہیں میری خاطر ایک حسین اور پرکشش نوجوان لڑکی مارنا پڑے گی۔۔۔۔۔ کیونکہ نوجوان حسین لڑکیوں کا خون میری غذا ہے۔ یہی میری سدا بہار جوانی اور بقاء کا راز ہے۔ اس کے بغیر میرا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ تم تیار ہونا؟“

چمپون کی بات سن کر میرا سارا جسم سن ہو گیا۔ ”قتل۔۔۔۔۔ ہر ماہ!“ بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ پھسل پڑے۔

”قتل تمہارے لئے کون سی بڑی بات ہے؟“ چمپون کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ ”اب تک تم کئی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔۔۔“ میں بوکھلا ہٹ کا شکار ہو گیا۔

”اگر مگر کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”تمہیں اپنے وعدے کا پاس کرنا ہو گا۔ انکار کا مطلب یہ ہو گا کہ تم بد عہد ہو اور بد عہدی میرے نزدیک ناقابل معافی جرم ہے۔ میں وعدہ خلاف شخص کی دشمن بن جاتی ہوں اور میری دشمنی کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے تم اس سے خوب واقف ہو۔“

چمپون کی باتوں میں چھپے پیغام کو محسوس کر کے میں کانپ اٹھا۔ میرا پورا جسم ایک لمحے میں پسینے میں نہا گیا۔ ذہن میں جہان سا برپا ہو گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اسی لمحے مجھے نینا کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ چمپون نے بھی وہ آواز سن لی تھی۔ وہ یکدم نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

نینا میری طرف آرہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں اپنے آپ پر قابو پانا چاہتا تھا تا کہ اسے میری بدلی ہوئی کیفیات کا اندازہ نہ ہو سکے۔

قریب آئی تو میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے لئے دروازہ کھولا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ ملازم گاڑی

اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر انہیں ملنا ہوا اور رر سے باہر آ گیا۔ اس نے لپک کر بیٹھوں دیا۔ گاڑی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ میں نے کنکھیوں سے نینا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک خمار ٹپک رہا تھا۔ جس سے وہ پہلے سے بھی زیادہ پرکشش اور پیاری لگ رہی تھی۔ اس کا حسین پیکر اور زندگی سے بھرپور سراپا دیکھ کر دل نہیں مانا کہ اسے موت کے حوالے کر دوں۔ لیکن چمپون کا حکم بڑا واضح تھا۔ اس سے سرتابی کی مجال مجھ میں نہیں تھی۔ میں اس کی دشمنی کے نتائج آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ جانتے بوجھتے اس کی دشمنی مول نہیں لی جاسکتی تھی۔ علاوہ ازیں میرے پاس اب جو کچھ تھا۔۔۔۔۔ زندگی، دولت، آزادی۔۔۔۔۔ وہ چمپون کی مرہون منت تھی۔ میں نے خود کو باور کرایا کہ نینا کو مار ڈالنے کی ایک اور معقول وجہ بھی میرے پاس ہے۔ اس کی ماں نے میری بہن کو ناپنے پر مجبور کیا تھا اور بالواسطہ اس کی خودکشی کا باعث بنی تھی۔ میں اس کی اکلوتی بیٹی کو قتل کر کے اس سے ویسا ہی بدلہ لے سکتا تھا۔ لیکن متفرق خیالات کی یلغار کے باعث میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکا۔ اسی اثناء میں گاڑی اس چوک میں پہنچ گئی جہاں سے بائیں طرف نینا کے گھر کا راستہ تھا اور دائیں جانب ساحل سمندر۔ اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ کسی نادیدہ طاقت نے گاڑی کو زبردستی دائیں جانب موڑ دیا ہے۔ جونہی گاڑی ساحل کی طرف مڑی نینا نے چونک کر مجھے دیکھا اور حیرانی سے بولی۔

”ڈیر تم مجھے کدھر لے جا رہے ہو، میرا گھر اس طرف تو نہیں!“

اس وقت آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ میں نے چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رومانٹک لہجے میں کہا۔

”جان ایک چاند آسمان پر ہے تو دوسرا میرے پہلو میں اتر ا ہوا ہے۔۔۔۔۔ جی چاہ رہا ہے زمین کے اس چاند کو لے کر ساحل سمندر پر جاؤں اور آسمان کے چاند کے مقابل لا کر اس سے کہوں۔“ ”میرا چاند تم سے لاکھ درجے زیادہ پیارا ہے۔“

میرے منہ سے اپنی تعریف سن کر وہ خوشی سے نہال ہو گئی اور میرے کندھے سے سر ٹکا کر خود فراموشی کے عالم میں بولی۔

”جی تو میرا بھی نہیں چاہتا کہ یہ رومان پرور رات گھر پر سوتے ہوئے گزاروں مگر مجبور ہوں۔۔۔۔۔ خیر تھوڑی دیر کے لئے ساحل پر گھومنے میں کوئی حرج نہیں۔“

”آئی ایم ریلی تھینک فل ٹو یو۔۔۔۔۔“ میں نے جواب دیا۔

جس وقت ہم ساحل پر پہنچے اس وقت بارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اس سناٹے میں سمندر کی طوفانی لہروں کا شور بڑا ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ لہریں چیختی چیختی ہوتی چودھویں کے چاند کو اچکنے کی کوشش کر رہی تھیں اور اس میں ناکام ہو کر غضب ناک انداز میں ساحلی چٹانوں سے



سرگرم رہی تھیں۔ میں نے ایک ریتلے ٹیلے کی آڑ میں گاڑی روک دی اور نینا کو باہر لے لوں گا۔ وہ باہر آئی تو میں نے پیار سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے ساتھ لے کر ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں اسے گاڑی سے دور لے گیا۔

”مجھے تمہارے ساتھ یوں چلنا بڑا اچھا لگ رہا ہے۔“ اس نے مدھرا آواز میں کہا۔

”مجھے بھی۔“ میں نے اس کے گال پر بوسہ دیا۔

”مجھ سے آج تک کسی نے اتنا پیار نہیں کیا۔ اے کاش یہ لمحے امر ہو جائیں۔“ اس نے آہ بھری۔ جب اس نے یہ کہا اس وقت ہم ایک ویران جگہ پہنچ چکے تھے۔ اسی لمحے مجھے اپنے کان میں چپوں کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی:

”بولی بس۔ اب میں مزید صبر نہیں کر سکتی۔ اسے ابھی اور اسی وقت دبوچ لو اور گلا گھونٹ کر مار ڈالو۔“

”بہت مشکل ہے۔ مجھ سے یہ سب نہیں ہوگا۔“ میں نے بے اختیار جواب دیا۔

”کیا بہت مشکل ہے جان؟“ اضطرابی کیفیت میں میرے منہ سے نکلا ہوا وہ جملہ سن کر نینا نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نک۔۔۔ کچھ نہیں۔“ میں بری طرح گڑبڑا گیا۔

”محبوب۔۔۔ کیا تم میرا حکم نہیں مانو گے؟“ چپوں کی سرگوشی دوبارہ ابھری۔ لیکن اس کے لب و لہجے میں اس بار ایسی خوفناک غراہٹ تھی جیسے کوئی خونخوار درندہ اشتعال میں آ گیا ہو۔ اس کی غراہٹ سن کر میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ معا میری کیفیت ایسی ہو گئی جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ میرا سر بھاری ہو گیا اور مجھے خود پر کوئی اختیار نہ رہا۔ میں نے جنونی کیفیت میں ایک لخت اس لڑکی کی گردن دبوچ لی۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف یوں دیکھا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ مجھ جیسا پیار کرنے والا مرد اسے مارنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری آہنی انگلیوں کا حلقہ اس کی نازک گردن پر تنگ ہوتا چلا گیا۔ اس کا جسم ماہی بے آب کی طرح میرے شکنجے میں تڑپ رہا تھا اور حلق سے خرخراہٹ اور اکھڑی اکھڑی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔ آنکھیں خوف و ہشت اور تکلیف کے باعث حلقوں سے باہر ابل پڑی تھیں۔ پھر اس کے جسم نے دو تین شدید جھٹکے کھائے اور میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ میں نے اسے بے دردی سے ساحل کی گیلی ریت پر پھینک دیا۔

”بولی! تم نے میرا کام کر دیا میں تم سے بہت خوش ہوں۔“ چپوں کی مسرت میں ڈوبی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

اب یوں کرواں کی تھوڑی لے پیچے اپنے بوٹ کی ٹوک سے زوردار تھوکر ماروتا کہ خون ابل پڑے۔۔۔ میں اس کا گرم گرم جوان خون پینے کے لئے بے تاب ہوں۔“

میں نے چپوں کی ہدایت پر فوراً عمل کیا۔ میرے بوٹ کی ٹھوکر جو نہی مطلوبہ مقام پر لگی وہاں سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ جو نہی یہ ہوا میرا سر یکدم ہلکا ہو گیا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں واپس لوٹ آئیں۔ میں دوبارہ ہوش میں آ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ میں نے نینا کو مار ڈالا ہے میں سرتاپا لرز اٹھا اور خوف کے عالم میں اُلٹے قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ اسی لمحے میں نے ایک بڑی سی خون آشام چمکاڈر کو فضا میں پھڑ پھڑاتے اور نینا کی لاش کی طرف غوطہ لگاتے دیکھا۔ خوف کی ایک لہر میرے سارے وجود میں دوڑ گئی۔ میں تیزی سے پلٹا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

☆.....☆.....☆



میں صبح دس بجے تک محو خواب رہا۔ نوکر دستک نہ دیتا تو شاید میں دوپہر تک سویا رہتا۔ چائے کے ساتھ تازہ اخبار آیا تو میں نے بے تابی سے جرائم کے صفحے کو کھنگالنا شروع کیا۔ دفعتاً میرے عقب میں سرسراہٹ ہوئی اور چمپون کی شوخ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”اس اخبار میں کیا ڈھونڈ رہے ہو بولی۔ نینا کی لاش صبح آٹھ بجے دریافت ہوئی ہے جبکہ یہ اخبار رات کو شائع ہوا ہوگا۔“

”میری عقل کو دیکھو.....“ میں نے ہنستے ہوئے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ”لگتا ہے گھاس چرنے لگی ہے۔“

”کبھی کبھی اسے گھاس چرنے دیا کرو صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔“ وہ چبکی۔

اس نے گلابی رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی اور بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ رات بھر میں اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے تھے۔ مجھے اپنی طرف نگاہ شوق سے دیکھتا پا کر وہ مترنم آواز میں ہنسی۔

”ایسے نندیدوں کی طرح کیا دیکھ رہے ہو؟“

”دیکھ رہا ہوں کہ رات بھر میں تمہارا حسن و جمال پہلے سے فزوں تر ہو گیا ہے۔“

”یہ سب نینا کا صحت مند خون نوش جان کرنے اور پورنما کی کرنوں اور سمندر کی شوریدہ سرلہروں میں غسل کرنے کا کرشمہ ہے۔ میری جوانی اور عمر کو جلا اسی طرح حاصل ہوتی ہے۔“

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی: ”تم چاہو تو میں تمہیں سدا جوان رہنے کا نسخہ عطا کر سکتی ہوں.....“

”واقعی.....؟“ میں نے بے یقینی سے کہا۔

”کیوں نہیں۔ میرے لئے یہ چنداں مشکل نہیں۔ مگر اس طرح کی چالیس بلیوں (قربانیوں) کے بعد۔ اگر تم نے لگاتار چالیس پورن ماشی کی راتیں مجھے اسی طرح کی جوان اور صحت مند دوشیزاؤں کا خون فراہم کیا تو پھر آئندہ چالیس برس کے لیے میں اس ضرورت سے بے نیاز ہو جاؤں گی۔ اس خدمت کے بدلے میں تمہیں پائیدار جوانی کا تحفہ عطا کروں گی۔“

چمپون کی شرط نہایت کڑی تھی مگر اس کے بدلے وہ جو شے مجھے عطا کرنے والی تھی اس کے لیے کچھ بھی کیا جاسکتا تھا۔ انسانوں نے آج تک جن خواہشات کو سب سے زیادہ پالا ہے اس میں یہ خواہش سر فہرست رہی ہے اور تا قیامت رہے گی۔

”میں تمہارے لیے چالیس بلیاں ضرور مہیا کروں گا۔“ میں نے پُر عزم لہجے میں کہا۔

”میری طویل ترین زندگی میں گنتی کے چند جوان مرد ہی ایسے گذرے ہیں جنہوں نے یہ شرط پوری کی اور یوں دائمی جوانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں تمہارے دادا رئیس احمد خان کا دوست



عقب سے خون پینے کی ہولناک آوازیں آرہی تھیں۔ چمپون خون آشام چمگادڑ کے روپ میں نینا کا خون پٹر پٹر پی رہی تھی۔ مجھے اس لمحے اس سے بے پناہ خوف محسوس ہوا۔ میں جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

نہشتہ پشتم میں گاڑی تک پہنچا اور کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا اور جلدی جلدی گاڑی اسٹارٹ کی۔ ایکسیلیٹر پر میرے پاؤں کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ پیسے زور سے چرچرائے اور گاڑی شدید ہچکولے کھاتی ہوئی نہایت سرعت سے آگے بڑھی۔ چوک تک پہنچنے میں مجھے بمشکل پانچ منٹ لگے۔ وہاں خوب روشنی تھی اور اکاڈکا گاڑیاں بھی گذرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ رونق دیکھ کر میرے حواس کافی حد تک بحال ہو گئے۔ میں نے رفتار قدرے کم کر دی اور اپنی کٹھنی کی سمت روانہ ہو گیا۔

میرا وفادار نوکر جاگ رہا تھا۔ جونہی میں نے گیٹ پر پہنچ کر ہارن دیا وہ دوڑا آیا۔ جب میں گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے باہر نکلا تو اس نے کہا۔

”صاب کچھ دیر پہلے ایک بیگم صاحبہ کا فون آیا تھا۔“

”کون تھیں؟“ میں نے بے خیالی سے پوچھا۔

”میڈم رقیہ نام بتایا تھا۔“

”میرے ذہن میں بجلی کا کوند اسالیکا۔ میڈم رقیہ نینا کی خالہ کا نام تھا۔“

”کیا کہہ رہی تھیں؟“ میں نے اپنی آواز کے ارتعاش پر بمشکل قابو پایا۔

”پہلے آپ کا پوچھا تھا۔ میں نے بتایا کہ صاب گھر پر نہیں ہیں۔ پھر کر بد نے لگیں کہ کہاں ہیں۔“

ضروری بات کرتی ہے۔ ان کے ساتھ میری بھانجی آئی ہوگی۔ بہر حال میں نے ٹال دیا کہ مجھے کچھ اہم نہیں ہے۔“

”اچھا کیا۔“ میں نے آہستگی سے کہا اور بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔

گھڑیاں دو بج رہی تھیں۔ میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور لائٹ بجھا کر لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں میں

اتری ہی تھی کہ ذہن کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پلگ نکال دیا۔



مہندر پر تاب بھی تھا۔ وہ مسکرائی۔  
میرے کان کھڑے ہو گئے۔ دادا جان اپنے اس دوست کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔  
”میں نے دادا جان سے یہ نام بار بار سنا ہے۔“ میں نے کہا۔  
”ضرور سنا ہوگا۔ وہ ان کا آئیڈیل تھا۔ کیوں نہ ہوتا؟ میں نے اسے اپنے لئے منتخب کیا تھا اور اس پر  
اپنی عنایات کی بارش کر دی تھی۔ تمہارے دادا جان بھی میرے معمول کے تمنائی تھے۔ لیکن جانتے تھے کہ  
ایسا ممکن نہیں۔ جو کچھ وہ خود حاصل نہ کر سکے۔ تمہیں دلانے کی کوشش کرنے لگے۔“  
وہ سر بستہ رازوں سے پردہ اٹھا رہی تھی اور میں حیرت سے اسے تک رہا تھا۔

”ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”دادی جان تمہیں پہچانتی تھیں؟“

”ہاں۔ ایک بار مہندر پر تاب کے ساتھ میں اس کی دلہن کی حیثیت سے ممبئی میں ان کے گھر گئی تھی۔  
بعد میں تمہارے دادا جان نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں درحقیقت ایک ماورائی مخلوق ہوں۔۔۔۔۔“  
”دادا جان کو کیسے پتہ تھا؟“

”وہ مہندر کے ہمراز تھے۔۔۔۔۔ وہ ان سے ہر بات شیئر کرتا تھا۔“

”اب میں سمجھا کہ جب دادا جان مجھے ساحل سمندر پر لے جاتے تھے تو دادی جان انہیں کیوں روکتی  
اور کہتی تھیں کہ اسے کیوں جانتے بوجھتے آگ میں دھکیل رہے ہیں؟“ میں نے دل میں سوچا۔  
”میں نے جو بات کی ہے اس کے متعلق تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
”یقیناً میں بھی سدا جوان رہنا چاہتا ہوں۔“ میں مسکرایا۔

”خواہش تو جنت کی بھی سب رکھتے ہیں، مگر اس کے لئے جو شرائط ہیں ان پر کوئی کوئی پورا اترتا

ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔ انگریزی کا مقولہ ہے۔ First deserve then desire۔

”تم انگریزی بہت اچھی بول لیتی ہو۔“

”مجھے دنیا کی ہر زبان پر عبور حاصل ہے۔ میں متروک زبانیں مثلاً عبرانی، اشوری اور سنسکرت بھی  
جانتی ہوں۔ میں نے بابل و نینوا، بلاد مصر، ٹیکسلا اور موجوداڑ کی تہذیبوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے وقت کی  
دھول میں گم ہوتے دیکھا ہے۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”تم واقعی عظیم اور سراپا اسرار ہو چمپون۔“ میں نے مرعوب ہو کر کہا۔

”تم چاہو تو میں تمہیں بھی ان تہذیبی ادوار میں لے جاسکتی ہوں۔“ اس نے بڑے موڈ میں کہا۔

”تم سچ کہہ رہی ہو چمپون؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”تم مجھے ازمنہ قدیم کی سیر کروا

سکتی ہو؟“

”اور نہیں تو کیا۔۔۔۔۔ پر ابلم یہ ہے بولی کہ تم ابھی تک مجھے سمجھ ہی نہیں پائے۔“

”آہستہ آہستہ سمجھوں گا۔ تم ساگر کی طرح گہری اور پراسرار ہو۔ ساگر کو آج تک کون پوری طرح  
سمجھ پایا ہے۔“ میں نے خوشامدی لہجہ اختیار کیا۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں۔ پولیس نینا کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے گئی ہے۔ اس کی خالہ کو  
بھی اطلاع مل چکی ہے۔ اسے تو فی الحال میں کوئے میں ڈال آئی تھی۔ اب کوئی پکا بندوبست کروں  
گی۔۔۔۔۔ ذرا پولیس کو بھی کسی دوسرے رُخ پر ڈالنا ہے۔“

”گاڑی میں نینا کے کچھ تحائف پڑے ہیں، انہیں بھی ٹھکانے لگاتی جانا۔“ مجھے یاد آ گیا۔

”تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فوراً دلی جانے کی تیاری کرو۔ انڈین ایئر لائن کی ایک بجے  
والی فلائٹ پر تمہاری سیٹ بک ہے۔ ٹکٹ یہ رہا۔“ اس نے کنفرم ٹکٹ میری طرف بڑھایا۔

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”میں دلی کس لیے جا رہا ہوں؟“

”اتنی جلدی بھول گئے؟ یاد کرو میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا۔“

”کون سا وعدہ؟“

”پوچھا کو ملانے کا وعدہ! کیا بھول گئے؟“

”اچھا تم مجھے پوچھا سے ملانے والی ہو۔۔۔۔۔؟“ میں نے خوشی سے مغلوب ہو کر پوچھا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ بس اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تم ایک ماہ کے لیے مدراس سے باہر جا رہے ہو۔ ظاہر  
ہے بنی مومن یہاں تو نہیں گزارو گے۔“

”او یو آر ریئلی گریٹ۔۔۔۔۔“ میں نے ٹکٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

”ڈونٹ مینشن اٹ!“ وہ مسکرائی۔

☆.....☆.....☆

دلی پہنچ کر میں نے کنات پبلس میں واقع ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کیا۔ دو دن چمپون کا منتظر رہا،  
مگر وہ نہیں آئی۔ تیسرے روز سہ پہر کے وقت جب میں ایک شاپنگ پلازا میں گھوم رہا تھا، مجھے منیاری کی  
دکان میں چند عورتوں کے درمیان مناسب بدن کی ایک برقعہ پوش نوجوان لڑکی نظر آئی جس نے آنکھوں  
پر چشمہ لگا رکھا تھا اور نقاب اٹھایا ہوا تھا۔ میں کچھ فاصلے سے بے خیالی میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ مجھے  
اپنے کان کے قریب چمپون کی سرگوشی سنائی دی۔

”بولی۔۔۔۔۔ کیا پہچان نہیں رہے؟ یہ تمہاری پوجا ہے۔ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس کا اسلامی نام  
راجیلہ ہے۔“



”کیا واقعی یہ وہی ہے؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ کیونکہ اس کا رنگ دودھ کی طرح سفید لگ رہا تھا ایک عجیب چمکتا ہوا رنگ شاید یہ ایمان کا نور تھا جو اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔  
”بالکل وہی ہے۔“ وہ چبکی ”اچھا ٹھہرو میں اس کے ذہن میں خیال ڈالتی ہوں کہ وہ چشمہ اتارے اور دکان سے باہر آئے۔“

چند لمحے بعد میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی چشمہ اتار چکی تھی اور دکان سے باہر آ رہی تھی۔ وہ قریب آئی تو راحت و مسرت سے میرا دل زور سے دھڑکا۔ وہ واقعی میری پوجا تھی۔ میں بے قرار ہو کر اس کی طرف لپکا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹھکی اور گنگ ہو کر بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے سانس زیر و زبر ہو رہے تھے۔ وہ جذباتی ہیجان کا شکار نظر آ رہی تھی۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا۔ اس نے جھٹ نقاب چہرے پر ڈالا اور بجلت واپس دکان میں چلی گئی۔

”سنو.....“ مجھے اپنے کان کے قریب چپوں کی سرگوشی سنائی دی۔ ”اس نے تمہیں پہچان تو لیا ہے مگر خفا ہونے کے سبب بات نہیں کی۔ دوسرے وہ گوگو کی کیفیت سے دوچار ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد وہ کسی ”ہندو نو جوان“ سے راہ و رسم رکھے یا نہیں۔ اس کا ایمان کہہ رہا ہے کہ اسے ایک ہندو نو جوان سے ہرگز نہیں ملنا خواہ وہ ماضی میں اس کا محبوب ہی کیوں نہ رہا ہو!“

”سبحان اللہ!“ میرے دل سے بے اختیار راحیلہ کے لیے کلمہ توصیف نکلا۔ وہ زبانی کلامی ایمان نہیں لائی تھی بلکہ راسخ العقیدہ مسلمان لڑکی بن چکی تھی۔ اس بات نے میرے دل میں اس کی قدر کئی گنا بڑھادی۔

”اب کیا ہوگا؟“ میں نے فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے آہستگی سے کہا مبادا اس پاس کے لوگ آگاہ نہ ہو جائیں کہ میں کسی غیر مرئی وجود سے ہم کلام ہوں۔

”تم اس مارکیٹ سے باہر نکلو۔ کچھ دور ایک پارک ہے۔ اس میں داخل ہو کر گاندھی جی کے مجسمے کے قریب سنگ مرمر کے بنچ پر بیٹھ کر انتظار کرو۔ میں اسے وہاں لاتی ہوں لیکن ایک بات کا خیال رہے تم اس سے میرا تذکرہ بالکل نہیں کرو گے۔“

”تم فکر نہ کرو۔“ میں نے چپوں کی ہدایت پر عمل کیا اور پارک میں پہنچ گیا۔ گاندھی جی کا مجسمہ درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک خاموش گوشے میں تھا۔ وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں بنچ پر بیٹھ کر بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ دس منٹ بعد میں نے راحیلہ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ میکائی انداز میں چلی آ رہی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس وقت چپوں نے اسے اپنا معمول بنا رکھا ہے۔ جب وہ بالکل قریب پہنچ گئی تو چپوں نے اس کے ذہن کو آزاد کر دیا۔ اس نے اس طرح بدک کر ادھر ادھر دیکھا جیسے یکا یک گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ پہلے کی طرح

ٹھکی نقاب گرانا ہی چاہتی تھی کہ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”پوجا! مجھے پہچانو۔ میں.....“

”مم..... مجھے افسوس ہے وجہ صاحب۔ میں اب پوجا نہیں راحیلہ ہوں۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ہماری راہیں جدا ہو چکی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”راہیں جدا نہیں ہوئیں مل گئی ہیں راحیلہ!“ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”وہ محض ایک نائک تھا۔ میرا نام وجہ نہیں محبوب احمد ہے اور میں الحمد للہ مسلمان ہوں۔ یہ حالات کی ستم ظریفی تھی جس نے مجھے ایک ہندو نو جوان بننے پر مجبور کر دیا تھا۔“

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ اسے گنگ دیکھ کر میں نے کہا۔

”خدا کی قسم میں سچ کہتا ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔“ پھر اسے یقین دلانے کے لیے میں نے کلمہ طیبہ کا ورد کیا تو اس کے چہرے پر مسرت و اطمینان کے پھول کھل اُٹھے۔  
”آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ میں نے اسے بنچ پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

”مجھے پتہ ہے کہ جس طرح میں اچانک کلکتہ چھوڑ کر چلا گیا تھا تم ضرور اس پر مجھ سے ناراض ہوئی ہوگی، میں جب تمہیں اس کا سبب بتاؤں گا تو یقیناً تمہیں مجھ سے ہمدردی محسوس ہوگی۔“

وہ میرے ساتھ بنچ پر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے اپنی روداد غم سنانا شروع کی جسے وہ حیران ہو کر سنتی رہی۔ اس داستانِ خونچکاں میں اگرچہ میں نے نیلم کا ذکر بھی کیا کہ کیسے اس لڑکی کی خاطر میں نے ایک وکیل کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا تاہم یہ ذکر چپوں سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق گول کر دیا کہ وہ کوئی غیر مرئی مخلوق تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ نیلم ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی اور مشرقی پاکستان کی پولیس سے گلو خلاصی کے لئے جو مجھے وکیل کے قتل کے جرم میں گرفتار کر چکی تھی میں سرحد عبور کر کے بھارت میں داخل ہو گیا تھا۔ ٹرین میں جسٹس چوہدری کے قتل اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا اسے علم تھا۔ اُن واقعات کا سرسری ذکر کرنے کے بعد میں نے اسے اس ناگہانی حادثے کے بارے میں بتایا جس کے سبب میرے گھر والے لقمہ اجل بن گئے تھے اور میری پیاری بہن نوشین کو بمبئی کے انڈر ورلڈ کے اسمگلروں اور غنڈوں نے اغواء کر کے بازارِ حسن کی ایک نائیکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ نوشین کی دردناک موت کا احوال سن کر وہ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی اور رونے لگی۔ میں نے اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ اچھو بد معاش کو جہنم واصل کرنے کے بعد میں پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا اور چپوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر تختہ دار سے واپسی ممکن ہوئی تھی۔

میں نے صرف اتنا کہا۔



”اچھو بد معاش کو موت کے کھٹا اتار کر میں نائیکہ کو بھی اس کے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا مگر وہ کوٹھے کے پچھلے راستے سے فرار ہو گئی۔ میں نے اس کا پیچھا کیا مگر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی؟ میں اب بھی اس کی تلاش میں ہوں۔ وہ آج تک میرے ہاتھ نہیں آئی۔“

”تمہاری داستان غم سننے کے بعد مجھے اپنا دکھ بھول گیا ہے۔“ اس نے رومال سے اپنی بادامی آنکھوں کے نم گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنے پتاجی کو کھویا ہے تم سارا پر یوار کھو چکے ہو۔“

”ہمارا غم بالکل ایک جیسا ہے راحیلہ.....“ میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”تم نے بھی اپنا سب کچھ کھویا، میں نے بھی۔ اب ہم دونوں اس دنیا میں تنہا ہیں۔ میں سوچتا تھا ہم ملنا چاہیں گے تو مذہب ہمارے بیچ دیوار بن کر حائل ہو جائے گا۔ قدرت نے وہ دیوار خود بخود زائل کر دی، ختم کر دی۔ اب ہمارے مل جانے میں کسی طرح کی رکاوٹ موجود نہیں۔ آؤ ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں اور پھر کبھی جدا نہ ہوں۔“

”میں کتنی خوش نصیب ہوں۔“ وہ رونے لگی۔ ”تم مجھے دوبارہ مل جاؤ گے۔ خدا مجھ پر اتنا بڑا کرم کرے گا میں نے سوچا تک نہ تھا۔ یہ سب اس کا انعام ہے۔ میں گھر جا کر سب سے پہلے شکرانے کے نوافل پڑھوں گی۔“

☆.....☆.....☆

اس ملاقات کے چند روز بعد ایک سادہ سی تقریب میں ہم دونوں کا نکاح ہوا۔ راحیلہ کی سرپرست ایک بزرگ سید زادی بی بی کلثوم تھیں جو حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب دو کمرے کے ایک نیم پختہ مکان میں اپنے اکلوتے بیٹے جمال میاں اور بہو کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ انہوں نے ہمارے نکاح کا انتظام کیا۔ دو دن بعد ہم ان سے اجازت طلب کر کے ہنی مون کے لیے شملہ چلے گئے۔ میرے پاس خاصی رقم تھی۔ راحیلہ اور میں اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں رہے اور خوب سیر سپاٹا کیا۔ ہم دونوں بے حد خوش تھے۔ مسرت و انبساط کے وہ شب و روز اور ان کی یادیں میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

ہوٹل میں قیام کے دوران راحیلہ نے مجھ سے استفسار کیا کہ اتنی رقم میرے پاس کہاں سے آئی۔ یہ ایک فطری سوال تھا اور میں اس کے لیے تیار تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اسٹاک ایکسچینج میں سرمایہ کاری کے ذریعے اتنا پیسہ بنایا ہے کہ آرام سے چھوٹا موٹا کاروبار کر سکتا ہوں۔ اسے یقین نہیں آیا، مگر وہ خاموش رہی۔ مجھے اس کے خاموش رد عمل نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اسے اپنی مدراس کی جائیداد کے متعلق بتایا تو اسے بہت زیادہ شک و شبہ ہوگا۔ ایک صبح جب وہ سوئی ہوئی تھی اور میں باتھ روم میں تھا، چپون وارد ہو گئی۔

”باتھ روم گاؤن میں بڑے پیارے لگ رہے ہوں!“ اس نے آتے ہی کہا۔

”میں نے ہوسوں پر اسی رکھ کر اسے حاموں کر دیا۔ راحیلہ سن لے گی۔“

”اچھا میں آہستہ بولوں گی۔“ وہ جھینپ کر بولی۔

”بڑے دنوں بعد صورت دکھائی۔“ میں نے شیو کے لیے چہرے پر کریم لگاتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں نے رنگ میں بھنگ ڈالنا مناسب خیال نہیں کیا۔“ وہ مسکرانے لگی۔

”میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں، نیلم، تم نے میری دلی خواہش پوری کی۔“

”تمہاری خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔ ”لیکن دیکھو راحیلہ کو پا کر مجھے بھول مت جانا۔“

”نہیں..... تم تو میرے دل میں جاگزین ہو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”مکھن مت لگاؤ۔ بھلا میں نہیں جانتی ہنی مون کے دوران ایک بار بھی تمہیں میرا خیال نہیں آیا۔“

وہ مصنوعی ناراضی سے بولی۔

”میں چپ رہا۔ کیا کہتا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی راحیلہ کو پا کر میں واقعی اسے بھول سا گیا تھا۔“

”میں تمہیں شرمندہ کرنے نہیں آئی۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد خود ہی کہنے لگی۔ ”میں نے خود تم دونوں کو ملانے کا اہتمام کیا ہے، پھر عار دلانے کا کیا جواز؟ میں تو تمہیں صرف یہ یاد دلانے آئی ہوں کہ پانچ روز بعد دوبارہ پورن ماسی کی رات آرہی ہے۔ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟“

مجھے یاد تھا، مگر دل میں موہوم سی خوش فہمی تھی کہ چپون کو یاد نہیں ہوگا، مگر وہ یاد دلانے بنفس نفیس چلی آئی تھی۔ اس خیال سے کہ مجھے پھر کسی بے گناہ لڑکی کا خون کرنا ہوگا، میرا بدن پسینے میں نہا گیا۔ میں نے بمشکل اپنی کیفیت پر قابو پا کر اثبات میں سر ہلایا۔

”یاد ہے.....“

”گڈ! ڈیٹ از لائیک گڈ بوائز“ اس نے پیار سے میرے گال پر چٹکی لی۔

”میں پریشان ہوں نیلم.....“ میں نے قدرے توقف کے بعد لب کشائی کی۔

”کس بات سے پریشان ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”راحیلہ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اتنی رقم کہاں سے آئی جسے میں ہنی مون کے دوران اتنے مہنگے ہوٹلوں میں قیام و طعام پر خرچ کر رہا ہوں۔ میں نے بہانہ بنایا کہ اسٹاک مارکیٹ میں حصص کی خرید و فروخت سے میں نے بہت دولت کمائی ہے۔ لگتا ہے اسے میری بات پر اعتبار نہیں آیا۔ سوچ رہا ہوں مدراس کی کوٹھی اور کاروبار کا ذکر کیا تو اس کا شبہ میں مبتلا ہونا یقینی ہوگا کہ میرے پاس دولت کی ریل پیل کا سبب کچھ اور ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”ایسا کرتے ہیں اس کوٹھی اور کاروبار کوٹھکانے لگا کر رقم



تصورات سے بھی زیادہ خوبصورت ساحلی علاقہ تھا۔ حد نظر تک پھیلا ہوا سبزی مائل نیلگوں سمندر سفید ریتلے ساحل جن پر ساگر کی لہریں خوشنما گھونگے اور سپیاں بکھیر کر لوٹ جاتیں۔ ناریل کے جھنڈ، کھیریل کے جھونپڑے اور دور نزدیک بکھرے ہوئے چھوٹے بڑے ہوٹل جن میں دنیا کے ہر علاقے کے سیاح مرد اور عورتیں قیام پذیر تھے۔ البتہ گوروں اور گوریوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ دن بھر سمندر میں نہاتے دکھائی دیتے یا ساحل کی گرم ریت پر لیٹ کر غسل آفتابی کرنے میں مشغول رہتے۔ انہیں اپنی گوری سفید چڑیاں براؤن کرنے کا خط تھا۔ سچ ہے انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ ہمارے لوگوں پر سانولی یا گندی رنگت کو گورا کرنے کا بھوت سوار ہوا ہے اور وہ براؤن ہونے کو ترستے ہیں!

راحیلہ کو گوا کا ساحلی علاقہ پسند تو بے حد آیا تھا لیکن اسے نیم برہنہ عورتوں اور مردوں کو دیکھ کر سخت کوفت ہو رہی تھی۔ اس نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا اور اس کی غیرت ایمانی کے لیے یہ برہنگی اور فحاشی ناقابل برداشت تھی۔ مجھ سیاح کار کا جی بے حجاب حسن کو نظر بھر کر دیکھنے کو مچلتا تھا مگر اس کی موجودگی میں مجھے بھی نگاہ جھکانی پڑتی تھی۔ بلکہ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا کہ یہ بے شرمی اور بے حیائی ہے اس کی ہرگز اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

ایک روز دوپہر کے وقت میں اس کے ساتھ سیر سپاٹا کر کے لوٹا تو اس نے سردرد کی شکایت کی اور کہنے لگی۔

”محبوب میں اسپر وکھا کر سونا چاہتی ہوں۔“

”میں منگوادیتا ہوں۔ ڈاکٹر بلانے کی ضرورت تو نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں..... بس کچھ تھکاوٹ ہے۔ چند گھنٹے سوؤں گی تو آرام آ جائے گا۔“

”سرد بادوں؟“

”نہیں..... اس نے پیار اور تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے گھنٹی بجا کر ویٹر کو طلب کیا۔ وہ چند منٹ بعد اسپر و لے آیا۔ جب اس نے گولی پانی کے ساتھ نگل لی تو میں نے کہا۔

”تم آرام کرو میں ذرا اسٹاک آپکے بیچ کے بھاؤ معلوم کر لوں۔ نیچے میں نے ایک بروکر کی دکان دیکھی ہے۔“

اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

دراصل مجھے چپون سے ملنے کے لیے تنہائی درکار تھی۔ جونہی میں باہر نکلا لب ساحل ناریل کے ایک گھنے جھنڈ کے پاس وہ اپنے مخصوص انداز میں نمودار ہو گئی۔ آج اس نے ایک پھولدار ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ علیک سلیک کے بعد کہنے لگی۔

ڈالروں میں بدلو کر تمہارے فارن کرنسی اکاؤنٹ میں ڈال دیتے ہیں۔“

”کون سا فارن کرنسی اکاؤنٹ؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”تمہارا فارن کرنسی اکاؤنٹ جو میں ”بینک آف انڈیا“ میں کھلوانے والی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”مستقبل میں کام آئے گا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ایک آدھ دن میں تمہیں دھانسو قسم کا جاب بھی دلا دوں گی تاکہ موصوفہ کو اطمینان ہو جائے۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

”شملہ میں سخت بوریت ہو رہی ہے محبوب۔ کیا ہم کہیں اور نہیں جاسکتے؟“ لابی میں ناشتہ کرتے ہوئے راحیلہ نے مجھ سے کہا۔ مجھے اس کی بات سن کر تعجب ہوا۔ ابھی دو دن پہلے جب ہم ارد گرد کی پہاڑیوں پر گھوم رہے تھے تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ شملہ اتنی خوبصورت جگہ ہے کہ وہاں وہ اپنی ساری زندگی گزار سکتی ہے۔ میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ مجھے اپنے کان کے قریب چپون کی سرگوشی سنائی دی۔

”بوی۔ تم راحیلہ سے کہو ”گوا“ چلتے ہیں۔ وہ فوراً تیار ہو جائے گی۔“

”لیکن ”گوا“ ہی کیوں.....؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر راحیلہ متوجہ تھی۔ اس نے سن لیا۔

”کس سے کہہ رہے ہو؟“ وہ تعجب سے پوچھنے لگی۔

”کک..... کسی سے نہیں..... کسی سے بھی تو نہیں..... مم..... میرا خیال تھا تم ”گوا“ جانا چاہتی ہو۔“ میں گڑبڑا گیا۔

”میں نے کب کہا؟“ وہ بغور میرے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

”یونہی مجھے لگا کہ تم ساحل سمندر پر جانا چاہو گی۔ پہاڑ بہت دیکھ لئے نا۔“

”یہ تو تم نے بالکل درست بات کی ہے۔“ اچانک ہی وہ میری ہاں میں ہاں ملانے لگی۔ ”میں واقعی شملہ کی پہاڑیاں دیکھ کر بور ہو گئی ہوں۔ وہی چھ پہاڑیاں روزانہ!“ وہ کھکھلا کر ہنسی۔

”چلو پھر گوا چلتے ہیں۔ میں نے سنا ہے اس کے ساحل بہت خوبصورت ہیں۔ دنیا بھر سے سیاح وہاں آتے ہیں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا:

”میں ابھی ٹریول ایجنٹ سے بات کرتا ہوں۔“ ٹریول ایجنٹ چپون کے علاوہ کون ہو سکتا تھا!!

☆.....☆.....☆

اگلے روز ہم گوا پہنچ چکے تھے۔ ہم نے وہاں ایک دس منزلہ ہوٹل ”لارے“ میں قیام کیا۔ گوا میرے



”کل پورن ماشی کی رات ہے۔ تمہیں حسب وعدہ میرا کام کرنا ہے۔ یاد ہے نا؟“

”بالکل..... لیکن اتنی جلدی کسی جوان لڑکی سے راہ و رسم کیسے پیدا ہوگی؟“

”راہ و رسم کے نائک کی ضرورت نہیں۔ میں نے ایک لڑکی دیکھ لی ہے۔ میں اسی کا خون نوش جاں کرنا چاہوں گی۔ کل رات ڈنر کے وقت وہ تم سے اچانک ملے گی۔ بہر حال تم فکر مند کیوں ہوتے ہو شکار گھیر کر لانے کا فریضہ میں سرانجام دوں گی تم بس اس کا کام تمام کر دینا۔“

”ٹھیک ہے میں اپنا کام حسب منشا سرانجام دوں گا۔“

”میں نے تمہارے لیے ایک جاب کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”تمہیں یہ جاب امریکہ میں کرنا ہوگا۔“

”امریکہ! واقعی؟“ میں اچھل پڑا۔ ”میرے دل میں ہمیشہ حسرت رہی ہے کہ میں امریکہ دیکھوں۔“

”بس ہمارے ساتھ بنا کر رکھو تمہاری سب حسرتیں پوری ہوں گی۔“ وہ چہکی۔

”یو آر ریلی اے ونڈر فل وو من!“ میں نے اس کی تعریف کی۔

”ونڈر فل گرل.....!“ اس نے تصحیح کی تو میں ہنسنے لگا۔ وہ بھی ہنسنے لگی اور مجھے یوں گمان ہوا جیسے کسی مندر میں پیتل کی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

”جاب ملنے کی کیا صورت ہوگی؟“ میں نے سوال کیا۔

”جب تم واپس لوٹو گے تو ہوٹل کی لابی میں ایک بوڑھا انگریز مسٹر براؤن تمہارا منتظر ہوگا۔ وہی تمہیں جاب کی پیشکش کرے گا۔“

”مگر کیسے.....!“

”افوہ! ایک تو تم سوال بہت کرتے ہو۔“ وہ خفگی سے بولی۔ ”کیا اتنے سوالات کرنے کی ضرورت ہے۔ تمہیں اب تک اندازہ تو ہو جانا چاہیے۔“

”اچھا سوری۔ ایک تو تم خفا بہت جلدی ہو جاتی ہو۔ غصہ تو تمہاری ناک پر رکھا رہتا ہے۔“

”ویسے کچھ کچھ خفا ہونے کا سبب ہے میرے پاس۔ راحیلہ کی آمد کے بعد تم سے آزادی کے ساتھ ملنا اب خاصا دشوار لگنے لگا ہے۔ مجھے تم سے ملنے کے لیے اس کے سر میں درد کروانا پڑا..... آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا؟“

”اچھا تو یہ تمہاری حرکت تھی؟“

”حرکت؟ یہ تو بڑا Bemeaningful لفظ ہے۔ حیلہ کہو۔“ وہ تنک کر بولی۔

”تم آج چڑچڑی ہو رہی ہو..... میں معذرت چاہتا ہوں۔“ میں نے پسپائی اختیار کی تو وہ نرم پڑ گئی۔ ”ہاں دراصل پورا مہینہ ہو گیا ہے خون پئے۔ آخری دنوں میں خون کی تشنگی میرے اعصاب پر برا اثر

ڈالتی ہے۔ تم محسوس نہ کرنا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”اچھا تم جاؤ..... اب کل ہی ملاقات ہوگی۔ ایک ویران ساحل پر.....“ اس نے پراسرار انداز میں سرگوشی کی اور غائب ہو گئی۔

میں تیز قدموں سے چلتا ہوا ہوٹل کی سمت بڑھ گیا۔ جب میں نے ہوٹل کی لابی میں قدم رکھا تو میری نگاہ دائیں جانب کونے میں پڑی۔ وہاں ایک ساٹھ سالہ بوڑھا اور فرہبہ انگریز صوفے میں دھنسا یقیناً میرا ہی منتظر تھا۔ اس نے سرمئی سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ میں پر اعتماد لہجے میں اس کی طرف بڑھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا۔ جونہی میں اس کے قریب پہنچا اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بغور میری پیشانی کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں چمکا ڈڑ سے مشابہہ ایک ہلکا سا نشان تھا۔

”اوہ! آئی گاٹ ہم۔ آئی گاٹ ہم!!!“ وہ بڑبڑایا اور یک لخت میرا بازو زور سے بھینچ لیا۔

”تم یقیناً وہی ہو! بالکل وہی! خداوند تیرا شکر ہے۔ میرا آزار کٹ گیا۔ میری نجات ممکن ہو گئی!“ بوڑھا انگریز وکٹورین اسٹائل کی انگلش میں برابر بولے جا رہا تھا۔

”نو جوان تم نہیں جانتے میں نے تمہارا کس قدر طویل انتظار کیا ہے۔ مجھے ایک یہودی عالم نے بتایا تھا کہ ہند کی سرزمین پر مجھے ایک نو جوان ملے گا جو میرے لیے نجات دہندہ ثابت ہوگا۔ وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلائے گا جس میں میں مبتلا ہوں۔“

”وہ مصیبت کیا ہے مسٹر براؤن؟“

”اوہ! دیکھا تمہیں میرا نام بھی معلوم ہے۔ تم یقیناً ایک باکمال صاحب علم آدمی ہو۔ تم ماورائی ہستیوں کے منظور نظر ہو.....“ وہ پھر میری پیشانی کو گھورنے لگا۔ ”تمہیں میری مصیبت کا بھی پتا ہوگا؟“

”پتا تو ہے مگر میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”وہ سب سننے کے لئے تمہیں میرے ساتھ بیٹھنا ہوگا۔“

”میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا:

میں اپنی کہانی کا آغاز اس روز سے کرنا چاہتا ہوں جب میں اپنے چچا جیکب سے ملنے نیوجرسی گیا تھا۔ میرے ساتھ جولیا بھی تھی۔ جولیا جس کے رخسار گلابوں کی طرح سرخ تھے بال سیاہ چمکیلے تھے آنکھیں سیاہ بھنوروں کی طرح تھیں اور لب شعلہ گوں تھے۔ ہماری دوستی اس وقت شروع ہوئی تھی جب ہم آکسفورڈ یونیورسٹی میں کیمسٹری کے طلبہ تھے۔ ہم ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ اگر ہمارے حالات اجازت دیتے تو ہم کب کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں بالکل



فلاش تھا اور جولیا کی حالت بھی میرے جیسی ہی۔ ان حالات میں میرے ذہن کا بار بار اپنے امیر چچا جیکب کی طرف مبذول ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ حالانکہ دولت حاصل کرنے کے معاملے میں ان کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ جب میرے والدین حیات تھے تو وہ اکثر اپنے اس واحد عزیز کے بارے میں باتیں کرتے تھے جو امریکہ میں رہتا تھا۔ لیکن ان کی باتوں میں اس کے لئے تضحیک کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ جب وہ اس کی دولت کا ذکر کرتے تو اپنی غربت پر فخر کرتے۔

مجھے یاد ہے جب چچا کا تذکرہ ہوتا تو مجھے باہر بھیج دیا جاتا اور اگر میں سامنے رہتا تو گول مول الفاظ میں باتیں کی جاتیں جو میرے پلے نہ پڑتی تھیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ساری دولت جنوبی امریکہ کے فوج خانوں میں مشرقی یورپ اور مشرق بعید کے ملکوں سے خریدی ہوئی مجبور اور بے کس غریب لڑکیاں سپلائی کرنے کے گندے دھندے سے کمائی تھی۔ یہ بات معلوم ہونے تک میرے ذہن میں چچا جیکب کا ایسا تابدار تصور جاگزیں ہو چکا تھا کہ مجھے یہ باتیں غریب مگر حاسد رشتہ داروں کی ذہنی اختراع لگیں جو سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ دیانت داری سے بھی کوئی انسان دولت مند بن سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اپنی غربت میں مجھے چچا جیکب کا خیال ستانے لگا۔ میں نے انہیں برسوں سے نہیں دیکھا تھا۔ ہاں جب میرے والد فوت ہوئے تو انہوں نے آ کر بڑی فراخ دلی سے تدفین کے سارے اخراجات برداشت کئے تھے۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے جب میں نے انہیں خط لکھا تو اس کے جواب میں ان کا بڑا اور دبھرا خط موصول ہوا کہ ایک نہایت بوڑھا چچا برسوں سے اپنی مطالعہ گاہ میں بیٹھا اپنے واحد بھتیجے کے دیدار کو ترس رہا ہے۔

اور اس طرح ایک سہ پہر میں اور جولیا چچا جیکب کے عالی شان مکان کے دروازے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ خاصی دیر کے بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا اور فراک طرز کے کالے کوٹ میں ملبوس چچا جیکب نے مسکراتے ہوئے ہم دونوں کا استقبال کیا۔ ہم ایک بڑے نیم تاریک ہال میں داخل ہوئے جس میں قدیم مصری تہذیب کے نوادر مجسمے اور جشی قبائل کے بھالے سجے ہوئے تھے۔ کچھ بھیا نک تصاویر بھی تھیں جنہیں دیکھ کر مجھے اور بطور خاص جولیا کو جھرجھری آگئی۔ وہ ہال بہت سرد تھا اور وہاں ایک ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی جیسی پرانی کتابوں اور رسالوں سے آتی ہے۔ چچا نے مجھ سے ہاتھ ملانے کے بعد سوالیہ نظروں سے جولیا کی طرف دیکھا۔

”انکل جیکب۔ جولیا مورس سے ملنے۔“ یہ کہتے ہوئے میرا سر فخر سے بلند ہو گیا کیونکہ جولیا اس قدیمی حسن کا نمونہ تھی جسے مصوروں نے انجیل مقدس میں مذکور دو شیرازوں کی شاہکار پینٹنگز میں پیش کیا تھا۔

”تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی جولیا۔“ ان کی نخ بستہ آواز ہال میں گونجی پھر وہ ہمیں کھانے کے کمرے میں لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ چچا کچھ عجیب انداز میں لنگڑا کر چل رہے تھے۔ وہ بابا یاں پاؤں

کھسیٹ کر دامیں کے برابر لاتے تھے۔ کھانے کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے چچا نے چوکھٹ کے ساتھ چسپاں سال خوردہ نقش کو چھوا۔ ایسے نقش پرانے خیال کے یہودی اپنے دروازے پر لگاتے تھے۔ اسے چھو کر انہوں نے انگلیاں آنکھوں کو لگائیں۔ جولیا کو پارسائی کا یہ اظہار ناگوار گذرا جو اس کے چہرے کے تاثرات سے عیاں ہوتا میں نے صاف محسوس کیا۔ کھانے کا کمرہ بھی کمرہ کم اور عجائب خانہ زیادہ لگ رہا تھا۔

کھانا کھانے بیٹھے تو بڑی بد مزگی سے کھانا کھایا گیا۔ دراصل چچا کی خادمہ بہت کریمہ شکل کی دقیانوسی یہودن تھی جس نے سر پر براؤن رنگ کی وگ پہن رکھی تھی۔ جب وہ پلیٹیں رکھنے کے لیے جھکتی تو وگ کی سلائی طبیعت کو مکدر کر دیتی۔ وہ وسطی یورپ کی ایک سادہ لوح یہودن تھی جو اپنے سر پر استرا پھیرتی ہیں اور شب زفاف کے بعد اپنے بال کبھی نہیں بڑھنے دیتیں۔

”کھانے کے دوران چچا نے کہا۔“ بچو مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ تمہیں دیکھ کر مجھے کس قدر مسرت ہوئی ہے۔ براؤن! تم اتنی دیر بعد مجھ سے کیوں ملے؟“

”آپ تو جانتے ہیں میں کتنا مسرور رہتا ہوں! جولیا بتائے گی کہ مجھے لیبارٹری میں کس قدر محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہماری شادی ہونے والی ہے انکل جیکب! جونہی ہم دونوں دو تین مہینے کا اکٹھا کر لیں گے اور تھوڑا بہت سامان جمع کرنے کے قابل ہوئے تو فوراً شادی کر لیں گے۔“

”کیوں میرے بچو۔“ چچا نے بے ساختہ کہا۔ ”تم لوگ یہاں میرے پاس آ کر کیوں نہیں رہتے؟ تمہیں ویسے بھی اپنے بوڑھے چچا پر ترس کھانا چاہیے جو تنہائی کے دن گزار رہا ہے۔“ انہوں نے مرغ کی ٹانگ بھنبھوڑتے ہوئے کہا۔ ان کے ساتھ رہنے کے تصور سے میرے جسم میں جھرجھری آگئی۔

”تم کھا نہیں رہے براؤن۔ اور تم جولیا؟ تم تو چڑیوں کی طرح چگ رہی ہو! کیا تم قلو پطرہ کا مقابلہ کرنا چاہتی ہو جس نے تمام عمر سبزی ترکاری پر گزار دی! وہ اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تھی۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرائے۔ ”لیکن تم بھی کوئی کم حسین نہیں ہو۔ میں تو تم سے حسد کرنے لگا ہوں براؤن۔ تمہارے پاس درحقیقت مصری ملکہ نفرتیتی کا سانا مول سنہری مجسمہ ہے جس کے وجود میں حسن بولتا ہے۔“

ساری گفتگو کے دوران ان کی نظر جولیا کے چہرے پر جمی رہی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ جولیا اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ مگر ہم یہ سب کچھ اس لیے برداشت کر رہے تھے کہ ہمیں ایک اچھا صلہ ملنے کی امید تھی۔

جہاں تک میری بات تھی تو میں نے جرأت دکھا کر ان سے پیسے مانگنے کا پکا ارادہ باندھ لیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر انہوں نے میری درخواست قبول نہ کی تو پھر میں کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔

کھانے کے دوران چچا جیکب نے پلیٹوں پر پلیٹیں اس طرح صاف کیں جیسے انہیں زندگی میں پہلی دفعہ کھانا نصیب ہوا ہو اور آئندہ بھی ملنے کا کوئی چانس نہ ہو۔ اس کے بعد انہوں نے بدبودار سا گارسلگایا



اور یوں زور زور سے کش لگانے لگے جیسے سارا دھواں ایک دم پھیپھڑوں میں اتارنا چاہتے ہوں۔ جولیا کو تمباکو نوشی سے نفرت تھی۔ اس کا جی متلانے لگا۔ ہم نے دیکھا انہیں ناخن چبانے کی گندی عادت بھی تھی۔ یہ عادت اتنی پختہ نظر آتی تھی کہ اب ان کی انگلیوں پر ناخنوں کی جگہ گوشت نظر آتا تھا اور ان کے دانت کسی اور چیز کو چبانے کے متلاشی نظر آتے تھے۔ وہ سگار پیتے پیتے اپنی انگلی کو کاٹ بیٹھتے اور اس پر خون کی ننھی سی بوند نظر آتی۔ وہ اس بوند کو دیکھنے لگتے اور پھر انگلی منہ میں ڈال کر اسے چوسنے لگتے۔

آخر جولیا سے یہ سب برداشت نہ ہو سکا اور وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”کوئی جگہ ہے جہاں میں اپنے بال ٹھیک کر سکوں؟“

”کیوں نہیں!“ چچا جیکب نے کہا۔ ”زینے کے نیچے اس کمرے کی طرف چلی جاؤ۔“ انہوں نے اشارہ کیا۔

جولیا کے جانے کے بعد چچا جیکب مجھے اپنی مطالعہ گاہ میں لے گئے اور اپنی دیمک زدہ عبرانی کتابوں کا ذخیرہ دکھانے لگے۔ لیکن میں نے انہیں وہیں روک دیا۔

”انکل جیکب!“ میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ ہمیں پیسوں کی ضرورت ہے۔“

”آپ ہماری تھوڑی سی مدد کریں نا۔“

”تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے؟“ چچا جیکب نے یوں کہا جیسے میرے مطالبے نے انہیں حیران کر دیا ہو۔ تمہارے پاس تو جولیا کی صورت میں سارے جہان کی دولت ہے!“

”انکل جیکب!“ میں صرف اتنا کہہ سکا۔ میرا خیال تھا وہ اس موضوع سے کترار ہے ہیں۔

”اچھا چلو چھوڑو براؤن۔ یہ بتاؤ تم میری دولت اور جولیا میں سے کس کا انتخاب کرو گے؟“

”اوہ! لیکن انکل.....“ حیرت نے مجھے فقرہ مکمل نہ کرنے دیا۔

”میرے بچے! تم سب کچھ حاصل کرنے کی توقع نہیں کر سکتے۔“ وہ لمحہ بھر کور کے۔ پھر آہستہ سے کہا۔ ”میں دیکھتا ہوں..... دیکھتا ہوں تم کسے منتخب کرتے ہو۔ براؤن! عقل مند نو جوان! ایک عورت ہیرے جواہرات سے زیادہ قیمتی ہرگز نہیں ہوتی.....“

میں غصے اور ملامت کے ملے جلے جذبات لئے ان کے کہے ہوئے پر اسرار الفاظ کے گہرے معانی میں غوطے کھانے لگا۔ انہوں نے اپنی بات یہ کہہ کر ختم کر دی۔

”جب میں مروں گا تو میرا سب کچھ تمہارا ہوگا۔“

ان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر مسرت سے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میں اتنا متاثر ہوا کہ جھٹ ان کا ناخنوں سے محروم غلیظ ہاتھ چوم لیا۔ وہ کہتے رہے۔

”میرے پاس نصف ملین ڈالر یہ مکان اور کچھ دوسری جائیداد ہے.....“ میرے کان ان کی گفتگو

نہیں سن رہے تھے۔ میں تصور ہی تصور میں ان کی گدے دار آرام کرسی میں دھنسا خوابوں کے جزیرے میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے خود کو ایک شاندار کار میں براجمان لندن پیرس اور نیویارک کی سڑکوں پر گھومتے دیکھا۔ بڑے بڑے جہازوں کی لگژری کلاس میں حسین ایئر ہوسٹس مجھے مہنگی شراب پلا رہی تھیں۔ عالیشان ہوٹلوں میں اور گالف کلبوں میں میرا استقبال ہو رہا تھا۔ معاً میں اچھل پڑا۔ میں نے جولیا کو خوابوں کی اس سرزمین سے دیس نکالا کیوں دے دیا تھا؟ دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ میں مطالعہ گاہ میں تھا ہوں۔ میں سپنے دیکھنے میں مصروف تھا اور چچا وہاں سے کھسک چکے تھے۔ میں جلدی سے باہر لپکا۔ زینے کے قریب مجھے ملی جلی سرگوشیاں سنائی دیں تو میں نے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا جہاں جولیا بال ٹھیک کرنے گئی تھی۔ چچا نے جولیا کو بھیج رکھا تھا۔ ان کے مکروہ منہ سے یہ الفاظ نکلے جنہوں نے میری سماعت پر بجلی گرا دی۔

”میری فاختہ۔ اب تم میری ہو۔ تمہارے محبوب نے تمہیں میرے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔“

جولیا ٹپ اٹھی۔ ”اگر آپ براؤن کے چچا نہ ہوتے تو میں شور مچا کر ساری دنیا کو بتا دیتی کہ آپ کس قسم کے بد قماش انسان ہیں۔ مجھے جھوڑ دیتے اور میرے راستے سے ہٹ جائیے!“

”اچھا اچھا میری بلبل! اگر تم کہتی ہو تو یہی سہی!“ چچا جیکب نے اسے چھوڑ دیا۔ ”لیکن تمہیں باور کرا دوں کہ میں نے تمہاری قیمت ادا کر دی ہے۔ ہمارے درمیان تمہارا سودا ہو چکا ہے۔ یقین کرو! اگر میں مر بھی گیا تو قبر سے اٹھ کر تم پر اپنا دعویٰ کروں گا۔ ہاں..... براؤن تمہیں میرے ہاتھ بیچ چکا ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے!“ وہ چیختے ہوئے باہر کی سمت بھاگی۔ ”ذلیل۔ بد معاش۔ کمینے!“ میں دروازے سے اندر داخل ہوا تو وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔

”خدا کے لیے مجھے اس ہوس کے پجاری سے بچاؤ۔ مجھے فوراً یہاں سے لے چلو۔“

چچا جیکب ہذیانی انداز میں چیخنے لگے۔ ”یہ میری ہے براؤن۔ اسے بتا دو ہمارا آپس میں سودا طے پا چکا ہے۔ بتاتے کیوں نہیں؟“

ہم دونوں وہاں سے بھاگ اُٹھے۔ ہم سخت خوفزدہ تھے۔ ان کی بے ہنگم چیخ و پکار نے دور تک ہمارا پیچھا کیا۔ مجھے اب کچھ تعجب نہیں رہا تھا کہ میرے والد اور والدہ میرے مکروہ چچا سے کیوں نفرت کرتے تھے۔ ان کے دماغ میں اب تک عورتوں کی خرید و فروخت کا بھس بھرا ہوا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے انہوں نے اپنی زندگی میں کتنی لڑکیوں اور عورتوں کو برباد کیا تھا۔

ہم واپس لندن پہنچ گئے۔ چند دن بعد شام کے دھندلکے میں میں ایک قبرستان کے قریب سے گذر رہا تھا کہ دفعتاً ایک بڑے اُلونے میرے اوپر حملہ کر دیا۔ خوف کی لہر میرے سارے وجود میں دوڑ گئی اور میں وہاں سے بھاگ اٹھا۔ الو تو کہیں پیچھے رہ گیا لیکن مجھے یوں لگا جیسے میں کسی منحوس پر اسرار شے کی گرفت



میں آگیا ہوں جو میرے وجود اور دل و دماغ پر مسلط ہو گئی ہے۔ میری چند ہی روز میں عجیب کا یا پی۔ اب میں سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ میں نے چچا کو ناراض کر کے سنگین غلطی کی ہے۔ اگر جولیا میں ذرا بھی عقل ہوتی تو اس ہوس پرست مگر ناکارہ بڈھے کی باتوں کو سنجیدہ لینے کی بجائے صرف اپنا اُلوسیدھا کرتی۔ آخر چچا جیکب ہمیشہ زندہ رہنے والے تو نہیں تھے۔ چند دن ان کا دل بہلانے پر آمادہ ہو جاتی تو ان کی موت کے ساتھ ہی ہمارے وارے نیارے ہو جاتے۔ آخر ایک ایک اینڈ کے روز میں جولیا سے بہانہ کر کے جہاز میں بیٹھا اور نیو جرسی روانہ ہو گیا۔ کرائے کی رقم میں نے ایک دوست سے ادھار لی تھی۔ جیسے ہی وہ قلعہ نما مکان میری نگاہوں کی حدود میں آیا میرے دل نے دھک دھک کرنا شروع کر دیا۔ یہ احساس میرے دل کو کچوکے لگانے لگا کہ کوئی ان ہونی بات ہو گئی ہے۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ میرا وجدان غلط اطلاع نہیں دے رہا تھا۔ چچا جیکب اگلے جہان سدھار چکے تھے!

اندر داخل ہوا تو میری ملاقات اپنے ایک دور پار کے رشتہ دار سے ہوئی جس نے بتایا کہ چچا جیکب مطالعہ گاہ میں قدیم عبرانی کتابیں پڑھ رہے تھے کہ انہیں گرم قہوے اور لیموں کی طلب ہوئی۔ انہوں نے خادمہ کو بلا کر مطلوبہ اشیاء لانے کا حکم دیا۔ جب وہ قہوہ لے کر آئی تو دیکھا کہ اس کا مالک کرسی پر تبا بیٹھا ہے اور ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا ہے۔ اس کی روح اسی حالت میں قصر عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ یہ سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ صرف اس لئے نہیں کہ اپنے چچا کا ورثہ پانے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ مجھے موت کے قدموں کی آہٹ اپنے انتہائی قریب محسوس ہوئی تھی اور یہ کیفیت ہر انسان کو خوفزدہ کر دیتی ہے۔ میں نے اس احساس پر قابو پانے کے لیے بلند آواز میں اپنے رشتہ دار سے کہا۔ ”انکل جیکب بہت خوش قسمت تھے۔ ان کی صحت ساری زندگی بہت اچھی رہی اور مرنے کے وقت بھی انہیں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ وہ بیٹھے بیٹھے اس دنیا سے رخصت ہو گئے!“

رشتہ دار نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا۔ ”نہیں براؤن۔ تو ریت میں لکھا ہے کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کی مٹھیاں بند ہوتی ہیں جو اس کے زندگی سے کچھ حاصل کرنے کی علامت ہوتی ہیں۔ جب وہ مرتا ہے تو اس کی مٹھیاں کھلی ہوتی ہیں۔ خالی ہتھیلیاں اس بات کی علامت سمجھی جاتی ہیں کہ اس نے زندگی بھر جو کچھ حاصل کیا ہے اسے بخوشی دنیا کے حوالے کر کے جا رہا ہے۔ لیکن مسٹر جیکب کی مٹھیاں مرتے وقت بند تھیں۔ اب ایک مردہ شخص دنیا سے کیا لے جانے کی توقع رکھ سکتا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر اپنا جملہ دہرایا۔ ”سوچو۔ ایک مردہ شخص دنیا سے کیا لے جانے کی توقع رکھ سکتا ہے؟“

جب وہ جانے لگا تو مکان کے نگران نے مجھے ایک نیلا لفافہ لا کر دیا کہ چچا جیکب نے میرے لیے چھوڑا ہے۔ میں نے اسے کھولا تو ایک پرزے پر صرف اتنا لکھا تھا: ”میں اپنے سودے پر قائم ہوں۔“ میں مسرت سے چلا اٹھا۔ ”تو میں ان کی دولت کا مالک بن جاؤں گا!“

اگلے چند روز اسی امید و نینم میں گذرے کہ چچا جیکب مجھے کچھ دے گئے ہیں یا نہیں۔ بالآخر ان کا وصیت نامہ پڑھا گیا۔ اس میں ایک بوڑھے کی درد بھری خواہش کا اظہار تھا کہ اس کا بھتیجا اور اس کی بیوی اسے اچھے الفاظ میں یاد رکھیں۔ انہوں نے اپنی خادمہ کے لئے تھوڑا بہت چھوڑ کر جس سے اس کی باقی ماندہ زندگی آرام سے گذر جاتی ساری دولت و جائیداد اپنے ”پیارے بھتیجے براؤن“ کے نام وقف کر دی تھی۔ شرط یہ تھی کہ میں اور جولیا شادی کر کے ان کے مکان میں کم از کم چالیس روز گذاریں۔

میں نے جولیا کو فون کیا اور اسے بتاتے ہوئے چلا اٹھا۔ ”جولیا! ہم کروڑ پتی بن گئے!“ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”اگرچہ میرے لیے یہ امر اطمینان کا باعث ہے کہ بڈھا فوت ہو گیا ہے اور اب مجھے ستانے سے رہا، لیکن اس کے قلعہ نما محسوس مکان میں چالیس روز گزارنا بھی میرے لیے کم از کم ناک نہ ہوگا۔ بہر حال تمہاری خاطر اور اپنے بہتر مستقبل کی امید میں میں یہ آزار برداشت کر لوں گی۔ لیکن دیکھو چالیس روز سے ایک دن بھی اوپر نہ ہونے پائے۔“

”تم فکر نہ کرو ایسا ہی ہوگا۔“ میں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اب یوں کروکل کی فلائٹ پکڑو اور سیدھی یہاں پہنچ جاؤ۔“

المختصر شادی کے بعد جب ہم نے ہنسی مون کے شب و روز وہاں گزارنا شروع کیے تو ہم پر عجیب پر اسرار اثرات مرتب ہونے لگے جس نے ہمیں خوف و دہشت میں مبتلا کر دیا۔ ہمیں لگا ہم کسی شاطر جادوگر کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔ قلعہ نما مکان بہت اُجاڑ تھا۔ چچا کی موت کا احساس دیوار و در پر منڈلاتا صاف محسوس ہوتا جیسے کوئی خبیث روح خاموشی سے نیم تاریک راہداریوں میں سرسرا رہی ہو۔ فرنیچر پر جمی ہوئی گرد جوں کی توں موجود تھی۔ خاص کر مغرب کے وقت تو سارے مکان پر عجیب خاموشی اور وحشت طاری ہو جاتی۔ بتیاں وہاں ویسے بھی براہ نام تھیں۔ اونچی چھتوں والے بڑے بڑے کمروں کے کونوں میں روشن مدھم بلب عجیب بھیا نک سائے پھیلاتے جو بھوتوں کے روپ دھارتے دکھائی دیتے۔ یوں لگتا جیسے کسی بھی لمحہ ہمیں ہڑپ کر جائیں گے۔

ایک رات بارہ بجے میری آنکھ کھلی۔ میں نے دیکھا جولیا بھی خوف کے مارے جاگ رہی تھی۔ اس نے دروازے کی طرف کان لگا رکھے تھے۔ میں نے بھی غور کیا تو جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ کوئی عقبی دیران باغ کی سمت سے کمرے کے بیرونی دروازے پر ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔ ہم وہاں اکیلے رہ رہے تھے۔ اس لئے آدھی رات کے وقت وہ پر اسرار اور خوف آگیاں دستک ناقابل فہم تھی۔ جولیا مجھ سے چمٹ گئی۔

”براؤن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”کوئی نہیں ہے۔ یونہی ہوا چل رہی ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ مگر خود میں تھوک نکل رہا تھا۔





معا دروازے پر اس طرح دستک ہوئی جیسے کوئی گداگر بھیک مانگنے آیا ہو۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ اس طرح کھٹکھٹایا جانے لگا جیسے کوئی سخت گیر پولیس آفیسر تحکمانہ انداز میں دروازہ دھڑا دھڑا کر مجرم سے کہہ رہا ہو کھولتے ہو یا.....؟“

”یہ میری برداشت سے باہر ہے!“ جولیا مجھ سے چمٹتے ہوئے گھکیائی۔  
”کون ہے؟“ میں بلند آواز میں چلایا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے جو ہوا اس نے میرے اور جولیا کے اوسان خطا کر دیئے۔

☆.....☆.....☆

One Urdu Forum . Com

سرد بخ بستہ ہوا کی ایک لہر کمرے میں در آئی۔  
ہماری نظروں کے سامنے چچا جیکب کی بھیانک بدروح فرش سے چند انچ اوپر فضا میں دھویں کی طرح لہرا رہی تھی!

”اف میرے خدا! میں بیان نہیں کر سکتا دہشت کے مارے ہمارا کیا حال تھا۔ ہم بُری طرح لرز رہے تھے۔ گھگھیا رہے تھے۔ آوازیں ہمارے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھیں۔ مدقوق کر یہہ المنظر چہرے والی بدروح کفن کے چاک سے دونوں استخوانی ہاتھ لہراتی ہماری طرف بڑھی۔ ان پر کہیں کہیں برائے نام گوشت تھا اور انگلیوں سے خون رس رہا تھا۔ اس کے غار نما تاریک منہ سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

”براؤن! تمہیں سودا نبھانا پڑے گا۔ میں اس حسینہ کو حاصل کر کے رہوں گا۔ میں چالیسویں دن آؤں گا۔ خبردار! کسی طرح کی بد عہدی تمہیں عبرت ناک انجام سے دوچار کر دے گی۔“

”مم..... میں..... مجھے تمہاری دولت..... نہیں..... چچ..... چاہیے۔“ میں نے بمشکل ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مم..... میں..... او..... اور جولیا..... یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!“ بدروح نے قہقہہ لگایا۔ پھر اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں سے نارنجی رنگ کی دوشعائیں نکلیں اور ہمارے جسموں سے ٹکرائیں اور ہم دونوں بے ہوش ہو گئے۔

صبح ہماری آنکھ کھلی تو رات کے خوفناک واقعہ کا اثر جانے کیسے خود بخود زائل ہو چکا تھا۔ ہم دونوں بالکل خاموش تھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ چچا جیکب کی پراسرار بدروح نے ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔

دو تین روز بعد مجھے اپنے گلے میں عجیب سی تکلیف محسوس ہوئی۔ جولیا مضطرب تھی۔

”کوئی خاص تکلیف نہیں ہے۔“ میں نے جولیا سے بھنجی بھنجی آواز میں کہا۔

”تم آج باہر نہ جانا کیونکہ بارش کے آثار ہیں۔“ اس نے مجھے مشورہ دیا۔ ”گرم پانی میں تھوڑا سا

نمک ڈال کر غرارے کرو اور بستر میں آرام کرو۔ امید ہے اس سے آفاقہ ہوگا۔“

اس کے کہنے پر میں گھر سے نہیں نکلا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ میں دل بہلانے کے لئے کوئی



چیز تلاش کر رہا تھا کہ معاً مجھے چچا جیکب کی مطالعہ گاہ کا خیال آیا۔ میں وہاں چلا گیا اور کتابوں کے ورق الٹنے پلٹنے لگا۔ کتابیں عبرانی زبان میں تھیں اس لئے میرے پلے نہیں پڑ رہی تھیں۔ پھر میرے ہاتھ ایک عبرانی۔ انگریزی ڈکشنری لگی اور میں ایک آرام دہ کرسی میں دھنس کر اسے پڑھنے لگا۔ وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ حتیٰ کہ دوپہر ہو گئی اور پھر جولیا مجھے بلانے آ گئی۔

”کیا بتاؤں.....“ میں نے جولیا کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ ”عبرانی زبان مجھے کتنی آسان لگی! یوں لگتا ہے جیسے مجھے قدیم زبانوں سے ایک غیر متوقع لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟“

”مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ تمہیں عبرانی زبان اچھی لگی ہے!“ جولیا نے خشک لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں ذاتی طور پر سمجھتی ہوں کہ آج کے دور میں یہ نری بکواس زبان ہے۔ بہر حال تمہارا گلا ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ کیا تم نے غرارے کئے؟“

”نہیں! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ دراصل کوئی زیادہ تکلیف بھی نہیں ہے۔ صرف معمولی سوجن ہے۔“

اس رات ہم بڑے سکون سے سوئے۔ صبح پھر میرا باہر نکلنے کو جی نہیں چاہا۔ جولیا نے یہ دیکھا تو بولی۔

”نہیں، تمہیں ضرور باہر نکلنا چاہیے۔ میں نے یہاں مصروف رہنے کے لئے ایک نئی لیبارٹری ڈھونڈی ہے۔ وہاں ہم دونوں کام کریں گے۔“

”نہیں جولیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اب کیمسٹری بور لگنے لگی ہے۔ دوسرے مجھے اب ملازمت وغیرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم بھی نہ جاؤ۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا!“

”میں سارا دن گھر پر کیا کروں گی؟“ جولیا نے جواب دیا۔ ”بہتر ہے کہ لیبارٹری میں تھوڑا وقت گزار لوں۔ البتہ اگر تمہیں گھر پر رہنا پسند ہے تو میں تمہیں مجبور نہیں کرتی۔ لیکن پھر گھر پر ہوتے ہوئے تمہیں تھوڑی بہت صفائی اور کھانا تیار کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

اب جولیا روزانہ لیبارٹری جانے لگی اور میرا سارا وقت گھر پر گزارنے لگا۔ میں زیادہ تر وقت چچا جیکب کی مطالعہ گاہ میں گزارتا تھا۔ ڈکشنری کی مدد سے اب میں آسانی سے عبرانی زبان کو سمجھنے لگا تھا۔ میں نے روحوں اور کالے جادو کے بارے میں بہت سی چیزیں پڑھ ڈالیں۔ جن کے قدیم یہودی بہت دلدادہ تھے۔ بابل شہر میں اور یروشلم کے ارد گرد ایسا جادو مروج تھا جس کے زور پر لوگ میاں بیوی میں جدائی ڈال دیتے تھے اور اچھی بھلی شریف لڑکیوں کو رات کے اندھیرے میں گھر کی دہلیز پار کروا کے ویرانوں میں طلب کر لیتے اور ان کی عزت لوٹ لیتے تھے۔ بعض جادو ایسے تھے جن سے کسی بھی عورت یا مرد کے پوشیدہ اعضاء کو غائب کر دیا جاتا تھا! شام کو جب جولیا گھر لوٹی تو اس نے مجھے کھانا تیار نہ کرنے پر سخت سست کہا۔

”اب تو پانی سر سے گزرنے لگا ہے۔“ وہ خفگی سے بولی۔ ”تم نے شیو بھی نہیں بنائی۔ دیکھو کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔“

”میں نے ہنس کر شانے جھٹک دیئے۔ دراصل میں بھاگ کر ان کتابوں میں کھوجانا چاہتا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے اپنی اس خواہش کو بڑی مشکل سے دبائے رکھا۔ کیونکہ جولیا مجھ سے پیار بھری باتیں کرنا چاہتی تھی۔ البتہ صبح ہوتے ہی جولیا کے اٹھنے سے پہلے ہی میں مطالعہ گاہ میں موجود تھا۔ لیبارٹری جاتے ہوئے وہ کہنے لگی۔

”یہ کہنا بیکار ہی ہوگا کہ تم کھانا تیار کرلو!“

”نہیں!“ میں نے جواب دیا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج تمہیں کھانا تیار ملے گا۔“

”تمہارے گلے کا بُرا حال لگتا ہے۔ تمہاری آواز یوں لگ رہی ہے جیسے پھٹا ہوا ڈھول بج رہا ہو۔“ وہ مسکرائی۔

”ارے نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گی۔“ میں نے کھانستے ہوئے کہا اور اپنی دیمک زدہ کتابوں کی دنیا میں کھو گیا۔ جولیا مجھے چھوڑ کر کام پر چلی گئی۔

جولیا چلی گئی تو میں نے شلیف سے ایک قدیم اور ضخیم کتاب اٹھائی۔ وہ بھوتوں، روحوں اور بدروحوں کے بارے میں تھی۔ کچھ حصے مجھے بے حد مشکل لگے اور میں ڈکشنری کھنگالتے ہوئے پسینے پسینے ہو کر اسے پڑھنے کی کوشش کرتا رہا اور ناخن چباتا ہوا الفاظ کے معانی کی تہہ میں پہنچنے کی سعی کرتا رہا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔

”اوہ خدایا! میں نے ابھی برتن بھی نہیں دھوئے اور کھانا تیار کرنے کے بارے میں تو سوچا تک نہیں..... جولیا آ گئی تو مجھے بُرا بھلا کہے گی۔“ میں بڑبڑایا۔

اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی اور میں گھبرا گیا کہ جولیا آ گئی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے چچا جیکب کی غلیظ یہودن خادمہ کھڑی تھی۔ اس کی براؤن وگ بے ہنگم طریقے سے اس کے سر پر دھری تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا کہ اب وہ بے روزگاری کے دن کاٹ رہی ہے۔ چچا نے جو کچھ اسے دیا تھا اس سے گزراؤ تو ہو رہی ہے مگر اس کے سر پر ایک غریب بہن اور اس کی دو لڑکیوں کا بوجھ بھی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اتنی بوڑھی بھی نہیں کہ کام کاج نہ کر سکے۔ مجھے یوں لگا جیسے قسمت میرا ساتھ دے رہی ہو۔

”اندر آ جاؤ! میری بیوی آتی ہی ہوگی۔ کیا تم جلدی سے کھانا تیار کر سکتی ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور میں دوبارہ اپنی عبرانی کتابوں میں ڈوب گیا۔



جولیا لیبارٹری سے واپس آئی تو ہر میں اس کو بھڑکاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی حالت اس کی حالت سے سمجھایا کہ وہ تو سارا دن لیبارٹری میں ہوتی ہے۔ اس کی خادمہ سے مذہب بھڑک رہی ہوگی۔ اس کے علاوہ میرا روز چولہا خود جھونکنے کا کوئی ارادہ نہیں.....

جولیا مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اس بنا پر اس نے مجھے کچھ کہا نہیں مگر میں نے صاف محسوس کیا اسے میرا روکھا جواب پسند نہیں آیا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا رویہ اس کے ساتھ تلخ ہوتا گیا۔ میں سارا دن گھر میں بیٹھ بیٹھ کر موٹا ہو رہا تھا۔ ہنی مون کے دن جو پیار اور وظیفہ زوجیت میں گزرنے چاہئیں، کرم خوردہ کتابوں کی نذر ہو رہے تھے۔ جولیا کی رومانی طبیعت یہ سب کچھ کب تک برداشت کرتی۔ ایک روز وہ مجھ سے الجھ پڑی۔

”یہ کیا مذاق ہے براؤن۔ سارا دن گھر میں گھسے رہنا، کیا یہی ایک مرد کا شیوہ ہے۔ نہ لباس بدلنے کا ہوش نہ شیوہ کا خیال۔ خدا کی پناہ تم تو کسی جنگلی بھینسے کی طرح موٹے ہوتے جا رہے ہو۔ کچھ اپنے جسم ہی کا خیال رکھو۔“

”جولیا!“ میں سیخ پا ہو گیا۔ ”تم ضرورت سے زیادہ گستاخ ہو گئی ہو۔ کہاں سے سیکھی ہے تم نے یہ غیر ضروری نکتہ چینی؟ اگر مجھے بھوک لگتی ہے تو کیا میں کھانا بھی نہ کھاؤں؟ ٹھیک ہے مجھ پر موٹاپا آ رہا ہے لیکن کیا تم محض اس بنا پر مجھے بھوکا رکھو گی کہ میرا جسم سڈول رہے؟ میں آخر ہوں کیا؟ کیا فلمی اداکار ہوں؟ اور میں شیوہ کس لئے کروں؟ کیا مجھے کسی نے پارٹی میں مدعو کر رکھا ہے؟“

میری تند خوئی جولیا کے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔ میں ہمیشہ اس سے بہت پیار اور خوش اخلاقی سے بات کرتا تھا۔ میری اسی خوبی سے متاثر ہو کر ہی وہ میری محبت کی اسیر ہوئی تھی۔ مجھے اس طرح غصے سے بات کرتا دیکھ کر وہ روہانسی ہو گئی اور میرے قریب آ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”براؤن میری جان تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ دیکھو تم سگار بھی بہت پینے لگے ہو اور تمہارا گلا بھی بُری طرح خراب رہنے لگا ہے۔“

”دیکھو۔ ان سگاروں سے میرے گلے کو آرام ملتا ہے۔ دوسرے مطالعہ کے دوران سگار کی مجھے طلب ہوتی ہے۔“ میں نے گہری سانس لی۔

”ہو سکتا ہے میں بہت زیادہ سگار پینے لگا ہوں، لیکن میں تمہارے لئے اب ان کی گنتی رکھنے سے تو رہا۔ مجھے معلوم ہے اب تم ان کتابوں پر بھی تنقید کرو گی۔ لیکن.....“ میں مسکرایا۔ ”نہ جانے مجھے یہ ناخن چبانے کی عادت کیسے پڑ گئی ہے؟“ میں بھنچے ہوئے ہونٹوں سے بات کر رہا تھا کیونکہ اس دوران میں مسلسل ناخن چبائے جا رہا تھا۔

معاذے اپنی اس سید درد و سوس ہو اور میں نے اسے منہ سے نکال دیا۔ دیکھا تو بائیں کی جگہ خون کی ایک بوند چمک رہی تھی۔ میں نے انگلی منہ میں ڈال کر چوس لی۔ جولیا جو میرے قریب بیٹھی تھی متوحش چہرے سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اچانک اس نے سر گھا کر ادھر ادھر دیکھا اور خوف سے چلائی:

”تم کہاں ہو براؤن؟ کہاں ہو تم؟ میرے سامنے تو تمہارا چچا جیکب بیٹھا ہے!“

پھر وہ اٹھ کر چلانے لگی۔

”براؤن! براؤن! براؤن! کہاں ہو؟ تم کہاں ہو؟ مجھے بچاؤ۔“

وہ بھاگنا چاہتی تھی میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ کتنی احمق تھی وہ۔ میری طرف سے منہ پھیر کر چلائے جا رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور کچھ دیر کے بعد میں نے اپنا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا لیا۔ وہ بیٹھ گئی اور اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ میں جا کر اپنی مطالعہ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بغور اسے دیکھنے لگا۔ میں چوکنہ تھا۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرتی تو میں اسے جا پکڑتا۔

چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔ مطالعہ گاہ میں پراسرار خاموشی تھی۔ صرف جولیا کے گہرے سانسوں کی آواز اور گھڑیال کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ وہ ابھی تک پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے میری جگہ کوئی بھوت کرسی پر براجمان ہو۔ پھر وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف کھسکنے لگی۔ میں اس کی نیت بھانپ گیا۔ وہ بھاگنے کے لئے پر تول رہی تھی۔ میں اسے بھاگنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بھاگ جاتی تو وصیت نامے کی شرط پوری نہیں ہو سکتی تھی جس کی رو سے ہم دونوں کو کم از کم چالیس دن چچا جیکب کے مکان میں قیام کرنا تھا۔ اس طرح تو ہم چچا جیکب کے ورثے سے محروم ہو جاتے اور زندگی پہلے کی طرح عسرت اور غربت میں گذرتی۔

لیکن وہ اٹھ کر بھاگی تو میں نے بجلی کی سرعت سے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

”چھوڑ دو مجھے..... چھوڑ دو مجھے! کمینے وحشی! ہوس زدہ بڈھے!“ وہ چیخا۔ لیکن میں نے اسے نہیں چھوڑا اور یہودن خادمہ کی مدد سے رسیوں کے ساتھ باندھ دیا۔ اس کا منہ بند کرنے کے لئے مجھے اس کے منہ میں رومال ٹھونسنا پڑا۔ پھر میں نے اسے کاندھے پر اٹھالیا اور اسٹور کی طرف چلتے ہوئے بڑا آواز لگا۔

”آؤ میری ننھی فاختہ! میری صحرائی بلبل! میرے ساتھ آؤ.....“ میں زینے طے کرتے ہوئے لنگڑا رہا تھا.....

”تم اندھیری کوٹھڑی میں بالکل محفوظ رہو گی!“

اور یوں میں نے اپنی نرم و نازک اور جان سے پیاری جولیا کو اپنے پراسرار اور مکروہ چچا کی سحر کاری کے زیر اثر اندھیری کوٹھڑی میں قید کر دیا۔ میں اس وقت اس کی منحوس، خوفناک اور بھیانک بدروسح کے



تکبجے میں تھا۔ عبرانی زبان کے ماہر اور پرانے یہودیوں کے جادو سے واقف پچانے اس سحر پر کمال حاصل کر رکھا تھا جس کا ذکر چاہ بابل میں اُتارے جانے والے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت کے قصے میں ہر آسمانی مذہبی کتاب میں مرقوم ہے۔ ”وہ ایسا سحر سیکھتے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔۔۔۔۔!“

اُف میرے خدا! شیطان نے انسان پر کیسے کیسے وار کئے ہیں۔۔۔۔۔ آدم اور حوا کی پیدائش کے وقت سے اس نے نوع انسانی کے ساتھ دشمنی پالی ہے اور سب سے زیادہ اس بات میں کوشاں رہتا ہے کہ اس مقدس رشتے کی جڑ پر کلہاڑی چلائے جسے ہم میاں بیوی کا رشتہ کہتے ہیں اور جو دنیا کا سب سے پہلا رشتہ ہے!

پھر وہ ہوا جس نے مجھے دائمی آزار ایک نہ ختم ہونے والے ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیا۔ ہوا یوں کہ میں روزانہ رات کے وقت اپنی ننھی فاختہ سے ملنے جاتا تھا۔۔۔۔۔ وہ اپنی ساری طاقت سے میرے خلاف مزاحمت کرتی اور بمشکل میرے قابو میں آتی تھی۔ آخر ہفتہ بھر بعد اس نے ایک شب اپنے ہاتھ پاؤں آزاد کر لئے اور مجھے غچے دے کر کسی طرح اسٹور روم سے بھاگ نکلی۔ میں لنگڑاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ راہداری میں بھاگتی چلی گئی اور پھر بیرونی کیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کا رخ قریبی جنگل کی سمت تھا۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ جنگل چاندنی میں بہت پر اسرار لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی جنگلی بھیڑیے یا گیدڑوں کے غول کی آواز سنائی دے جاتی اور پھر ہیبت ناک خاموشی چھا جاتی۔ جولیا دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔ میں کسی زخمی درندے کی طرح اس کے تعاقب میں تھا۔ آخر وہ اس گہری جھیل کے پاس پہنچ گئی جو پہاڑی کے دامن میں ولولہ جھاڑیوں کے ساتھ واقع تھی۔ ایک چٹان پر رک کر اس نے بلند آواز میں مجھے پکارا۔

”براؤن!“

”جولیا!“ میں نے پوری قوت سے چلا کر کہا اور محسوس کیا کہ کئی ہفتوں کے بعد میری آواز بالکل صاف تھی۔

”مجھے معاف کر دو جولیا۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا! اس منحوس مکان سے باہر آتے ہی جیسے مجھ پر پھونکا ہوا سحر اپنا اثر کھو بیٹھا ہے!“

”نہیں۔۔۔۔۔!“ اس کا لہجہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ ”تم نے مجھے اس کے ہاتھ فروخت کر دیا۔“ وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ۔۔۔۔۔ وہ یہاں جھیل کے پانی پر کھڑا ہے۔۔۔۔۔ اور مجھے لینے آیا ہے!“

”نہیں۔۔۔۔۔!!!“ میں چیخا۔ لیکن جولیا نے جھیل کی اتھاہ گہرائیوں میں چھلانگ لگا دی۔ چشم زدوں میں اسے جھیل نے نگل لیا۔ میرا سر چکرایا اور میں غش کھا کر زمین پر ڈھے گیا۔

مجھے جولیا کی لاش نہ مل سکی۔ اس کی موت کے بعد میری حالت اعتدال پر آ گئی تھی۔ اس کی موت

کو پندرہ سال گزر چکے ہیں۔ کہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میری عمر صرف چالیس سال ہے لیکن دیکھنے میں ’میں‘ ساٹھ برس کا بوڑھا لگتا ہوں۔ کچھ تو چچا جیکب کے منحوس سحر کا کیا دھرا ہے۔ اس پر مستزاد جولیا کا غم جس نے مجھے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا۔۔۔۔۔ میں شاید جولیا کی موت کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتا لیکن یوں ہوا کہ کئی برس پہلے مجھے اسرائیل جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک بزرگ یہودی ربی سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے قیافے سے اندازہ لگایا تھا کہ مجھ پر جادو کے اثرات ہیں۔ اس نے مجھ پر یہ انکشاف کر کے مجھے حیران کر دیا کہ اس بات کا نوے فیصد امکان ہے کہ جولیا اب بھی زندہ ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان کی موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس سے پہلے انسان نہیں مر سکتا۔ البتہ سحر کاری کے سبب اس پر طویل بے ہوشی طاری کی جاسکتی ہے اور کوئی بدروح اسے اپنے مذموم اور گندے مقاصد کے لئے وقتاً فوقتاً ہوش میں لا کر اپنا کام نکال سکتی ہے۔ جب سے میں نے یہودی عالم کی یہ بات سنی ہے میں کسی عامل کی تلاش میں ہوں جو میری جولیا کا پتا چلا سکے۔ میں نے اس مقصد کے حصول کے لیے کہاں کہاں دھکے نہیں کھائے، کس گلی اور کس کوچے کی گردنیں پھانکی۔۔۔۔۔ دولت پانی کی طرح بہاؤ الی مگر کچھ ہاتھ نہیں آیا۔۔۔۔۔ میں چچا کی دولت کو ٹھوکر مار دیتا مگر اس کے علاوہ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اس لئے اسی دولت کو استعمال میں لا کر میں نے ٹورازم کے ایک بین الاقوامی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ خدا مہربان تھا، میرا یہ کام چل نکلا۔ اس سے مجھے اچھی خاصی آمدنی ہو رہی ہے۔ اسی ادارے کے توسط سے دنیا گھوم رہا ہوں۔ اس امید پر جی رہا ہوں کہ شاید واقعی جولیا زندہ ہو۔۔۔۔۔!“

اتنا کہہ کر وہ انگریز جسے میں بھی بوڑھا سمجھ رہا تھا، بچوں کی طرح ہلکے ہلکے گھونکنے لگا۔

”آپ رونیں نہیں۔۔۔۔۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”آپ سمجھئے کہ آپ کے آزار ختم ہو گئے۔ میرے پاس ایسی طاقت ہے جس کی مدد سے بہت جلد پتا چلایا جاسکتا ہے کہ جولیا زندہ ہے یا خدا کو پیاری ہو گئی اور اسی طاقت کی مدد سے آپ کے چچا جیکب کی بدروح کو آگ میں جھونکا جاسکتا ہے تاکہ دھرتی پر رہنے والے معصوم لوگ ہمیشہ کے لئے اس کے شر سے محفوظ ہو جائیں!“

”سچ؟!!“ وہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا اور میرے ہاتھ چومنے لگا۔ قریب سے گزرنے والی ایک ویس بس ہمیں حیرانی سے دیکھنے لگی۔

”ہاں یہ سچ ہے!“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا تو اس کے چہرے پر طمانیت کی سرخی دوڑ گئی۔

مجھے اس وقت پہلی دفعہ اس احساس نے فخر میں مبتلا کیا کہ میرے پاس چپوں کی شکل میں ایک ایسی ماورائی ہستی ہے جسے دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے!

”محترم نوجوان! اگر یہ سب کچھ ہو گیا تو یقیناً جانو میں تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں گا۔“ وہ خوشی سے مغلوب آواز میں بولا۔



اسی مجھے اپنے کان میں پمپوں کی سرسوزی سنا دی۔  
 ”محبوب اسے کہو تم امریکہ جانا چاہتے ہو۔ یہ تمہیں فوراً وہاں اپنے ادارے کے دفتر میں ایک اچھا  
 جاب آفر کر دے گا۔“  
 ”مسٹر براؤن.....“ میں نے قدرے توقف سے کہا۔ ”مجھے امریکہ دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ٹورازم  
 سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے ادارے میں مجھے کوئی ملازمت دے دیں اور امریکہ  
 دیکھنے کا میرا دیرینہ خواب پورا ہو جائے۔“  
 ”کیوں نہیں..... کیوں نہیں!“ وہ مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میرے لئے یہ معمولی بات ہے۔  
 آپ میری خاطر جو کچھ کرنے پر آمادہ ہیں اس کے بعد میں آپ کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار  
 ہوں۔ آپ پسند کریں تو میں دو تین روز میں آپ کے لئے وزٹ ویزا کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ میری  
 طرف سے آپ میاں بیوی کے لئے یہی مون پیج فری ہوگا۔ میرا کام ہو گیا تو میں آپ کو نیویارک میں  
 واقع اپنے ہیڈ آفس میں ایشیا ریجن کے لئے ٹورازم مینجر مقرر کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کم از کم اس  
 بددماغ مسٹر ایڈورڈ سے تو ہزار درجے بہتر کام کر سکتے ہوں گے جس کی خراب کارکردگی نے مجھے ذہنی کوفت  
 سے دوچار کر رکھا ہے۔“  
 ”میری بیوی یہ سب سن کر بہت خوش ہوگی۔“ میں نے پُر مسرت انداز میں کہا اور اس سے کل ملنے کا  
 وعدہ کر کے کمرے میں چلا آیا۔  
 ☆.....☆.....☆  
 راحیلہ کے لئے یہ بات ناقابل یقین تھی کہ مجھے بیٹھے بٹھائے امریکہ کا فری وزٹ ویزا مل گیا  
 ہے اور وہاں اتنے شاندار جاب کی آفر بھی ملی ہے۔ میں نے اسے اپنے پاس سے ایک کہانی گھڑ کر  
 سنا ڈالی تھی۔  
 ”تم نے آخر اس بوڑھے انگریز پر جادو کیا چلایا کہ وہ اس طرح تمہارا دیوانہ ہو گیا!“  
 ”بس ہماری پرسنلٹی ہی کچھ ایسی ہے۔ جو دیکھتا ہے فریفتہ ہو جاتا ہے۔“ میں نے کالر جھاڑتے  
 ہوئے تن کر کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنسی اور مجھ سے چٹ گئی۔  
 ”محبوب میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ مجھے امریکہ دیکھنے کا کس قدر اشتیاق تھا۔ میرا جی چاہ رہا ہے ابھی  
 اڑ کر نیویارک جا پہنچوں۔“  
 صبح سویرے جب میں باتھ روم میں تھا، چمپون آٹپکی۔  
 ”ملاقات کے لئے یہ بڑی غلط جگہ ہے۔“ میں نے اس سے کہا۔  
 ”کیا کروں..... تمہاری راحیلہ ہر وقت سائے کی طرح تمہارے ساتھ لگی رہتی ہے۔ بہر حال میں

بہت مختصر بات کروں گی۔ ناشتے کے لئے لابی میں جاؤ گے تو مسٹر براؤن تمہارا منتظر ہوگا۔ تم اس سے کہنا  
 کہ میں نے اپنی شکتی سے مدد طلب کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگلے ماہ کی ۱۳ تاریخ کو اس جھیل پر جا کر ایک  
 جاپ کرنا ہوگا جہاں جولیا نے خود کو گھرے پانی کے حوالے کیا تھا۔ اس کے بعد ہی اندازہ ہو سکے گا کہ جولیا  
 زندہ ہے یا قلمہ اجل بن چکی ہے۔“

”کیا مطلب؟ تم اپنی طاقت سے نہیں بتا سکتی کہ وہ زندہ ہے یا مردہ؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔  
 ”میری شکتیوں پر شبیہ کا اظہار نہ کرو۔“ وہ برامان گئی۔ ”در اصل تم اس دنیا کے معاملات سے  
 ناواقف ہو جس سے میرا تعلق ہے۔ تمہاری تسلی کے لئے ایک وضاحت کر دیتی ہوں اور وہ یہ کہ براؤن  
 کا چچا بابل کی شہرہ آفاق دیوی عشق کا چیلہ تھا۔ زمانہ قدیم سے عراق اور گرد و نواح کے ساحر اس دیوی  
 کو پوجتے آئے ہیں۔ وہاں اس کی حیثیت وہی تھی جو ہندوستان میں کالی دیوی کی ہے اور تاریک  
 براعظم میں اقبال کی رہی ہے۔ ان سب دیویوں کا اپنا ایک حلقہ اثر ہے اور میں بلاوجہ ان سے ٹکراؤ کی  
 کیفیت پیدا نہیں کیا کرتی۔ یہاں بیٹھ کر ان کے حصار میں نقب لگانا ممکن تو ہے مگر اس سے ہماری دنیا  
 میں باہم جنگ و جدل اور ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے جس سے ہمیں ہمیشہ منع کیا جاتا ہے۔ میں  
 تمہارے ساتھ نیو جرسی جاؤں گی اور تمہیں وہاں جا کر ایک جاپ مکمل کرنے کو کہوں گی۔ اس سے  
 معلوم ہو جائے گا کہ جولیا کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔“  
 ”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”تم مسٹر براؤن سے کہنا کہ ہم فوراً واپس دلی جا رہے ہیں۔ کاغذات بنوانے کے لئے تصویریں اور  
 شناختی کارڈ وغیرہ کی ضرورت کا بہانہ کرنا۔“

”ان کا بندوبست تو تم یہاں بیٹھے بھی کر سکتی ہو دلی جانے کی کیا ضرورت ہے؟“  
 ”ایک تو تم فضول بحث بہت کرتے ہو۔“ وہ ناراض ہو گئی۔ ”رازداری کے لئے چیزوں کو فطری  
 رنگ دینا بہت ضروری ہے۔ ورنہ تمہاری راحیلہ کو شک ہو جائے گا اور مجھے یقین ہے یہ معلوم ہونے کے  
 بعد کہ تمہارے ساتھ کوئی ماورائی ہستی چپکی ہوئی ہے وہ بُری طرح بدک جائے گی۔ کچھ بعید نہیں پھر وہ مجھے  
 تم سے جدا کرنے کے لئے کوئی الٹی سیدھی حرکت کر گذرے۔“

”تم اس کے بارے میں بہت بدگمانی کرنے لگی ہو۔“ میں نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”خود ہی تم نے  
 ہم دونوں کو ملایا ہے۔ یہ بات تمہارے ذہن میں ہمیشہ ڈھنی چاہیے۔“

”اچھا۔ خیر۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”میں جیسے کہتی ہوں نا ویسے ہی کرتے جاؤ اور یہ بھی یاد  
 رکھو کہ تمہارا ایک سسرال بھی ہے۔ وہ نیک عورت بی بی کلثوم جس نے راحیلہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر  
 اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیا اس سے ملے بغیر تم امریکہ سدھار جاؤ گے؟ رشتہ داری کے تقاضے



میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ ایک بہت بااخلاق اور مہذب انسان ہیں۔ میں اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی مدد کروں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اگر خداوند نے چاہا تو.....!“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

☆.....☆.....☆

شام مغرب سے کچھ پہلے میں اور راحیلہ تیار ہو کر سیر کے لئے نکلے۔ ہوٹل سے کچھ دور ناریل کے گھنے جھنڈ کے قریب ایک کافی ہاؤس تھا جہاں ساحل کنارے ریت پر رنگ برنگی کرسیاں بھی تھیں اور غیر ملکی و مقامی سیاح ان پر بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سامنے حدنگاہ تک سبزی مائل سمندر تھا جس کا رنگ آہستہ آہستہ سرمئی ہو رہا تھا۔ سورج تانبے کے بڑے تھال کی طرح آسمان کے مغربی کنارے پر لٹکا ہوا تھا اور شفق کی سرخی بادلوں کے کناروں کو سنہری بنائے دے رہی تھی۔ سطح سمندر پر رنگ برنگے بجرے اور بادبانی کشتیاں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ کئی بچے اور نوجوان لڑکے لڑکیاں ساحل پر چہل قدمی کرتے ہوئے قہقہے بکھیر رہے تھے۔ ہم دونوں اس دلفریب نظارے سے لطف اٹھانے کے لئے کافی ہاؤس کی ایک خالی میز پر جا بیٹھے۔ میں نے اپنے لئے کپسی چینو (Capichino) اور راحیلہ کے لئے ایکسپریسو (Expresso) کا آرڈر دیا۔ ہم دونوں کافی پیتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ راحیلہ کے عقب میں مجھے بیس اکیس برس کی ایک گوری اور صحت مند لڑکی نظر آئی جو شیریں پی رہی تھی۔ دیکھنے میں اینگلو انڈین لگتی تھی۔ اس نے اورنج کلر کا اسکرٹ اور سلک کا پھولدار بلاؤز پہن رکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ میں بہت دلچسپی لے رہی ہے۔ میں اسے کن اکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک کافی کا کپ راحیلہ کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور کافی اس کے کپڑوں پر گر گئی۔

”اُف اللہ!“ وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھی۔ ”میری نئی ساڑھی غارت ہو گئی۔“

”چلو کوئی بات نہیں، واش روم میں جا کر فوراً دھو ڈالو۔“

”ہاں فوراً اسے دھونا ہوگا ورنہ داغ اترے گا نہیں۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

میں نے ویٹر کو بلایا۔ اس نے واش روم تک راحیلہ کی رہنمائی کی۔ اینگلو انڈین لڑکی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میرے قریب آئی اور مسکرا کر بولی۔

”مسٹر..... کیا آپ مجھے اپنا نام بتانے کو مانتے تو نہیں کریں گا۔ یولگ لائیگ جیک نکلسن۔“

”میرا نام جمال ہے“ میں نے فوراً ایک نیا نام گڑھا۔ ”میں نہیں جانتا جیک نکلسن کون ہے سویت

گرل!“ یہ کہتے ہوئے میں مسکرایا اور محسوس کیا کہ میرے اس اندازِ مخاطب پر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اس

نے ایسی نظر سے میری طرف دیکھا جس میں پذیرائی کی تمام تر کیفیت موجود تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ

میدان مارنا میرے لئے بالکل مشکل ثابت نہیں ہوگا۔

بھانا یہو بوبی.....!“

”آئی ایم سوری!“ میں شرمندہ ہو گیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تمہارے کہنے کے عین مطابق دلی جاؤں گا اور میری کوشش یہی ہوگی کہ آئندہ ہر چیز فطری انداز میں آگے بڑھاؤں۔ جہاں تمہاری پراسرار قوت کی ضرورت پڑی وہاں مجھے یقین ہے تم میری مدد کو فوراً آؤ گی۔“

”اب آئے ہونا لائن پر.....“ وہ مسکرائی۔ پھر کہنے لگی۔ ”میں اجازت چاہوں گی۔ میرا خیال ہے اب مزید یاد دہانی کی ضرورت نہیں کہ آج پورن ماشی کی رات ہے.....“

”مجھے خوب یاد ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

اس نے میرے رخسار پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ رکھے اور غائب ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

ہال میں ناشتے پر مسٹر براؤن میرا منتظر تھا۔ راحیلہ نے اپنے لئے ناشتہ کمرے ہی میں منگوا لیا تھا۔ وہ غیر مردوں کے سامنے آنے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنے سے کترانے لگی تھی۔

مسٹر براؤن مجھے آتے دیکھ کر عقیدت اور احترام سے لٹھا ہو گیا۔ وہ مجھے ایسی عزت دے رہا تھا جیسی لوگ پیروں فقیروں کو دیا کرتے ہیں۔ ہم بیٹھے تو میں نے اس سے وہی گفتگو کی جس کی ہدایت مجھے چپوں کی طرف سے ملی تھی۔

”ٹھیک ہے!“ اس نے فوراً آمادگی ظاہر کی۔ ”صبح ۶ بجے یہاں سے ایک فلائٹ دلی جاتی ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو اسی پر دلی روانہ ہو جاتے ہیں۔ پاسپورٹ اور وزٹ ویزا دو تین روز میں تیار ہوگا۔ اس کے بعد ہم امریکہ روانہ ہو جائیں گے۔“

”دلی میں آپ کا قیام کہاں ہوگا؟“ میں نے استفسار کیا۔

”میں انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہروں گا۔“

”ٹھیک ہے میں اپنے عزیز واقارب سے مل کر آپ سے ملاقات کرنے آ جاؤں گا۔“

”آپ کے عزیز کہاں رہتے ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔ اسے خدشہ تھا کہ میں اسے ٹال تو نہیں رہا۔ میں نے اس کا شبہ دور کیا اسے یقین دلایا کہ میں اس کی مدد ضرور کروں گا۔ اسے میں نے بی بی کلثوم کے گھر کا پتہ بھی اچھی طرح سمجھا دیا جس کے بعد وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

”نیو جرسی ہم 11 تاریخ کو پہنچ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے جو بھی سات آٹھ روز ہوئے وہ آپ دونوں میرے ذاتی مہمان کی حیثیت سے لندن اور نیویارک میں گذارنا۔ یہ میری طرف سے آپ دونوں کے لئے بہنی مون پیج ہوگا۔ قیام و طعام کا سارا خرچ میرے ذمے رہا۔“ اس نے پر جوش انداز میں کہا۔

”بہت بہت شکریہ مسٹر براؤن۔ آپ کی یہ فیاضی اور فراخ دلی میرے لئے باعثِ مسرت ہے۔“



تاب سے چمک رہا تھا۔ بیچ پارک میں خاصی رونق تھی۔ میں اس کے مرکزی گیٹ پر پہنچا تو اسے سراپا انتظار پایا۔ وہ اپنے ”بے بی کلر“ کے لیے بہت بے چین تھی۔

”اوہ آئی کانٹ بیلو کہ تم آ گئے ہو.....!“ مجھے دیکھ کر وہ چہکی۔

”جب میں وعدہ کرتا ہوں تو اسے ضرور پورا کرتا ہوں۔“ میں نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

”دیٹ از لائنک اے گریٹ مین!“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

”اب یہیں کھڑے رہنا ہے یا کہیں چلنا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”میرا کاٹیج قریب ہی ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”وہاں چلتے ہیں“

”میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔“

ہم دونوں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ایک بغلی سڑک پر چلنے لگے۔ قریب سے بے شمار جوڑے گزر رہے تھے۔ سب نے ہماری طرح ایک دوسرے کی کمروں میں ہاتھ ڈال رکھے تھے۔ کسی نے ہمیں توجہ کے لائق نہیں سمجھا۔ میرے نقطہ نظر سے یہ بات بہت اچھی تھی۔

دس منٹ چلنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ناریل کے بڑے بڑے جھنڈ تھے اور ان کے درمیان ایک قطار میں چھوٹے سائز کے درجن بھر پرانے اور خاصے بوسیدہ کاٹیج سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کے دیوار و در سے عمرت اور مفلسی ٹپک رہی تھی۔ وہاں تاریکی کا راج تھا اور کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف ایک کاٹیج کے باہر زرد بلب بے دلی سے جل رہا تھا۔

”یہ ہمارا کاٹیج ہے۔“ اس نے اسی بلب والے کاٹیج کے سامنے رکتے ہوئے کہا اور بلاؤز کے اندر ہاتھ ڈال کر چابی نکالنے لگی۔

”تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟“ میں نے آس پاس پھیلی ہوئی بساند سے توجہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ میری بڑی بہن لارا بھی میرے ساتھ رہتی ہے، مگر وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ بمبئی گئی ہوئی ہے۔ آؤ اندر آ جاؤ۔“ اس نے تالا کھول کر میرے لئے دروازے کا پٹ دھکیلا۔

”تم نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا؟“ میں نے کہا۔

”اوہ! سوری۔ میرا نام ماریا ہے۔“

”پیارا نام ہے.....“ میں نے تعریف کی تو وہ کھل اٹھی۔

”تھینک یو سوچ۔ تمہارا نام بھی بہت اچھا ہے۔ جمال، تمہاری پرسنلٹی کی طرح خوبصورت!“

وہ دو کمروں اور ایک مختصر لاؤنج پر مشتمل چھوٹا سا کاٹیج تھا۔ ایک طرف کچن تھا اور اس سے ملحق باتھ روم۔ لاؤنج میں کین کا ایک صوفہ پڑا تھا جس کی گدیاں بہت بوسیدہ اور میلی تھیں۔ فرش پر موٹی سوت کا نمندہ بچھا تھا جسے یقیناً کسی کباڑیے سے خریدا گیا ہوگا۔ دیواروں پر کئی تصویریں آویزاں

”ارے! تم جیک نکلسن کو نہیں جانتا! وہی فلم بے بی کلر کا ہینڈسم ہیرو جس پر دنیا کا سب لڑکی لوگ مرتا ہے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ”ویسے تم بھی بے بی کلر لگتا ہے۔“ وہ ایک آنکھ دبا کر آہستگی سے بولی۔

اسی اثناء میں مجھے اپنے کان کے قریب چمپوں کی سرگوشی سنائی دی۔

”محبوب اسے کہو رات ساڑھے دس بجے بیچ پارک کے بڑے گیٹ کے سامنے تمہارا انتظار کرے.....“

وہ لڑکی چمپوں کا اگلا شکار تھی۔ مجھے ایک دم اس پر ترس آنے لگا۔ کیسی خوبصورت اور زندگی سے بھرپور لڑکی تھی مگر آج اس کی زندگی کا آخری دن تھا۔ اور وہ اس حقیقت سے قطعاً بے خبر تھی۔ میرے لئے چمپوں کی ہدایت پر عمل کئے بنا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں اس کی حکم عدولی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ راحیلہ واپس آتی، میں نے کھڑے ہو کر سرگوشی کے انداز میں اس سے کہا۔

”تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں واقعی بے بی کلر ہوں اور تمہاری جیسی لڑکی کو ہاتھ سے جانے دوں یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔“ مگر اس وقت میری بیوی میرے ساتھ ہے۔ تم یوں کرو کہ رات ساڑھے دس بجے بیچ پارک کے بڑے گیٹ کے سامنے میرا انتظار کرنا، میں اسے سلا کر سیدھا وہاں آؤں گا۔“

”ضرور آنا ڈارلنگ۔ میں بہت بے چینی سے ویٹ کریں گا۔“ اس نے التجا کی۔ اس کی نگاہوں میں میرے لئے عجیب والہانہ پن تھا۔

”ضرور آؤں گا۔ اب تم جاؤ، میری بیوی نہ آ جائے۔“

”اوہ سویٹ ہارٹ مالم نہیں تم نے شادی کیوں بنایا؟“ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ ”تم کسی ایک لیڈی کی پراپرٹی کیوں بن گیا؟“ اس نے جو شیریں پی تھی وہ اپنا رنگ جمانے لگی تھی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اسے وہاں سے ہٹایا۔ شکر ہے راحیلہ کی واپسی سے پہلے وہ وہاں سے ٹل گئی۔

”دھل تو گئی ہے مگر اب دامن پر پانی کا اتنا بڑا داغ اچھا نہیں لگ رہا۔“ راحیلہ نے آتے ہی کہا۔

”واپس کمرے میں چلتے ہیں، سارا موڈ غارت ہو گیا۔“

”کافی نہیں پیو گی؟“

”نہیں۔ بس چلو۔“ اس نے ضد کی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ہم ہوٹل میں پہنچ گئے۔

☆.....☆.....☆

رات کا کھانا ہم نے کمرے میں کھایا۔ بااثر مجبوری مجھے راحیلہ کے دودھ میں خواب آور دوا ڈالنا پڑی۔ یہ چمپوں کی ہدایت تھی۔ وہ رنگ میں بھنگ ڈلتی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

بیچ پارک ہوٹل سے ایک میل دور تھا۔ میں وہاں تک پیدل ہی گیا۔ چودھویں کا چاند پوری آب و



تھیں۔ ان میں سب سے نمایاں کنواری مریم کی تصویر تھی جس پر پھولوں کا ایک سوکھا ہار پڑا تھا۔ ایک طرف کچریل کی چھال سے تیار کیا ہوا خوبصورت فریم تھا جس پر یہ الفاظ درج تھے۔

”خداوند میرا چوپان ہے مجھے کمی نہ ہوگی۔“

جیسا کہ نظر آ رہا تھا وہ ایک کرسچین لڑکی تھی جس کا باپ کوئی انگریز ملاح ہوگا اور ماں مقامی ہندوستانی عورت۔ اینگلو انڈین لوگوں کا المیہ یہ تھا کہ وہ خود کو انگریز سمجھتے تھے اور احساس برتری کے مارے عام مقامی لوگوں سے میل جول سے کتراتے تھے۔ لیکن انگریزوں نے انہیں کبھی اپنے جیسا نہیں سمجھا تھا۔ ان کی نگاہ میں وہ ہندوستانی ہی تھے۔ کیا ہوا اگر ان کی رگوں میں کسی انگریز کا خون دوڑ رہا تھا۔ انگریزوں نے نوآبادیاتی دور میں ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک پر حکومت کی تھی اور اس دوران مقامی لوگوں کو جوان کی نگاہ میں کمیں تھے وصل شاہی سے سرفراز کیا تھا۔ نظریہ ضرورت کے تحت اگر انہوں نے مقامی عورتوں سے وقتی تلذذ حاصل کیا تھا تو اس کی باقاعدہ قیمت ادا کی تھی۔ اس کے بعد یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ان کے گناہوں کے مجسم نتائج ان کے سر منڈھے جائیں؟ آقاؤں کو مورد الزام ٹھہرانا اور ان پر دشنام طرازی غلاموں کا شیوہ نہیں!.....

”تم بیٹھو میں تمہارے لئے سنیک بناتی ہوں۔“ اس نے مجھے صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

جب وہ کچن کی طرف چلی تو میری نگاہ اس کا سایہ بن گئی۔ سایہ جو ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس لڑکی کے سراپا میں بے پناہ کشش تھی۔ وہ چولہے کے قریب جا کر رکی تو اس کے سیاہ لمبے بال اس کی کمر سے اٹھکلیاں کر رہے تھے۔ ضبط کا یارا نہ تھا مگر میں نے کچھ دیر خود کو تھامے رکھا اور آنکھیں موند لیں مگر یہ حیلہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوا تو میں اٹھا اور عقب سے اسے دبوج لیا۔ وہ پہلے حیران ہوئی پھر میری وارفتگی دیکھ کر اسے چائے سنیک سب کچھ بھول گیا.....

وہ ایک تجربہ کار کال گرل تھی جس نے سیاہوں کا دل بھانے کے لئے اس ساحلی مقام پر اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ وصل کے شہد آگیاں لحات کے بعد اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں اپنی تنگ دستی کا تذکرہ کر کے میری ہمدردیاں سمیٹیں اور مجھ سے اچھی خاصی رقم بٹور لی۔ میں نے بھی غم نہ کیا کیونکہ ایک ایسی لڑکی کو جس کی زندگی کے محض چند گھنٹے باقی ہوں کسی طرح کا دکھ دینا میرا شیوہ نہ تھا۔ ویسے میں یہ سمجھ نہ پایا کہ جب وہ کال گرل تھی تو اسے سیدھے سبھاؤ پیشگی معاملہ طے کرنے میں کیا امر مانع تھا؟ شاید یہ بھی کوئی مقامی طریقہ واردات ہو!

”اب چائے اور سنیک لاؤں؟“ کافی دیر کے بعد اس نے انگڑائی لیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”اگر چہ جی تو کچھ اور ہی چاہتا ہے مگر لے آؤ.....“ میں نے جوابی مسکراہٹ اچھالی۔

”تو پھر کچھ اور ہی ٹھیک ہے آئی تھنک!“ اس نے قہقہہ لگایا۔

”نہیں مجھے اب چلنا چاہیے۔ مت بھولو میں اپنی بیوی کو ہوٹل میں سوتا چھوڑ کر آیا ہوں۔“

”تمہارا میرج نیا نیا لگتا ہے ایم آئی رائٹ؟“

”لیس.....!“

”تمہیں میرج نہیں بنانا چاہیے تھا!“

”کیوں؟“

”جب مارکیٹ میں ملک ملتا ہو تو کاؤ خریدنا کوئی عقل مندی نہیں!“ اس نے لوفروں کی طرح آنکھ ماری۔

میں ہنسنے لگا۔

”آئی مین مرد کا آزادی ختم ہو جاتا ہے۔ ابھی دیکھو نا تم وائف کے فیئر کی وجہ سے میرے پاس سے جانا مانگتا ہے۔“

”کوئی فیئر نہیں ہے۔ دراصل میں نہیں چاہتا کہ میری حرکات کا اسے علم ہو اور اسے دکھ پہنچے۔“

”تمہارا فلسفہ میری سمجھ سے اوپر ہے۔“ وہ ہنسی۔ ”بیوی سے کبھی کبھار بے وفائی ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے باہر ہوٹل سے کھانا کھالے۔ اس سے کسی کی بیوی کو غم زدہ نہیں ہونا چاہیے۔“

”یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ خیر چھوڑو۔ وہ تصویر کس کی ہے؟“

میں نے کارنس پر سچے فریم کی طرف اشارہ کیا جس میں ایک خوب روڑ کی مسکراہٹ تھی۔

”یہ میری بہن لا رہی ہے۔ اسٹیج کی فنکارہ اور کافی مشہور ماڈل ہے۔“

”تم نے اداکاری اور ماڈلنگ کی دنیا میں قدم نہیں رکھا؟“

”میں گوا چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی..... گوا مجھے بے حد پسند ہے۔ اس جیسی بچہ دنیا میں کہیں نہیں.....“

”ہاں یہ تو تم نے ٹھیک کہا ہے۔ میں خود یہاں کی بچہ کا عاشق ہو گیا ہوں۔ آج پورن ماشی کی رات ہے۔ اس وقت تو قریبی بیچ کا نظارہ دیکھنے کے قابل ہوگا.....“

”لیس۔ یو آ رائٹ“

”تو کیوں نہ ہم بیچ پر چلیں۔“ میں نے پینٹر ابدلا۔ ”وہاں بیئر پیئیں گے۔“

”بیئر تو قریبی اسٹور سے لینی پڑے گی۔“

”نو پر اہلم..... لیتے چلیں گے۔“

”چلو پھر چلتے ہیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔



میری مراد برآئی تھی۔ میں جلد از جلد اپنا فریضہ ادا کر کے ہوٹل واپس جانا چاہتا تھا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے بیرونی دروازہ مقفل کیا اور ہم دونوں کھلی فضا میں آ گئے۔ چاند کی روشنی ارد گرد کے ماحول کو منور کر رہی تھی۔ میں نے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ خوش قسمتی سے وہاں کوئی نہ تھا۔ کسی نے ہمیں اکٹھے اس کا بیچ سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ فرلانگ بھر دور ایک اسٹور کھلا تھا۔ میں نے اسے ایک جگہ ٹھہرنے کو کہا اور جا کر خود بیئر کے دوٹن خریدے۔ ماریا مجھے ایک مختصر اور قدرے ویران راستے سے قریبی بیچ پر لے گئی۔ چاندنی میں نہائی ہوئی وہ ایک دل فریب اور پراسراری جگہ تھی۔ بڑی بڑی ستون نما چٹانیں زمین سے پچاس ساٹھ فٹ اوپر اٹھی ہوئی تھیں اور پھری ہوئی موجیں بار بار ان سے سر پٹک رہی تھیں۔ سمندر میں جوار بھاٹا کی کیفیت پورن ماشی کے چاند کی مرہون منت تھی۔ شوریدہ سرموچیں اسے اڑ کر چھو لینا چاہتی تھیں۔

”یہ میرا پسندیدہ ساحل ہے۔“ ماریا نے سرگوشی کی۔ ”یہاں اسے عاشقوں کا ساحل کہا جاتا ہے۔“ میں نے بغور دیکھا وہاں کوئی ذی روح نہ تھا۔

”اچھا عاشقوں کا ساحل ہے!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”کہیں کوئی جوڑا دکھائی نہیں دیتا!“ ”خود میرے لئے یہ بات بہت سٹریج ہے۔ یہاں تو آدھی رات کے بعد بھی خاصی رونق ہوتی ہے۔“ وہ تعجب ظاہر کرنے لگی۔ پھر خود ہی بولی۔ ”آج اور یگا ہال میں ایک میوزیکل کنسرٹ بھی ہے شاید سب لوگ ادھر چلے گئے ہیں۔“

”ہاں یہی وجہ لگتی ہے۔ بہر حال ہمارے لئے یہ امر باعث مسرت ہونا چاہیے کہ ہم ساحل پر اکیلے ہیں اور کسی کی مداخلت کے بغیر پیار بھری باتیں کر سکتے ہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے.....“ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور ایڑیاں اٹھا کر اپنے ہونٹ میرے منہ کے قریب لائی۔ میں نے اس کے لب نعلیں کا رس کشید کرنے میں کسی تساہل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ”آؤ ان چٹانوں پر بیٹھ کر بیئر پیئیں اور پورن ما اور ساگر کا ابدی کھیل دیکھیں۔“ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”چلو.....“ اس نے پیار بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ میں اس کا ہاتھ تھامے ایک ڈھلوانی راستے سے اوپر چڑھنے لگا۔ ہموار چٹان پر ایک مسطح جگہ ہم دونوں پاؤں پیسار کر بیٹھ گئے اور بیئر سے لطف اندوز ہونے لگے۔

اس لمحے مجھے اپنے قریب چمپون کی موجودگی کا احساس ہوا اور کانوں میں اس کی ناراض سی سرگوشی سنائی دی۔

”محبوب! بہت چہلیں ہو چکیں۔ اب ماریا کا قصہ ختم کرو۔ میرے لئے مزید صبر کرنا محال ہے۔“

”اچھا بابا۔ تمہارا عصہ کونال پر بیٹھا رہتا ہے۔“ ”کیا کہا ڈارلنگ؟“ ماریا کی خمار آلود آواز سنائی دی۔ میں نے اسے جواب دینے کی بجائے ایک لخت اس کا گلا دبوچ لیا۔ میرا یہ اقدام اس کے لئے قطعی غیر متوقع تھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے حیرانی اور پھر خوف کے سائے لہرائے اور وہ قصاب کی گرفت میں آئی ہوئی بھیڑ کی طرح ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ لیکن میرے آہنی ہاتھوں کی گرفت سے نکلنے کی ہر کوشش بے سود تھی۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی چیخ حلقوم سے باہر نہ نکلنے دی۔ جان کنی کے عالم میں اس کے مرمریں بدن نے دو تین شدید جھٹکے کھائے اور پھر جب اس کی روح قصرِ عنصری سے پرواز کرنے ہی والی تھی میں نے اسے زمین پر پٹخا اور میکا کی انداز میں اپنے پیتل کی ٹو (Toe) والے نوکدار بوٹ کی زوردار ٹھوکرا اس کی ٹھوڑی کے نیچے دے ماری۔ خون اس کی شاہ رگ سے فوارے کی طرح اُبل پڑا۔

اب فضا میں ایک مہیب چمکناؤ کے پروں کی پھر پھر اہٹ سنائی دے رہی تھی۔ خون آشام چمپون اپنے شکار کا خون پینے کے لئے بے تاب تھی۔ میں نینا کی تڑپتی لاش کو چٹان پر چھوڑ کر تیزی سے نیچے اتر گیا۔



مسٹر براؤن نے ہمارے پاسپورٹ اور ویزے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے دو تین روز ہی میں تیار کروا دیئے تھے۔ ہمیں رواں مہینے کی گیارہ تاریخ کو مسٹر براؤن کے کام کے لئے نیوجرسی پہنچنا تھا جبکہ ہماری لندن کی فلائٹ چار تاریخ کو روانہ ہو رہی تھی۔ مسٹر براؤن کے وعدہ کے مطابق ہم دونوں سات دن تک اس کے ذاتی مہمانوں کی حیثیت سے چار روز لندن اور چار روز نیویارک میں گزارنے کا پروگرام ترتیب دے چکے تھے۔ مقررہ وقت پر ہمیں بی بی کلثوم ان کی بہو اور بیٹے نے دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ بی بی کلثوم جہاں اس بات پر خوش تھیں کہ ان کے داماد کو امریکہ میں اتنی اچھی نوکری مل گئی ہے وہیں وہ بیٹی کی جدائی کے تصور سے مغموم بھی تھیں۔ راحیلہ نے انہیں تسلی دی اور وعدہ کیا کہ وہ ہر چھ ماہ بعد ان سے ملنے خود انڈیا آئے گی یا ان کو نیویارک بلا لیا کرے گی۔ تب کہیں جا کر انہیں قرار آیا۔

جانے سے پہلے مجھے تھوڑی تنہائی میسر آئی تو چمپون چلی آئی۔ ماریا کا خون سرخی کی صورت میں اس کے رخساروں سے چھلک رہا تھا۔ پورن ماشی کی رات سمندر کی وحشی لہروں اور چاند کی منور کرنوں سے غسل کرنے کے بعد اس کی رعنائی شباب اور تابانی حسن جو بن پر تھی..... اس کی روایتی شوخی و طراری اور چنچل پن لوٹ آیا تھا۔

”ہاں جی..... پھر ہو رہی ہے یورپ اور امریکہ کی یا ترائ..... ٹائس کپل!“

”ہاں..... تمہاری مہربانی ہے!“



جانب یہ بوابی تعاون کا معاملہ ہے مہربانی کی! ویسے ایمان کے لئے آپ بے حاشا پیارا لگا ہے۔ تم شکار گھیرنے اور اسے انجام تک پہنچانے میں بہت کم عرصے میں ماہر ہو گئے ہو۔ صدیوں بعد میں نے تم جیسا نڈراور ذہین نوجوان پایا ہے!“

”ذرا نوازی ہے آپ کی ورنہ یہ بندہ ناچیز کس قابل ہے!“ میں نے کالر جھاڑے تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

”جاؤ عیش کرو..... گیارہ تاریخ کو نیوجرسی میں خبیث جیکب کے قلعہ نما مکان کے قریب جھیل پر ملاقات ہوگی۔

”او۔ کے بائے!“

”بائے!“ اس نے شوخی سے کہا اور میرے ہونٹوں پر مہر محبت ثبت کر کے غائب ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

نصف شب کے قریب برٹش ایئر ویز کا ہوائی جہاز ہیتھرو ایئر پورٹ پر اترا۔ کسی یورپی فضائی کمپنی کے ذریعے سفر کا میرا اور راحیلہ کا یہ پہلا تجربہ تھا جو بہت خوشگوار رہا تھا۔ عملے کی میزبانی، حسن سلوک اور نفاست قابلِ تعریف تھی۔ ایئر ہوسٹس پر یوں کی طرح حسین و خوش خصال تھیں۔ ان کی اسمارٹ نس اور مستعدی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ انتہائی متناسب جسم، لمبی لمبی گوری ٹانگیں اور چال بے حد تیز جیسے ہوا میں تیر رہی ہوں۔ کسی کو میں نے ایک جگہ ساکت نہ دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے رنگین اور خوشبودار تتلیاں ہوائی جہاز کے اندر اڑتی پھر رہی ہیں۔ وہ بہت پریم سے خوش ذائقہ سینڈوچ، پینر، مکھن، ڈنر رول اور مشروبات پیش کرتی تھیں۔ کھانا تو خوش ذائقہ تھا ہی ان کی پیشکش کا انداز بھی دلبرانہ تھا۔

ہیتھرو ایئر پورٹ بہت کشادہ اور قابلِ دید تھا، رنگ و نور میں نہایا ہوا۔ جگہ جگہ دلفریب و دیدہ زیب کاؤنٹر بنے ہوئے تھے جہاں مسکراتا ہوا چاک و چوبند عملہ سوری اور تھینک یو کا آمونختہ دہراتے ہوئے مسافروں کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہا تھا۔ عملے میں اکثریت سرخ و سپید اور جوان گوریوں کی تھی۔ بعض اتنی کم عمر تھیں کہ لگتا تھا سیدھی ہائی اسکول سے آرہی ہیں۔

ایئر پورٹ پر مسٹر براؤن کا نمائندہ مسٹر پیٹر ہمارے استقبال کے لئے موجود تھا۔ اس نے ایک پلے کارڈ اٹھا رکھا تھا جس پر ہمارے نام درج تھے۔ ہم اس کی لائی ہوئی ٹیکسی کار میں رائل پیلس ہوٹل روانہ ہو گئے۔

ہوٹل کی عمارت فلک بوس تھی اور اس میں سینکڑوں کمرے تھے۔ ہمارا سویٹ بہت شاندار تھا۔ تمام جدید آسائشوں اور سہولتوں سے مزین۔ ایک میز پر پمفلٹوں کا انبار تھا جنہیں پڑھنے کے لئے پوری رات درکار تھی۔ تھیٹروں، اوپیرا گھروں، نائٹ کلبوں، عجائب گھروں اور نمائشوں کے اشتہارات۔ راحیلہ نے

تین روز ہم نے خوب سیر سپاٹا کیا۔ راحیلہ نے جن مقامات کا ذکر کیا تھا ان کے علاوہ بھی بے شمار جگہوں کی یا تراکی۔ ہائیڈ پارک گئے، دریاے ٹیمز کی سیر کی اور رائل فیسٹیول ہال میں سیلے ڈانس بھی دیکھا۔ اس نے پہلو میں لندن کے کنٹری ہال اور میوزک اینڈ آرٹ اسپیکس بھی گئے۔ راحیلہ کی شاپنگ کی ساری حسرتیں آکسفورڈ اسٹریٹ، ریجنٹ اسٹریٹ اور بکنگھم اسٹریٹ میں پوری کروائیں۔ میں نے اسے بے شمار ملبوسات جوئے، میک اپ کا سامان اور ہیرے کا ایک خوشنما سیٹ لے کر دیا۔ وہ خوشی سے نہال ہو گئی۔ لندن میں قیام کے دن تمام ہوئے تو ٹرانس ورلڈ اٹلانٹک (TWA) کی پرواز سے ہم عازم نیویارک ہوئے۔

جان کینڈی انٹرنیشنل ایئر پورٹ بھی کشادہ اور خوبصورت تھا مگر اس میں ہیتھرو ایئر پورٹ جیسی نفاست رکھ رکھاؤ اور رومانویت جو گوروں کا خاصہ ہے دکھائی نہ دی۔ عملہ یہاں بھی چاک و چوبند تھا، مگر ان کا انداز مہذب نہ تھا بلکہ کاؤ بوائے اسٹائل سے زیادہ مشابہہ تھا۔ عورتوں میں بھی نزاکت و نفاست کی کمی تھی۔ انگریز عورتوں کے مقابلے میں وہ خاصی و لگرتھی تھیں۔ ہم ایئر پورٹ سے باہر نکلے تو مسٹر براؤن کی نمائندگی کیتھی نام کی ایک دراز قد امریکی عورت کر رہی تھی۔ اس نے اپنے فری اسٹائل میں ہمیں خوش آمدید کہا اور ایک فورڈ وین میں ہمیں ہوٹل بروکلین لے گئی۔ نیویارک بلند و بالا عمارتوں کا شہر ہے جو زمین میں کیلوں کی طرح گڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ہوٹل خاصا دور تھا وہاں پہنچتے پہنچتے سورج طلوع ہو گیا۔

نیویارک میں جو مقامات دیکھے ان میں جمیکا بے، منہا تھن بیچ، ٹائم اسکوائر، براؤن لائنگ آئی لینڈ اور میوزیم آف نیچرل ہسٹری کا بطور خاص ذکر کروں گا۔ اس کے علاوہ راحیلہ کو وہاں کے سب سے مہنگے شاپنگ مال ففٹھ ایونیو سے خوب شاپنگ کروائی۔ آخر گیارہ تاریخ آگئی اور حسب پروگرام مسٹر براؤن کے ہمراہ ہم نیوجرسی روانہ ہو گئے۔ راحیلہ کو کچھ علم نہ تھا کہ ہم وہاں کیوں جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اسے میں



نے کوئی اور ہی کہانی سنائی تھی۔

ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے وہ بھی بہت خوبصورت اور باذوق انداز میں آراستہ و پیراستہ تھا۔ ایک رات قیام کے بعد جب میں لفٹ میں اکیلا نیچے لابی کی طرف جا رہا تھا تو چمپون اچانک لفٹ میں نمودار ہو گئی۔ اس نے اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ مغربی لباس میں وہ کوئی بڑی ہی انوکھی شے لگ رہی تھی۔ ”انجوائنگ یور سیلف؟“ اس نے دلکش انگریزی میں کہا۔

”تم تو بالکل انگریز لگ رہی ہو!“ میں نے سحرزدہ ہو کر کہا۔ ”بال بھی بڑے اسٹائل میں بنوار کھے ہیں اور ان کا کلر بھی براؤن ہے!“

”جیسا دلیس ویسا بھیس!“

”ویسے بہت اچھی لگ رہی ہو۔ مجھے اسی روپ میں ملا کرو۔“

”بس بولی۔ تم تو ہو ہی عاشق مزاج۔ پاکستان اور بھارت میں مشرقی حسن پر مرتے تھے یہاں آئے تو گوریوں پر لٹو ہو گئے۔ مجھے یقین ہے میں تمہیں چین لے گئی تو پھیننی ناک والی لڑکیاں بھی پسند کرنے لگو گے!“

”کیا کروں، پیدائشی حسن پرست ہوں!“ میں ہنسا۔

”اچھا اب کام کی بات سنو۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”تمہیں کل شام اس جھیل پر پہنچنا ہے اور سورج غروب ہوتے ہی جھیل کے کنارے منڈلی جما کر ایک مخصوص جاپ کرنا ہے۔ آدھی رات کے وقت جھیل کی سطح سے ایک بدروح نمودار ہوگی جو کسی بوڑھی انگریز عورت کی ہوگی۔ اس کا نام ہلڈا ہوگا۔ اس سے دریافت کرنا کہ جولیا زندہ ہے یا مردہ اور اگر زندہ ہے تو اس وقت کہاں ہے۔“

”راہیلہ کو ساتھ لے جاؤں یا یہیں چھوڑ دوں، اس منہمکے میں گرفتار ہوں!“

”اسے یہیں چھوڑنا پڑے گا۔ میں نے اس کے لئے ایک مصروفیت پیدا کی ہے۔ اس ہوٹل میں حقوق نسواں پر ایک دوروزہ ورکشاپ ہو رہی ہے۔ میں ایک امریکی خاتون سوشل ورکر مادام لوسی کے توسط سے اسے اس ورکشاپ میں مصروف کر دوں گی۔ تم مسٹر براؤن کے ساتھ ملازمت کے سلسلے میں ٹور کا بہانہ بنا کر نیوجرسی چلے جانا۔ کل ایک دن کا کام ہے۔“

اور پھر چمپون نے اپنے روایتی کمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے راہیلہ کو اس خوبصورتی سے ورکشاپ میں مصروف کیا کہ مجھے ایک لفظ نہ کہنا پڑا۔

نیوجرسی پہنچے تو مسٹر براؤن کی بے چینی و بے قراری دیدنی تھی۔ جب وہ مجھے مغرب سے کچھ پہلے اس جھیل کے کنارے کار سے اتار کر امپیریل ہوٹل جانے لگا تو سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میری تمام امیدیں آپ سے وابستہ ہیں۔ اگر آپ ناکام ہوئے تو میری موت یقینی ہے!“

میں نے اسے تسلی دے کر رخصت کیا اور سورج غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جھیل پر سرمئی اندھیرا پھیلا تو ارد گرد کا ماحول مہیب اور پراسرار ہو گیا۔ جھیل کنارے کے گھنے درختوں کے جھنڈ میں پرندے بھی یوں خاموش ہو گئے جیسے کسی بھوت کی آمد نے انہیں دم بخود کر دیا ہو۔ میں نے ایک دائرہ کھینچا اور اس میں چوڑی مار کر بیٹھ گیا۔ سامنے ایک رکابی میں دہکتے ہوئے انگارے تھے اور مصالحوں میں پکا ہوا بڑا گوشت جسے منتر پڑھتے ہوئے بوٹی بوٹی مجھے ان انگاروں پر ڈالنا تھا۔ ابھی میں نے جاپ شروع کیا ہی تھا کہ جھیل کی سطح پر جنبش ہوئی۔ پھر ایک بڑے بھنور کی صورت میں ارتعاش اور بلبلے پیدا ہوئے اور اچانک دل دہلا دینے والی مہیب چنگھاڑ کے ساتھ سیاہ لبادے میں ملبوس کسی مرد کی بھیا ناک بدروح جھیل سے باہر نکلی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بدروح گردباد کی صورت گھوم کر میرے سامنے آئی اور دائرے سے باہر ہوا میں معلق ہو گئی۔

اُف! مدقوق اور کریہہ بدروح کا آدھا چہرہ اور ہاتھ گوشت سے بے نیاز تھے اور استخوانی انگلیوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ آنکھوں کی جگہ گڑھے تھے جن میں شعلے رقصاں تھے۔ اس کے غار نما منہ سے غراتی ہوئی آواز نکلی:

”میں مسٹر جیکب ہوں۔ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ عشتر دیوی کے سحر سے تمہیں جلا کر راکھ کر دوں گا!“

☆.....☆.....☆





اب جیکب کی بدروح نے ایک اور پیٹنٹر ابدلہ۔ اس نے آسمان کی طرف منہ کر کے بھیا نک چیخ ماری تو جنگل تھرا اٹھا۔ یکا یک ہزاروں چمگاڈیں نمودار ہوئیں اور میرے سر پر چکر کاٹنے لگیں۔ وہ چندفٹ کی بلندی پر محو پرواز تھیں اور ان کے کریہہ پروں کی حرکت سے پیدا ہونے والی ہوا سے میرے سر کے بال اڑ رہے تھے۔ میں نے پھر آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر بعد یہ منظر بھی غائب ہو گیا۔ جیکب کی بدروح پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس کے لیے یہ بات باعث حیرت تھی کہ میں عشتار کے حیرے مرعوب ہوئے بغیر اپنی منڈلی جمائے بیٹھا تھا اور بدستور جاپ مکمل کر رہا تھا۔ دفعتاً وہ خباثت سے مسکرایا اور بولا:

”دیکھو نو جوان۔ عشتار دیوی کی طرف سے میرے ذہن پر یہ خیال القا کیا گیا ہے کہ تمہاری بیوی جس کا نام راحیلہ ہے، قریب ہی ایک ہوٹل میں مقیم ہے۔ اگر تم اس کی خیریت چاہتے ہو تو یہ جاپ بند کر دو.....!“

یہ سن کر میں ساری چوڑی بھول گیا۔ اب جیکب کی بدروح تمام تر باطنی خباثت کا مظاہرہ کرنے پر نکل گئی تھی۔

”تم کیا کرو گے؟“ میں نے تھوک نکل کر پوچھا۔

”اس کا گلا گھونٹ دوں گا اور کیا کروں گا۔“ اس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

”دیکھو تم..... تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ اس معصوم کا ہماری باہمی لڑائی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے تو یہ بھی معصوم نہیں کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔“

”نو جوان تم نے وہ مقولہ تو ضرور سنا ہوگا کہ جنگ اور محبت میں سب جائز ہے! جو لیا میری محبت ہے۔ تم اسے مجھ سے چھیننا چاہتے ہو۔ میں تمہیں اس اقدام سے باز رکھنے کے لیے تمہاری محبت کو گزند پہنچانے سمیت کچھ بھی کرنے کا حق رکھتا ہوں۔“

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ ایک طرف مسٹر براؤن سے کیا ہوا وعدہ تھا اور دوسری طرف میری پیاری بیوی راحیلہ۔ اسے کوئی نقصان پہنچنے میں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اپنے وعدے کا پاس بھی ضروری تھا۔ مجھے خبیث جیکب کی بدروح پر ایک دم تاؤ آ گیا۔ میں نے اپنے سامنے رکھی ہوئی انگاروں بھری تھالی اٹھا کر اس پر اچھال دی۔

جیکب کی بدروح نے ایک بھیا نک چیخ ماری۔ میرا وارکار گر ثابت ہوا تھا۔ آگ نے اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ بری طرح چیختے ہوئے گردباد کی طرح چکر لگانے لگا۔ فضا میں ایک ناگوار بواور چراندی پھیلنے لگی اور چند ہی لمحوں میں اس کے سوختہ بدن کی راکھ جھیل کی سطح پر بکھر گئی!

میں نے شلہ کا سانس لیا۔ جھیل، جنگل اور ارد گرد کے ماحول پر ایسا سکوت طاری تھا جیسے وہاں صورتِ انسانی پھونک دیا گیا ہو۔ میں نے ایک بار پھر منڈلی جمائی آگ دہکائی اور جاپ شروع کر دیا۔ دو گھنٹے

میرے لیے یہ صورت حال بالکل غیر متوقع تھی اس لیے میرا بدحواس ہونا ایک فطری عمل تھا۔ چپون نے کہا تھا۔ جاپ کے نتیجے میں بوڑھی انگریز عورت ہلڈا کی روح نمودار ہوگی مگر اس کے برعکس خبیث جیکب کی بدروح اپنے تمام تر بھیا نک پن کے ساتھ آوارہ ہوئی تھی اور مجھے جلا کر ختم کر دینے کی دھمکیاں دے رہی تھی۔ مجھے لحو بھر کے لیے کچھ سمجھ نہ آئی کہ اس نئی افتاد سے کیسے عہدہ برا ہوا جائے؟ میں نے بے چین ہو کر چپون کو پکارا مگر وہ آئی نہ اس نے کوئی جواب دیا۔ وہ کہہ چکی تھی کہ دیویاں دوسرے کے حلقہ اثر میں آنے سے اجتناب برتی ہیں۔ اس صورت حال سے مجھے خود ہی نکلتا تھا۔ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ میں اپنے گرد حصار کھینچ کر بیٹھا تھا۔ کسی بدروح یا ماورائی شے کے لیے ممکن نہ تھا کہ اس حصار میں داخل ہو کر مجھے نقصان پہنچائے۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کر کے خبیث جیکب کی بدروح سے کہا۔

”میں تمہاری گیدڑ بھکیوں میں آنے والا نہیں..... میرے ساتھ چپون جیسی ماورائی ہستی ہے جس کی طاقت کا تمہیں اندازہ نہیں۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ.....“

”میں بھی عشتار کا پجاری ہوں۔ جانتے ہو وہ کون ہے؟ عظیم بابل کی عظیم دیوی۔ اس کا سایہ میرا ہم رکاب ہے اور اس کا سحر میرا ہتھیار ہے۔“

”تو اس کا سحر تم مجھ پر آزماتے کیوں نہیں۔ میں بھی تو دیکھوں اس کا سحر کتنا کارگر ہے.....؟“

”اچھا یہ بات ہے!“ جیکب کی بدروح غصے سے لال بھوکا ہو گئی۔ ”تو پھر دیکھو عشتار کے سحر کا نظارہ۔“ یہ کہہ کر اس نے زور سے پھونک ماری تو جھیل کی سطح پر ایک بھونچال آیا اور یک لخت سینکڑوں مگر مجھ جھیل سے نکل کر میری طرف دوڑے۔ خدا کی پناہ! وہ ایک ہیبت ناک منظر تھا۔ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ لحو بھر کے لیے جی میں آئی کہ حصار چھوڑ کر بھاگ نکلوں مگر پھر یہ خیال ذہن میں کسی کوندے کی طرح لپکا کہ یہ اقدام خودکشی کے مترادف ہوگا۔ مگر مجھ حصار سے نکلتے ہی مجھے چیر پھاڑ ڈالیں گے۔ میں نے بمشکل خود کو تھامے رکھا۔ مگر مجھ میرے حصار کے گرد آ کر جمع ہو چکے تھے اور اپنے خوفناک منہ کھولے مجھے چبا ڈالنے کے لیے بے چین تھے مگر حصار کے اندر داخل ہونا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے خوف سے آنکھیں موند لیں اور تیز تیز جاپ شروع کر دیا۔ چند لمحوں بعد آنکھیں کھولیں تو مگر مجھ غائب تھے۔



بعد بوڑھی ہلڈا کی روح سطح آب پر نمودار ہوئی۔

”کیا تم ہلڈا ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”مادام ہلڈا کہو.....“ روح نے سر دلچے میں جواب دیا۔

”آئی ایم سوری!“ میں نے معذرت کی۔ بوڑھی انگریز عورت کا وہی حال تھا کہ سی جل گئی مگر بل نہ

گیا! مرکز بھی وہ وضع داری اور رکھ رکھاؤ کی قائل تھی۔

”مادام ہلڈا۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ مسز جولیا براؤن زندہ ہے یا لقمہ اجل بن گئی؟“ میں نے

سوال کیا۔

”وہ زندہ ہے اور اس جھیل کی اتھاہ گہرائیوں میں قید ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اسے

مسٹر جیکب کی بدروح نے قیدی بنا رکھا تھا جسے تم نے جلا کر بھسم کر ڈالا۔ وہ بالکل اسی طرح قید ہے جیسے

پنجرے میں پنچھی.....“

”اس کی رہائی کی کیا صورت ہو سکتی ہے مادام ہلڈا؟“

عشثار دیوی کی خوشنودی حاصل کئے بغیر اس کی رہائی ناممکن ہے نوجوان۔ تم نے اس کے پجاری کو

جلا کر رکھ کر ڈالا۔ وہ یقیناً تم پر غضب ناک ہوگی۔“

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”بابل کا سفر اور عشثار کے مندر میں انسانی قربانی۔ اس کے بغیر جولیا کو اس قید سے ہرگز رہائی نہ

ملے گی۔“ یہ کہہ کر مادام ہلڈا کی روح غائب ہو گئی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ایک نیا مرحلہ تھا جس کے لیے میں تیار نہ تھا۔ خیر میں ہوٹل پہنچا اور مسٹر براؤن

سے ملا جو سراپا انتظار تھا۔ اس کی بے چینی اور بے تابی کی تصویر کشی الفاظ میں ممکن نہیں۔ بہر کیف میں نے

اسے پوری بات بتائی۔ اس کے لیے انسانی قربانی والی بات تکلیف دہ تھی۔ کرب ناک آواز میں کہنے لگا:

”میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں اپنا مطلب حل کرنے کے لیے کسی بے گناہ انسان کو

قربانی کا بکرا بناؤں۔“

”میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں مسٹر براؤن۔ لیکن دیکھئے دنیا ایسے درندہ صفت لوگوں

سے بھری پڑی ہے جو فساد ہی ہیں، قاتل، ڈاکو اور لٹیرے ہیں۔ وہ انسانیت کے خلاف بھیا تک جرائم کا

ارتکاب کرتے ہیں۔ دنیا بھر کی عدالتیں ایسے لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچاتی ہیں۔ بعض کو تو پھانسی کی سزا

بھی دی جاتی ہے۔ اگر ہم کسی ایسے آدمی کو پکڑ کر عشثار دیوی کی قربان گاہ پر ذبح کر ڈالیں تو اس میں

کیا مضائقہ ہے؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”بات تو ٹھیک ہے مگر ہم ایسے انسان کا بندوبست کیسے کر سکیں گے؟“

”آپ یہ سب مجھ پر چھوڑ دیں۔“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا تو وہ مطمئن نظر آنے لگا اور بولا:

”میں آپ کا شکر گزار ہوں..... آپ میرے لیے اتنا کچھ کر رہے ہیں۔ میں آج ہی سے آپ کو

اپنی فرم میں مینیجر لگا رہا ہوں۔ آپ دو تین روز اپنی بیوی کے ساتھ گھومیں پھریں اس کے بعد بابل کا سفر

اختیار کر لیجئے گا.....“

مسٹر براؤن سے رخصت پا کر جب میں ہوٹل پہنچا تو ایک قیامت خیز خبر میری منتظر تھی۔ میری

شریک حیات راحیلہ کو ایک تیز رفتار کار نے کچل کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ اس صدمے کی تاب نہ لا کر میں بے

ہوش ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے چپون کو اپنے سر ہانے بیٹھے دیکھا۔ وہ مجھے دلاسا دے رہی تھی۔ اور

صبر کی تلقین کر رہی تھی۔ میں اس وقت ایک اسپتال میں تھا۔

”کیسے صبر کروں؟“ میں نے بلکتے ہوئے کہا۔ ”تقدیر میرے ساتھ ہی کیوں مذاق کرتی ہے؟ جو بھی

مجھے پیارا ہوتا ہے مجھ سے چھین کیوں لیا جاتا ہے؟“

”یہ عشثار دیوی کا کیا دھرا ہے۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”اس نے جیکب کی بدروح کو جلا ڈالنے کا

بدلہ لیا ہے!“

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”یہ سچ ہے۔“

”اگر اسے انتقام لینا تھا تو مجھ سے لیتی.....“ میں نے بلکتے ہوئے کہا۔ ”اس بیچاری کا کیا قصور تھا؟“

”ہماری ماورائی دنیا بہت بے رحم ہے بولی۔ وہاں انتقام لینے کے لئے کوئی ضابطہ، اخلاق مقرر

نہیں۔ عشثار دیوی تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھی، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ تم میری حفاظت میں ہو اسی لئے اس

نے اوچھاوار کیا۔“

”تم..... تم میرے کس کام کی ہو؟“ میں چیخنے لگا۔ ”تمہارے ہوتے ہوئے میری بیوی کو مار ڈالا گیا

اور تم کچھ بھی نہ کر سکیں؟“

”میں نہیں جانتی تھی کہ عشثار دیوی ایسا قدم اٹھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ دوسرے مسٹر جیکب کی

بدروح کو جلا کر بھسم کر ڈالنے کا فیصلہ تمہارا اپنا تھا۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”تو میں کیا کرتا؟ کیا کرتا میں؟“ میں نے جھلا کر کہا۔

”تم خاموشی سے اپنا جاپ جاری رکھتے تو وہ دفعان ہو جاتا..... جب کوئی عامل کسی عمل میں مصروف

ہوتا ہے تو بدروحیں جنات اور چڑیلیں اسے تنگ کرنے پہنچ جاتی ہیں۔ عامل کو ان سے ہرگز الجھنا نہیں



چاہیے ورنہ اس کی راہ کھوٹی ہو جاتی ہے۔ جو عامل پر سکون رہتے ہیں اور انہیں درخور اعتنا نہیں سمجھتے اپنی مراد پالیتے ہیں۔“

”یہ باتیں تم نے مجھے پہلے بتانی تھیں.....“ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”جب میری دنیا لٹ گئی، میں برباد ہو گیا اس وقت میری معلومات میں اضافہ کرنے چلی آئیں.....“

”یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ تمہاری دنیا لٹ گئی، تم برباد ہو گئے۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں حسیناؤں کی کیا کمی ہے؟“

”میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کرو.....“ میں نے جذبات سے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ”کوئی دوسرا اس کی جگہ کیسے لے سکتا ہے!“

”میرا خیال ہے تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں نرس کو بلاتی ہوں۔ وہ تمہیں سکون بخش دوا دے گی.....“ یہ کہہ کر اس نے گھٹنی بجائی اور نرس کو طلب کیا۔ اس ستم ظریف نے میرے بازو میں انجکشن لگا دیا۔ کچھ دیر بعد مجھے گرد و پیش کی کوئی خبر نہ رہی۔

☆.....☆.....☆

راحیلہ کی تدفین دلی میں ہوئی۔ اسے بی بی کلثوم کی خواہش پر خوبہ نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب پرانے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ میں اس کی لاش کے ساتھ دلی گیا تھا۔ آسمان اس کی لحد پہ شبنم افشانی کرے۔ بہت اچھی لڑکی تھی۔ میں آج تک اسے نہیں بھول پایا۔ اسے کھوکھلی میں بہت تنہا اور اداس ہو گیا تھا۔ دنیا بے رونق اور پھیلی لگتی تھی۔ کوئی بات اچھی نہ لگتی تھی۔

چمپون سے بھی میں نے کہہ دیا تھا کہ مجھے تنہا چھوڑ دے۔ میں اپنا غم غلط کرنے کے لیے آوارہ گردی کرتا رہتا یا شراب خانوں کا رخ کرتا اور آب انگور کے سہارے راحیلہ کا غم بھلانے کی کوشش کرتا تھا۔ اب میں کسی حد تک سنبھل گیا تھا۔ ایک روز میں ایک شراب خانے میں بیٹھا تھا کہ چمپون وارد ہوئی۔ وہ چہرے سے پریشان لگ رہی تھی۔

”کیا بات ہے، تم متفکر دکھائی دیتی ہو؟“ میں نے رسماً سوال کیا۔

”تمہیں ساغر و مینا سے فرصت ملے تو میرے بارے میں سوچو۔“

”کیا بات ہے، پہیلیاں کیوں بچھواری ہو؟“

”میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم اتنی رکھائی اور بے زاری سے بات کر رہے ہو۔“ وہ شکوہ بھرے لہجے میں بولی۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے اچھبے سے کہا۔

”محبوب..... جارس کا ایک مہا پنڈت تلسی داس مجھے تسخیر کرنے کے لیے دریائے جمنہ کے کنارے

ایک چلہ کاٹنے میں مصروف ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو میں ہمیشہ کے لیے اس کی قید میں رہی جاؤں گی اور مجھے اس کی داسی بن کر رہنا پڑے گا۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”تم مذاق کر رہی ہو؟“ میرا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

”تمہارے سر کی قسم۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔“ پھر وہ چاہت سے بولی۔ ”کچھ کرو محبوب ورنہ وہ مورکھ مجھے قابو کر لے گا۔“

میرے لیے یہ خبر دھماکے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اب میرے پاس چمپون کے سوا تھا ہی کیا۔ اس کی عنایتوں سے قطع نظر مسٹر جیکب کی بدروح کو بھسم کرنے کے بعد میں محض اس کی وجہ سے عشتار دیوی کے عتاب سے بچا ہوا تھا۔ اگر وہ تلسی داس کے قبضے میں چلی جاتی تو نا صرف میری تمام تر عیش و عشرت خواب و خیال ہو جاتی بلکہ عین ممکن تھا کہ میں بھی عشتار دیوی کے انتقام کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ میں نے یہ تصور کیا تو مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔

”مجھے کیا کرنا چاہیے چمپون؟“ میں نے سوال کیا۔ ”میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”تم فوراً بمبئی پہنچو۔ وہاں اندھیری کے علاقے میں پنڈت تلسی داس کی بھانجی رکھا رہتی ہے۔ وہ ایک اسپتال میں نرس ہے۔ پنڈت تلسی داس اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ تم اسے گھیر گھار کر موت کے گھاٹ اتار دو۔ اس سے دو مقاصد حاصل ہوں گے۔ ایک تو مجھے تازہ خون مل جائے گا کیونکہ پورن ماشی کی رات بھی آ پہنچی ہے..... اور دوسرے جب پنڈت تلسی داس کو بھانجی کی موت کی اطلاع ملے گی تو وہ جاپ ادھورا چھوڑ کر یقیناً بمبئی کا رخ کرے گا۔“

”پھر.....؟“

”بعد کی بعد میں سوچیں گے۔ فی الحال یہی بہت ہے کہ وہ اپنا جاپ ادھورا چھوڑ دے۔ پھر نیا لائحہ عمل سوچ لیں گے۔“

”ٹھیک ہے میں بمبئی جاتا ہوں۔ تم میرے ٹکٹ اور رہائش وغیرہ کا بندوبست کرو۔“

”تم بہت اچھے ہو ہو بی۔“ وہ چپکنے لگی۔

میں خاموش رہا۔ بس جام میں پچی کچھی شراب کی چسکیاں لیتا رہا۔

☆.....☆.....☆

بمبئی پہنچ کر رکھا سے راہ و رسم بڑھانے میں مجھے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ وہ ایک آزاد خیال لڑکی تھی۔ ڈانس پارٹیوں اور فیشن تقریبات کی رسیا۔ شراب سے بھی شوق رکھتی تھی۔ میں نے اسے جلد ہی شیشے میں اتار لیا۔ میں نے اس سے اپنا تعارف ایک پارسی نوجوان ڈنشا کے طور پر کروایا تھا جو پناہی سے آیا تھا اور موتیوں کا کاروبار کرتا تھا۔ میں نے اسے وہی سبز باغ دکھائے جو سیانے لڑکے خدا کی اس ناقص العقل



خلو کو دکھایا کرتے ہیں۔ یہی یہ کہ میں اس سے شادی کروں گا۔ اس کا ایک خوبصورت بلفہ ہوگا۔ بی بی گاڑی ہوگی اور کئی نوکر چاکر جو اس کے ایک اشارہ ابرو کے منتظر ہوں گے۔ وہ میری لچھے دار باتوں میں آگئی اور اپنا آپ بہت آسانی سے میرے حوالے کر دیا۔

پورن ماشی کی شب میں نے اسے جوہو کے ساحل پر ایک کلب میں ڈنر پر مدعو کیا۔ وہ خوب تیار ہو کر آئی۔ اس نے سلور گرے کلر کا سیلوئس بلاؤز اور سیاہ چمکیلا لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا جس پر موتی ٹنگے ہوئے تھے۔ کانوں میں ٹائیگر آئی کے خوبصورت آویزے تھے اور گلے میں میچنگ لاکٹ۔

”تم بہت حسین اور پرکشش نظر آ رہی ہو.....“ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”بالکل کسی شہزادی جیسی۔“

”تم بھی راجکار لگ رہے ہو۔ نیلے رنگ کا ڈنر سوٹ تم پر خوب جگ رہا ہے۔“

”تمہارا حسن نظر ہے ورنہ بندہ کس قابل ہے.....“ میں مسکرا دیا۔

”تمہاری طبیعت بہت شاعرانہ ہے۔ کیا تم شعر کہتے ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”نہیں..... مگر اچھے شعر مجھے پسند ضرور آتے ہیں۔“

”تو چلو میں تمہیں ایک خوبصورت شعر سناتی ہوں۔ یہ میرے ماموں کا ہے۔ وہ ایک مہمان

پنڈت ہیں!“

وہ یقیناً پنڈت تلسی داس کا ذکر کر رہی تھی۔ لیکن میں بالکل انجان بن گیا اور دلچسپی لیتے ہوئے کہا:

”کیا نام ہے ان کا؟“

”پنڈت تلسی داس..... بنارس میں رہتے ہیں اور بہت مہمان کوئی (شاعر) ہیں۔“

”چلو پھر ان کی کوئی کویتا سناؤ۔“

اس نے ترنم سے پنڈت جی کی ایک نظم سنائی۔ عامیانہ سی تھی، لیکن اس کا دل رکھنے کے لئے میں

نے خوب داد دی۔

”تمہارے ماموں تو واقعی بہت اچھے کوئی ہیں..... ویسے شاعروں کی بیویاں عموماً ان سے تنگ ہوتی

ہیں۔“ میں مسکرایا۔

”ماموں فی الحال کنوارے ہیں۔ اس لیے دھرم پتی کی روک ٹوک سے آزاد ہیں!“ وہ کھلکھلا

کر رہی۔

ویٹر اپنی ٹائزر کے طور پر جوس لے آیا۔ ہم دونوں جوس پیتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

رکما کے والد فوج میں کرنل تھے۔ ان کا نام رندھیر تھا۔ رکما کی ماں رتنا کونھوں نے اس وقت طلاق دے

ڈالی تھی جب وہ صرف دس برس کی تھی۔ ماں نے ہی اسے جان جو کھوں سے پالا تھا۔ وہ لڑکیوں کے ایک

ہائی سکول میں ہیڈ مسٹر لیس تھیں اور حال ہی میں ریٹائر ہوئی تھیں۔ اب رکما کی شادی کی فکر تھی مگر وہ شادی کے نام سے ڈرتی تھی۔ ماں کی زندگی اس کے سامنے تھی۔ اس کا ڈر کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

”دیکھو ڈنشا۔ تم مجھ سے بے وفائی نہ کرنا ورنہ میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر

چاہت سے کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ تمہاری شخصیت نے مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا ہے ورنہ

میں تمام عمر شادی نہ کرنے کا تہیہ کئے بیٹھی تھی۔ مجھے اپنے باپ سمیت تمام مردوں سے نفرت ہے۔ میں

نے ہمیشہ مردوں کو بے وقوف بنایا ہے۔ ان سے فلرٹ کیا ہے اور اپنا الو سیدھا کیا ہے۔ مجھے مرد کو ترپانے

میں مزا آتا ہے۔ مگر جب سے تم ملے ہو میں یوں محسوس کرنے لگی ہوں جیسے اب تک میں کسی دشت

میں بھٹک رہی تھی۔ کوئی سراب تھا جس کا میں پیچھا کر رہی تھی۔ وہ کوئی زندگی نہ تھی۔ زندگی تو یہ ہے جس

میں مجھے تم جیسے مخلص آدمی کی محبت حاصل ہے۔ تمہیں پا کر یوں لگ رہا ہے جیسے مسافر کو منزل مل گئی۔ میں

اب جلد از جلد تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہارے تصور سے زیادہ

وفادار اور پتی بھگت عورت ثابت ہوں گی.....“

”مجھے یقین ہے پورا یقین ہے۔“ میں نے اسے بریک لگائے ورنہ وہ تو تیز گام کی طرح رکنے کا نام

ہی نہ لے رہی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے اسے شیریں پلائی اور خود سوڈا ملا کر بیئر کا ایک جام پیا۔ اس کے بعد

میں نے اسے لب ساحل چلنے کو کہا۔ وہ کسی اور ہی موڈ میں تھی۔ بار بار مجھ سے پلپتی اور کمرے میں جانے کی

ضد کرتی، مگر میں جلد از جلد اس سے جان چھڑانے کے چکر میں تھا۔ کیونکہ ایک بجے میری فلائٹ تھی۔

میں نے وہاں سے عراق کے شہر بابل جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ میں اسے بہلا پھسلا کر ساحل پر لے گیا

اور اسی طریقے سے موت کے گھاٹ اتار ڈالا جو میرا خاصا تھا۔ چمپون نے اس کے خون سے اپنی پیاس

بجھانے اور اپنی حیات اور شباب کی تجدید کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

☆.....☆.....☆

میں بغداد کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مقیم تھا جب چمپون نے مجھے اطلاع دی کہ پنڈت تلسی داس

اپنا جاپ ادھورا چھوڑ کر بمبئی پہنچ گیا ہے۔ وہ بہت خوش تھی اور چمکتے ہوئے مجھے بتا رہی تھی کہ کیسے رکما کی

موت کی خبر سن کر ادھیڑ عمر پنڈت تلسی داس نے اپنا دل پکڑ لیا تھا۔

”مورکھ۔ مرنے والا ہو گیا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اسے دل کا دورہ پڑ جاتا.....“ اس نے چوکڑی مار

کر میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ گلابی کرتے پا جاے میں وہ بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔

”اسے کس نے اطلاع دی تھی کہ اس کی چہیتی بھانجی پر لوک سدھا رگئی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”رکما کی ماں نے بنارس فون کیا تھا۔ پھر تلسی داس کا ایک چیلہ اسے اطلاع دینے گیا۔ وہ جاپ



واپ بھول کر پچھاڑیں کھانے لگا۔ ویسے تو کبھی ماموں اپنے بھانجے بھانجیوں سے محبت کرتے ہیں مگر اس کی محبت نرمالی ہے۔ دراصل کنوارا ہے نا۔ اپنی شادی ہوئی ہوتی تو محبت کا یہ دھارا اس کی اپنی اولاد کی طرف بہنے لگتا.....“

”ویسے اس نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟“ میں نے پوچھا۔

”ودا آشرم کا انچارج ہے شادی کیوں کرے.....!“ اس نے لوفروں کی طرح آنکھ مار کر کہا۔  
”ایک سے ایک کم عمر اور خوبصورت ودا (بیوہ) آشرم میں پڑی ہے۔ ہندو دھرم میں بیوہ کی دوسری شادی کا سرے سے کوئی تصور نہیں۔ سماج میں ان کی حیثیت اچھوتوں جیسی ہے۔ سہاگنیں ان کے سائے سے بچتی ہیں۔ وہ سفید ساڑھی پہنے الگ تھلگ رہتی ہیں۔ اس سفید ساڑھی کو کفن کے مماثل ہی سمجھو۔ لوگ انہیں مردوں کی طرح بھول ہی تو جاتے ہیں۔ چنانچہ تنگ آ کر وہ دھرم میں پناہ ڈھونڈتی ہیں اور کسی نہ کسی آشرم کا رخ کرتی ہیں جہاں وہ دھرم سیوا کی آڑ میں اپنے بدن کی آگ سرد کرنے کا سامان کر لیتی ہیں!“

”یہ خد مت کون سا انجام دیتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”تکسی داس جیسے بٹے کٹے پنڈت جو پرشاد کھا کھا کر ساڈ کی طرح پلتے رہتے ہیں!“

”کاش میں پنڈت ہوتا.....!“ میں نے مصنوعی آہ بھر کر کہا۔

”مسخری نہ کرو.....“ اس نے مجھے دو ہنر مارے اور ہنسنے لگی۔

”ویسے مجھے تمہاری خوشی کی سمجھ نہیں آ رہی۔“ میں نے کہا۔ ”پنڈت نے وقتی طور پر جاپ چھوڑا ہے۔ رکما کے کریا کرم کے بعد وہ واپس بنارس جائے گا اور دوبارہ جاپ شروع کر دے گا۔ پھر کیا کروگی.....؟“

”اب اسے کم از کم ایک چاند کا وقفہ کرنا پڑے گا۔ کسی مردے کے کریا کرم میں شرکت کے بعد پنڈت لوگ چالیس روز تک کوئی جاپ نہیں کرتے۔ اس دوران اس پنڈت کا کوئی نہ کوئی پکا بندوبست کر دیا جائے گا!“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”اچھانی الحال عشتار دیوی کے چرنوں میں بلیدان کرنے کے لیے کسی ”دنبے“ کا بندوبست کرو.....“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں جلد از جلد یہ فریضہ نبھانا چاہتا ہوں تاکہ انتظار کی سولی پر لٹے ہوئے مسٹر براؤن کو اس کی بیوی واپس مل جائے اور عشتار دیوی کے غصے کی آگ بھی سرد ہو۔“

”اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔“ وہ مسکرائی۔ ”تم ایک دو روز بغداد کی سیر کرو اس کے بعد پانچ کے کھنڈرات کی سیر کو نکلو۔ اس دوران میں کوئی نہ کوئی ”دنبہ“ تلاش کر ہی لوں گی۔“

☆.....☆.....☆

مجھے بغداد میں وارد ہوئے چوتیس گھنٹے بیت چکے تھے۔ میں عراق کی پہلی دفعہ آیا تھا۔ میرا خیال تھا

یہ آسودہ حال ملک ہوگا اور اس کا دارالحکومت بھی شاندار ہوگا مگر میرے سب خواب کالج کی طرح ٹوٹ کر ٹکھڑے ہو گئے۔ یہاں کی فضا میں ایک عجیب ناگواری بو پھیلی ہوئی تھی۔ تنگ اور نیم تاریک گلیوں میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم بے ہنگم شور و غل ہر طرف بکھری ہوئی گندگی اور اڑتی ہوئی ریت نے میرے ذہن پر کوئی مثبت اثر پیدا نہیں کیا تھا۔ میلے کھیلے لباس میں سڑکوں پر گھومتا ہوا ہر فرد غربت اور افلاس کی منہ بولتی تصویر نظر آ رہا تھا۔ میں جدھر بھی گیا پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بچے سیاحوں کے گرد منڈلاتے نظر آئے۔ کوئی ان کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر سکھ رکھ دیتا اور کوئی ڈانٹ کر بھگا دیتا۔ ان سے پیچھا چھڑانا بڑا مشکل تھا۔ ایک موٹر پر گھومتے ہوئے میں نے ایک بچے کی ہتھیلی پر چھوٹا سا نوٹ رکھ دیا۔ میری یہ دریا دلی میرے لیے وبال جان بن گئی کیونکہ اب بھیک مانگنے والے بچوں کی ایک پوری فوج نے میرا گھیراؤ کر لیا تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔ ایک کانشیبل یہ صورت حال دیکھ کر فوراً پلکا اور ان بچوں کو تتر بتر کر دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے نوادرات کے ایک بازار کا رخ کیا۔ میں نے ہوٹل کے منیجر سے سنا تھا کہ وہاں مناسب دام پر اعلیٰ درجے کے نوادرات از قسم مجسمے برتن زیورات، خنجر وغیرہ ملتے ہیں۔ خریداری سے زیادہ مجھے ان نوادرات کو دیکھنے کا شوق تھا۔

اس تنگ و تاریک بازار میں خاصی بھیڑ تھی۔ راستہ بنانے کے لیے لوگوں کو ادھر ادھر دھکیلنا پڑ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جن کے سامنے سائبان تھے ہوئے تھے۔ یہاں ہر ملک اور ہر قومیت کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ گرمی کی شدت سے جسموں پر بہتے ہوئے پسینے اور اڑتی ہوئی ریت سے ہر شخص کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ میرے جسم پر بھی پسینے کی دھاریں کینچڑوں کی طرح رنگ رہی تھیں۔ میں آگے بڑھتے ہوئے ایک جگہ رکا تو کچھ فاصلے پر مجھے ایک حسین انگریز لڑکی نظر آئی جو نیلی جینز اور گلابی بلاؤز میں ملبوس تھی۔ متناسب جسم، نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی وہ لڑکی پہلی ہی نظر میں مجھے بھاگئی۔ وہ نوادرات دیکھنے میں محو تھی اور میں قدرت کی صنائی کے اس حسین شاہکار کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دکان سے نکل کر چوک کی طرف بڑھی تو میں بھی مناسب فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ ایک جگہ وہ رکی تو ایک ہٹا کتا بد ہیئت بھکاری اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اس نے لڑکی کے شولڈر بیک پر ہاتھ ڈالا تھا۔ لڑکی بری طرح سراپیمہ ہو گئی۔ میں آگے بڑھا اور بھکاری کا ہاتھ جھٹک کر لڑکی کو اس کے زرخے سے نکالا۔ وہ سراپا تشکر بن گئی۔

”تھینکس! تھینکس ان ڈیڈ!“

”ڈونٹ مینشن اٹ!“ میں نے مہذب لہجے میں کہا۔

”ایک تو گرمی اتنی ہے اوپر سے یہ بھکاری..... اس ٹیری بل!“

”گرمی کا علاج کیوں نہ کوک سے کیا جائے؟“ میں نے اسے قریبی کوئلہ کارز میں چلنے کی دعوت دی



تو تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے میری دعوت قبول کر لی۔

”میرا نام یوسف ہے۔ یوسف خان۔ میں ہندوستان سے سیاحت کی غرض سے آیا ہوں۔“ میں نے کوک کا بخشن اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

”میرا نام ریٹا ہے۔ ریٹا جونز۔ میں امریکی ہوں اور مصریات کی اسکالر ہوں۔ آج کل قاہرہ میں ریسرچ کر رہی ہوں اور چند روز کے لیے ایک کام کے سلسلے میں بغداد آئی ہوں۔“

”آپ مصریات کی اسکالر ہیں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”آپ جیسی حسین اور نرم و نازک لڑکی کو اس علم میں کیا دلچسپی نظر آئی؟“

اپنے حسن کی تعریف سن کر وہ شرما گئی۔ ”بس! دراصل میرے والد مصریات کے پروفیسر تھے۔ میں ہر جگہ ان کے ساتھ جاتی تھی۔ خوف کے ہرم کی دریافت کا سہرا انہی کی ٹیم کے سر تھا۔ بس انہی کی دیکھا دیکھی میں بھی اس فیلڈ میں آ گئی۔“ اس نے کوک پیتے ہوئے کہا پھر پوچھنے لگی۔ ”کیا آپ کو بھی نوادرات سے دلچسپی ہے؟“

”جی ہاں، مگر جیتے جاگتے“ نوادرات سے!“ میری معنی خیز بات کا مطلب سمجھ کر اس کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ حیا عورت کے اندر قدرت کا پیدا کردہ ایک قدرتی عنصر ہے۔ عورت امریکہ کی ہو یا یورپ کی، افریقہ کی ہو یا ہندوستان کی حیا کا وصف سب عورتوں میں موجود ہوتا ہے۔ البتہ ماحول کے اثر سے وہ آزاد خیال معاشروں میں کمزور پڑ جاتا ہے، مرتا ہر گز نہیں۔

”آپ مذاق خوب کرتے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں پوچھ رہی تھی کہ آپ کو بھی قدیم اشیاء سے کوئی دلچسپی ہے۔ کیونکہ آپ اس بازار میں گھوم رہے تھے۔“

”بس دیکھنے کی حد تک۔“

”چلئے یہ تو اچھا ہے۔ دونوں مل کر دیکھتے ہیں، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ دراصل میں بھکاریوں کی وجہ سے اکیلی بازار میں گھومنا نہیں چاہتی۔“

”زہے نصیب!“ میں نے خوش ہو کر کہا ”آپ کی قربت میں گزرا ہوا ہر لمحہ میرے لیے قیمتی ہوگا۔“

”آپ باتیں کرنے کے فن میں تاک ہیں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

ہم کو لڈکارنر سے باہر نکلے اور دوبارہ بازار میں مٹر گشت شروع کر دی۔ ایک جگہ بغلی گلی میں ہمیں نوادرات کی خاصی بڑی دکان نظر آئی جس پر جلی حروف ہیں ”نوادرات ہاشم“ لکھا ہوا تھا۔ ہم اس دکان میں داخل ہو گئے۔ وہاں میں کوئی موجود نہ تھا۔ دیواریں سفید تھیں اور فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ انگریزی کے حرف ایل کی شکل کا شیشے کا ایک کاؤنٹر دائیں سے بائیں پھیلا ہوا تھا۔ میں اور ریٹا جھک کر شو کیس میں رکھے ہوئے گل دان کو دیکھنے لگے جس پر سرمئی بیک گراؤنڈ پر چاکلیٹی نقش و نگار بنے ہوئے

گلابی رنگ کے پھولدار پردے میں حرکت پیدا ہوئی اور گندمی رنگ کا فرہی مائل دکاندار برآمد ہوا۔ اس کی عمر پینسٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے پر نرمی کے آثار تھے۔ ریٹا نے اس سے کہا۔

”ہم یہ گلدان دیکھ رہے تھے۔ کیا آپ.....؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ دکاندار نے اس کی ادھوری بات سے ہی اس کا مطلب جان لیا اور گلدان شوکیس سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ گلدان ہاتھ میں لیتے ہوئے ریٹا کی انگلیوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔

”کیا قیمت ہے اس کی؟“ اس نے دریافت کیا ”دوسو ڈالر“

”دوسو ڈالر!“ وہ قیمت سن کر ٹھٹکی۔ ”میں زیادہ سے زیادہ پچاس ڈالر دے سکتی ہوں۔“ دکاندار نے اپنی بتائی ہوئی قیمت میں چالیس ڈالر کم کر دیئے۔ ریٹا نے اپنی پیشکش میں تیس ڈالر کا اضافہ کر دیا۔ دکاندار قیمت میں مزید کمی کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کے لیے یہ ڈیڑھ سو ڈالر کا ہے۔ آپ غالباً امریکی ہیں۔ میں امریکیوں کو پسند کرتا ہوں۔ یقیناً مانے ڈیڑھ سو ڈالر میں ایسی نادر شے آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔“

ریٹا نے گلدان ایک بار پھر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ دکاندار سے نظریں بچا کر وہ پسینے میں بھیگے ہوئے انگوٹھے سے اسے رگڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کے انگوٹھے پر رنگ لگ گیا تھا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ گلدان نفلی ہے۔ ہم دونوں کی نگاہیں چارہوئیں۔ پھر ریٹا نے دکاندار سے کہا:

”شکریہ! اب میں نے یہ گلدان خریدنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔“

”میرے پاس کچھ اور چیزیں بھی ہیں جنہیں آپ لوگ پسند کریں گے.....“ دکاندار نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے دیوار میں نصب لکڑی کی الماری کھولتے ہوئے کہا۔ چند سیکنڈ کے بعد اس نے ایک اور چھوٹا گلدان ہمارے سامنے لا رکھا۔ ریٹا نے اسے بھی رگڑ کر دیکھا لیکن اس مرتبہ رنگ نہیں اتر۔

”اس کی کیا قیمت ہے؟“ اس نے اپنی اندرونی کیفیت چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”ان میں سے ہر ایک کی قیمت مختلف ہے۔ بہتر ہوگا پہلے آپ ساری چیزیں دیکھ کر اطمینان کر لیں۔“ وہ ہماری طرف دوستانہ انداز میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ ”پھر جو چیز آپ کو پسند آئے گی اس کی قیمت طے کر لیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ الماری سے مختلف چیزیں نکال کر کاؤنٹر پر رکھنے لگا۔ ریٹا محتاط انداز میں باری باری ان کا جائزہ لینے لگی۔ بالآخر اس نے سات میں سے دو برتن الگ کرتے ہوئے اپنی پسندیدگی کا



اظہار کیا۔

”آپ نے کس بنا پر ان دو کو دوسروں پر ترجیح دی ہے؟“ دکاندار نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”کیونکہ باقی سب نقلی ہیں!“ ریٹانے بلا جھجک جواب دیا۔

”بہت خوب!“ وکاندار نے ہلکا سا تہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

”آپ کو اتنی آسانی سے ان کے نقلی ہونے کا کیسے علم ہو گیا؟“

”یہ ماہر آثار قدیمہ ہیں۔ مصریات کی اسے کالر۔“ میں نے ریٹا کی طرف سے جواب دیا تو دکاندار متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ریٹا کا دل جیتنے کے لیے میں نے دکاندار سے قیمت پوچھی تو اس نے دونوں برتنوں کی قیمت ایک ہزار ڈالر بتائی۔

”آپ انہیں پیک کر دیں۔“ میں نے جلدی سے کہا اور اپنا بیٹا نکال کر مطلوبہ رقم کا نوٹ پر رکھ دی۔

”ہولڈ آن..... ہم اسے پانچ سو ڈالر سے زیادہ نہیں دیں گے.....“ اس نے سرتاپا احساس تشکر اور مسرت آمیز حیرت میں مبتلا ہو کر میری طرف دیکھا اور تھوڑی رو و قدس کے بعد وہ بولنے لگا ”جائے گا“ میں وہ برتن ہمارے ہاتھ فروخت کر دیئے۔

”میڈم کو نوادرات کی پہچان ہے۔“ دکاندار خوشامدی انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ویسے اگر آپ عراق آئیں اور بابل نہ جائیں تو اس سے بڑی محرومی کوئی نہیں۔ وہاں نوادرات کی بڑی مارکیٹ ہے۔“

”میرا بابل جانے کا ارادہ ہے۔“ ریٹھانے جواب دیا۔

”یہ تو بہت خوش کن بات ہے۔“ دکاندار نے ہنسی نکالی۔ ”وہاں ’ہبلان مارکیٹ‘ میں میرے بیٹے علی ہاشمی کی دکان ہے۔ اگر تفریح کے دوران نوادرات خریدنے کا خیال آئے تو اس کی دکان پر ضرور جائیے گا۔“

”تا کہ وہ بھی ہمارے ہاتھ نقلی چیزیں فروخت کر سکے؟“ ریٹا مسکرائی۔

”نہیں وہاں آپ کے ساتھ کوئی فریب نہ ہوگا۔ آپ چاہیں تو اپنی پسند کی چیزیں خرید سکتے ہیں۔ ایک منٹ! میں آپ کو ایک چیز دکھاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر دکاندار نے الماری سے ایک چھوٹی سی خوبصورت لوح نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

”اوہ! یہ تو فرعون مصر سیتی اول کے دور کی لوح لگ رہی ہے۔“ ریٹا چپکی۔ میں بھی اس شاندار لوح کو دیکھ کر حیران رہ گیا جس کے چاروں طرف خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

اس کی لیا قیمت ہے؟ ریٹا نے اسے لٹے پٹتے ہوئے کہا۔

”کوئی قیمت نہیں۔ اسے آپ میری طرف سے تحفہ سمجھ کر قبول کر لیں۔“ وہ مسکرایا۔

”نہیں! میں اس طرح کوئی تحفہ قبول نہیں کر سکتی۔“

”مہمانوں کو تحائف پیش کرنا ہم عربوں کی صدیوں پرانی روایت ہے۔ لیکن میں یہ بتا دینا ضروری

سمجھتا ہوں کہ یہ لوح اصلی نہیں۔ اسے میرے بیٹے علی نے بنایا ہے۔“

”غیر معمولی مہارت کا ثبوت ہے!“ ریٹا نے میری طرف دیکھتے ہوئے دکاندار سے کہا ”لیکن یہ کس چیز سے بنائی گئی ہے؟“

”یہ پرانی ہڈی کی بنی ہوئی ہے۔ ایسی چیزوں میں اصلیت کا تاثر پیدا کرنے کے لیے ہم چھوٹی چھوٹی ہڈیاں دنبوں کو کھلا دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد انہیں ذبح کر کے ہڈیاں نکال لیتے ہیں اور انہیں جوڑ کر مختلف چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ قاہرہ، دمشق، بغداد اور بابل میں یہ کاروبار عام ہے۔“

اس کے انکشاف پر ریٹا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میرے لیے بھی نئی بات تھی۔ ایسی چیزیں دنیا بھر کے عجائب خانوں میں موجود ہوتی ہیں جنہیں اصلی سمجھا جاتا ہے۔ وہ چند لمحے ریٹا کے چہرے کے تاثرات کا خاموشی سے جائزہ لیتا رہا پھر اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

”میرا نام عبداللہ بن حسین الہاشمی ہے۔ کیا میں آپ کا اور آپ کے دوست..... کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“

”میرا نام ریٹاجونز ہے۔ یہ یوسف خان ہیں۔“

”آپ غالباً ہندوستانی ہیں؟“ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیا آپ دونوں میرے ساتھ پودینے کی چائے پینا پسند کریں گے؟“ اس نے پوچھا اور پھر ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر دکاندار سے باہر نکل کر عربی میں کسی کو آواز دی..... چائے کا آرڈر دینے کے بعد وہ ہم دونوں کو دکان کے اندرونی حصے میں لے گیا۔ اندر ایک اور کمرہ تھا جس کا سائز دکان سے تھوڑا چھوٹا تھا۔ اس میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ فرش پر قالین اور ایک مسند بچھی ہوئی تھی جس پر گاؤتیکے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک چھوٹی سی میز بھی جس کی بلندی ایک فٹ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ایک طرف کچھ چیزیں پڑی تھیں جو مکمل طور پر کپڑوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

”تشریف رکھیں۔“ عبد اللہ نے مسند کی طرف اشارہ کیا اور ہم سے باتیں کرنے لگا۔ ریٹا سے اس نے پوچھا۔

”آپ امریکہ میں کہاں رہتی ہیں؟“

”میں بوسٹن میں رہائش پذیر ہوں۔“



”بوسٹن! حوب یاد آیا۔ وہاں تو میرا ایک دوست کی رہتا ہے۔ سوسٹو کو مایہ ناز ہے۔“

آتے رہتے ہیں۔ شاید آپ اسے جانتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے میز کے دراز سے ایک لفافہ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

”بوسٹن بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں کسی کو.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کی نظریں لفافے کی پشت پر خط بھیجنے والے شخص کے نام پر جمی ہوئی تھیں۔ ”ڈاکٹر ہربرٹ لوئی۔ یہ تو بوسٹن میوزیم کے منتظم ہیں اور کبھی میرے پاس رہ چکے ہیں۔“

”بہت نفیس اور ذہین آدمی ہے۔ گزشتہ سال جب اسے معلوم ہوا کہ میرے پاس بابل کے قدیم حکمران سارگون دوم کی کھوپڑی موجود ہے تو وہ فوراً یہاں بھاگا چلا آیا تھا۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا“ ریٹا نے جواب دیا۔ اسی لمحے بیرونی دروازے پر جھالر کے موتیوں کی موسیقی کی آواز نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا۔ ہوٹل کا ایک کم سن ملازم چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوا۔ وہ چلا گیا تو عبداللہ نے ریٹا سے کہا۔

”آپ چونکہ ماہر مصریات ہیں اس لیے آپ کی دلچسپی کی ایک خاص چیز میں ابھی آپ کو دکھاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کونے میں ایستادہ ایک مجسمے سے کپڑا ہٹا دیا۔ وہ ٹھوس سونے کا دو فٹ اونچا ایک شاہکار مجسمہ تھا۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ ریٹا کی تو خوشی سے چیخ نکل گئی۔

”اومانی گاڈ!“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی جیسے اسے اپنی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

”یہ..... یہ طوطا آ من ہے نا؟“

”ہاں.....“

”مجھے اعتراف ہے ایسا حیرت انگیز مجسمہ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے“ ریٹا خوابناک لہجے میں بولی۔ وہ اس کے ارد گرد چکر لگاتے ہوئے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سونے کے مجسمے پر کندہ مخصوص روایتی لباس میں جا بجا یا قوت اور لا جورڈ جڑے ہوئے تھے۔ گلے میں دیوتاؤں کی علامت کرکس آویزاں تھا۔ گردن کے ہار میں فیروزہ لا جورڈ اور سنگ۔ شعب جڑے ہوئے تھے۔ کرکس کی چونچ اور آنکھیں نجانے کس پتھر کی تھیں۔ وہ شعلے کی طرح چمک رہی تھیں۔ کمر میں طلائی میان تھی جس میں خوبصورت خنجر لٹک رہا تھا۔ اس کے دستے اور میان دونوں پر قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے۔ مجسمے کا مجموعی تاثر مہوت کر دینے والا تھا۔ ریٹا پلک جھپکے بغیر ایک محویت کے عالم میں اسے دیکھ جا رہی تھی۔

”یہ مجسمہ آپ کو کہاں سے ملا؟“ بالآخر اس نے مرتعش لہجے میں سوال کیا۔

”یہ کسی کی امانت ہے۔ صرف چند گھنٹوں کے لیے یہاں ہے۔ اس کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ میں نے سوچا آپ ایسی حسین خاتون اور ماہر مصریات کو اس کے دیدار سے محروم نہ

اسی لمحے بیرونی دروازے پر جھالر کے موتیوں کی آواز سن کر عبداللہ باہر کی طرف لپکا اور ہم سے کہا:

”شاید کوئی گاہک ہے۔ آپ لوگ اطمینان سے چائے پیئیں میں ابھی آتا ہوں۔“

”یہ بہت قیمتی چیز ہے۔“ اس کے جاتے ہی ریٹا نے الجھے ہوئے سانس کے ساتھ مجھ سے کہا۔

”اگرچہ یہ بات غیر اخلاقی ہے مگر عبداللہ کی عدم موجودگی میں اس کی ایک تصویر ضرور لوں گی“ یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ سے کیمرہ نکالا اور جلدی جلدی اس کی دو تصاویر بنالیں اور کیمرہ بیگ میں واپس رکھ دیا۔

بیرونی جانب سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ بات عربی میں ہو رہی تھی اس لیے مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ البتہ تیز انداز گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ دکان میں ہونے والی گفتگو کا ماحول خوشگوار ہرگز نہیں۔ پھر دفعتاً شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی کی چیخ کی آواز بھی ابھری۔ پھریوں محسوس ہوا جیسے چیخنے والے کے منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ کو دبا دیا گیا ہو۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا اور تھوڑا سا پردہ سرکا کر دکان کے بیرونی حصے میں جھانکا۔ میری نظر سب سے پہلے سانولے رنگ کے ایک غنڈہ نما شخص پر پڑی جس کی بائیں آنکھ کے نیچے موٹا سا تل تھا۔ وہ جینز اور لی شرٹ میں ملبوس تھا۔ شکل و صورت سے وہ ہندوستانی لگتا تھا۔ پھر میری نگاہ بائیں طرف پڑی اور میرا سانس رک گیا۔ عبداللہ پشت کے بل شیشے والے کاؤنٹر پر تقریباً گرا ہوا تھا اور سفید لباس والے ایک عرب نے اس کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ایک خنجر عبداللہ کے سینے میں دسے تک پیوست تھا اور وہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ موت کی ہچکیاں!





درپیش صورت حال بہت نازک تھی۔ مجھے لمحہ بھر میں فیصلہ کرنا تھا کہ پرانی آگ میں کود پڑوں یا خاموش رہ کر عافیت کا سامان کروں اور یوں اس معاملے میں ملوث ہونے کے بعد پیش آنے والی قانونی پیچیدگیوں سے دامن بچا لوں۔ ریٹا میری پشت پر آ پہنچی تھی اور اس نے بھی وہ منظر دیکھ لیا تھا۔ اگر میں بروقت اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش رہنے کی تلقین نہ کرتا تو اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ سن کر حملہ آور ہماری موجودگی سے باخبر ہو جاتے اور اپنا جرم چھپانے کے لئے ہمارا گلا کاٹنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ہم اس قتل کے عینی شاہد تھے۔ قاتل کبھی کسی عینی شاہد کو نہیں بخشتے! لمحہ بھر بعد عبد اللہ کے قاتل نے اپنے شکار کو کاؤنٹر کے عقب میں گرایا تو میری چھٹی حس نے مجھے اُن کے اگلے اقدام سے آگاہ کر دیا۔ دونوں مجرم اب اندرونی کمرے کا رخ کرنے والے تھے۔ یہ خیال بجلی کے کسی کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا کہ وہ یقیناً طوطی آسن کا طلائی مجسمہ چوری کرنے آئے تھے۔ عبد اللہ نے چند لمحے پیشتر ہمیں بتایا تھا کہ وہ مجسمہ کسی کی امانت تھا۔ چند گھنٹوں کے بعد اسے وہاں سے کہیں منتقل کیا جانا تھا۔ مجرموں کو یقیناً اس کی اطلاع تھی اور وہ اسے چرانے کی نیت سے دکان میں داخل ہوئے تھے۔ مجرموں سے جان بچانے کے لئے میں نے ریٹا کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا ایک کونے میں لے گیا۔ وہاں ایک قدیم چوبی دروازہ دیوار کے ساتھ کچھ اس طرح ٹکا ہوا تھا کہ اس کے عقب میں چھپنے کی جگہ بن گئی تھی۔ میں بعجلت اسے لے کر دروازے کے پیچھے جا چھا۔ جگہ تنگ تھی۔ وہ قریباً میرے سینے سے لگی گہرے سانس لے رہی تھی۔

”مجھے یہاں کیوں لے آئے؟“ اس نے کسی قدر الجھن سے سوال کیا۔

”آہستہ بولو.....“ میں نے سرگوشی کی۔ ”دکاندار کے قاتل اندر آنے والے ہیں۔ وہ ہمیں بھی مار ڈالیں گے.....“ میری بات سن کر وہ سہم گئی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر اس ننھی بچی کی طرح ہوائیاں اڑنے لگیں جسے کسی نے اچانک چڑیل کا نام لے کر ڈرا دیا ہو۔

میرے خدشے کے عین مطابق دونوں غنڈے کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ چوبی دروازے میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جس سے میں نے انہیں اندر آتے دیکھ لیا تھا۔ ہم دونوں نے دم سادھ لیا۔ ریٹا کا ابھرا ہوا سینہ دھک دھک کر رہا تھا اور میرے جذبات برا بیختے ہو رہے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس

شباب آفریں گداز سہم کی بلا میں لینے لگتا، مگر خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا اور زمین مزاحیہ کی لونی نجاش نہ تھی۔ میں نے اپنے ارمانوں کو پورا کرنے کا ارادہ معرض التوا میں ڈال دیا اور چوکنہ ہو کر مجرموں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا وہ دونوں سیدھے طوطی آسن کے طلائی مجسمے کی طرف بڑھے اور اسے اٹھا کر ایک چرمی بیگ میں ڈالا اور چند لمحوں اندر اندر وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ کسی اور شے کو انہوں نے دیکھنے ہاتھ لگانے یا اٹھانے کی زحمت تک نہ کی تھی..... وہ مجھے کند ذہن اور غبی لگے۔ اگر ان میں عقل کی رتی بھی ہوتی تو میز پر پڑی چائے کی پیالیوں کو دیکھ کر وہ اندازہ لگا سکتے تھے کہ دکاندار کے ساتھ کمرے میں کوئی اور بھی موجود تھا۔ خیر ان کی کم عقلی ہمارے لئے تو باعثِ رحمت ہی ثابت ہوئی تھی۔

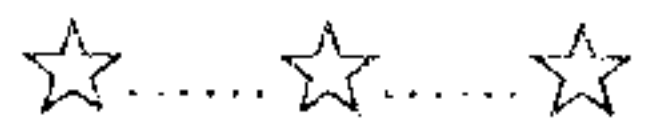
ہم دو تین منٹ وہیں چھپے رہے اس کے بعد باہر نکل آئے۔ ہم دونوں پسینے میں بھیگ چکے تھے۔ دروازے کے پیچھے جس اور گرمی تھی جس نے چند منٹوں میں ہمارا حشر کر دیا تھا۔ دکان میں قدم رکھا تو ہم نے عبد اللہ کو کاؤنٹر کے پیچھے بے حس و حرکت پڑا پایا۔ اس کی روح قفسِ غصری سے پرواز کر چکی تھی۔ مجھے انجانا دکھ ہوا۔ وہ ایک نرم مزاج اور خوش اخلاق انسان تھا جسے دھن دولت کے طلب گار لالچی انسانوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ دکان خالی تھی۔ حیرت انگیز طور پر ارد گرد اور سامنے کے دکانداروں کو واردات کی خبر نہ ہوئی تھی ورنہ وہاں اس وقت لوگوں کا اثر دہام ہوتا۔ میں نے ریٹا سے کہا:

”ہمیں جلد از جلد اس دکان سے نکل جانا چاہیے۔ اگر کسی کو واردات کا علم ہو گیا تو ہم خواخواہ پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے..... اور پولیس کی طرف سے طرح طرح کے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے قاتل بھی شہادت مٹانے کے لئے ہمارے پیچھے پڑ جائیں۔“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو.....“ وہ سراسیمگی سے بولی۔ ”ہم سیاح ہیں اور کسی طرح کی مصیبت مول لینے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں ہیں۔“

”خود کو سنبھالو اور اعتماد سے میرے پیچھے باہر نکلو۔ مگر دیکھو دکان سے باہر نکلتے ہوئے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ ہرگز نہ کرنا ورنہ تمہارا طرزِ عمل لوگوں کو شک و شبہ میں مبتلا کر سکتا ہے۔“ میں نے اسے نصیحت کی۔

”میں سمجھ رہی ہوں۔“ میری بات سن کر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دونوں نہایت اطمینان سے ٹہلتے ہوئے دکان سے باہر نکلے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل روانہ ہو گئے۔ ریٹا کا قیام بھی اسی فائیو اسٹار ہوٹل میں تھا جہاں میں نے کمرہ لے رکھا تھا۔



اگرچہ پہلے ریٹا کا بھی بابل جانے کا ارادہ تھا، مگر وہ قاہرہ چلی گئی اور میں تنہا عازمِ بابل ہوا۔ اس نے عبد اللہ کے قتل کا کچھ زیادہ ہی اثر قبول کر لیا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ (اور یہ خیال کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا) کہ



جلد یا بدیر پولیس عبداللہ کے محل کے سلسلے میں ہماری تلاش شروع کر دے گی۔ وہ اس وقت کی آمد سے پہلے بغداد تو ایک طرف عراق چھوڑ کر چلے جانا چاہتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا: ”مسٹر خان۔ عبداللہ نے ہمارے لئے چائے منگوائی تھی۔ جو لڑکا چائے کے برتن لے کر آیا تھا۔ پولیس اس سے ضرور پوچھ گچھ کرے گی کہ عبداللہ کے مہمان کون تھے اور ان کا حلیہ کیسا تھا؟ پولیس کے لئے ہمیں ڈھونڈنا چنداں مشکل نہ ہوگا..... پھر ہمارے ساتھ خدا جانے کیا ہو.....“

”تمہاری بات کلی طور پر بے وزن نہیں، مگر ہمیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ آخر ہم نے قتل تو نہیں کیا، صرف پولیس کو معاملہ رپورٹ نہ کرنے کی غلطی کی ہے جو ہرگز کوئی جرم نہیں۔ قاتلوں کی انتقامی کارروائی یا پولیس کے خراب برتاؤ کے خوف سے اگر کوئی عینی شاہد قتل کی کسی واردات کے بارے میں پولیس کو شہادت نہیں دیتا تو پولیس اسے محض اس وجہ سے گرفتار نہیں کر سکتی کہ اس نے بتایا کیوں نہیں.....“

”یہ عراق ہے۔ ایک اجڈ اور غیر مہذب ملک۔ یہاں کسی طرح کا رسک نہیں لیا جاسکتا۔ تم شوق سے یہاں رہو کیونکہ تم مرد ہو اور تمہارے لئے تفتیش کی مشکلات برداشت کرنا دشوار نہ ہوگا۔ میں رہی صف نازک! اور سب سے بڑھ کر میرے لئے میری ریپوٹیشن بہت اہم ہے.....“

”میری دلی تمنا تھی کہ چند روز تم جیسی حسین لڑکی کی معیت میں گذر جائیں، مگر چلو جیسی تمہاری مرضی۔“

وہ اپنی تعریف سن کر پھول گئی۔ تعریف تو خدا کو بھی پسند ہے۔ کمزور انسان کیا شے ہے۔

”آئی ایم سوری ڈیر..... لیکن؟“ اس نے میرا ہاتھ دبایا۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تمہیں آج میرے ساتھ ڈنر کرنا ہوگا۔ پھر میں تمہیں ایئر پورٹ چھوڑاؤں گا۔“

میری اداکاری کام کر گئی۔ میرے انداز میں ایسی چاہت اور والہانہ پن تھا کہ اسے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ اس نے صرف اتنی استدعا کی کہ ارلی ڈنر کر لیا جائے۔ میں نے حسبِ خواہش جلدی کھانا لگوا لیا۔ اس کے بعد مے نوشی کا اہتمام کیا اور اس قالہ کو بھی زیر کر لیا۔

☆.....☆.....☆

ریٹا چلی گئی، مگر اس حال میں کہ وہ میری دیوانی ہو چکی تھی..... ضد کرنے لگی کہ میں اس کے ساتھ قاہرہ چلوں مگر میں نے اپنی مصروفیات کا بہانہ کر کے اسے ٹال دیا۔ وہ اس شرط اور وعدے پر قاہرہ روانہ ہوئی کہ جو نہی مجھے فرصت ملی میں اس سے ملنے قاہرہ ضرور آؤں گا۔ اپنا مکمل پتہ اور فون نمبر اس نے ایک کاغذ پر لکھ کر میرے بٹوے میں ڈال دیا تھا۔

اسے ایئر پورٹ پر چھوڑ کر میں واپس آیا اور اگلے روز دس بجے سوئے بابل روانہ ہو گیا۔ بابل

دریائے فرات کے دونوں کناروں پر شکستہ فیصلوں اور محلات کے ٹوٹے پھوٹے ستونوں کی شکل میں بکھرے پڑے ہیں مگر اس سے چند کلومیٹر دور ایک جدید قصبہ الکساء آباد ہے جو اس علاقے میں آنے والے سیاحوں کے دم سے سال بھر پر رونق اور معاشی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہتا ہے۔ وہاں کی ہوٹل انڈسٹری کی پانچوں گلی میں ہیں۔ کسی ہوٹل میں سیاحوں کے لئے رہائشی کمرہ تلاش کرنا ایک معرکہ ہوتا ہے، مجھے بڑی مشکل سے ہوٹل الخلیل میں کمرہ ملا۔

رات جب میں بستر پر لیٹا اپنی ہنگامہ پرور زندگی کے روز و شب پر غور کر رہا تھا، چمپون آوارہ ہوئی۔ وہ عربی عورتوں کی طرح سیاہ میکی میں ملبوس تھی۔ وہ آ کر بستر پر بیٹھ گئی۔

”واہ! اس عربی حسن و جمال کے مظہر ہو شرابا بہر وپ کے کیا کہنے!“ میں نے بے اختیار شاعرانہ انداز میں تعریف کی۔

”شکریا جیبی!“ وہ شوخی سے مسکرائی تو میں ہنسنے لگا۔

”تم تو عربی بھی بول رہی ہو..... یعنی پوری پوری نقالی!“

”میری دیکھا دیکھی اب تم ”شینوں“ والی حرکتوں پر نہ اتر آنا۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”جی تو واقعی چاہ رہا ہے.....“ میں نے مذاقاً اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”خبردار.....“ وہ ہنستے ہوئے اچھل کر صوفے پر جا بیٹھی۔ ”اس وقت میں صرف کام کی بات کرنے آئی ہوں۔“

”تو پھر کرو.....“ میں نے سنجیدگی اختیار کی۔ وہ کہنے لگی۔

”میں نے عشقاردیوی کی قربانی کے لئے بندہ ڈھونڈ لیا ہے اور اسے گھیر کر یہاں لے آئی ہوں۔“

اب تمہارا کام یہ ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے قدیم بابل چلے جاؤ۔ وہ کل صبح کھنڈرات کی سیر کرنے جا رہا ہے۔ ویسے یہ کوراسٹوری ہے وہ دراصل طوط آ من کے چوری شدہ مجسمے کو بیچنے کے لئے ایک بروکر سے ملنے والا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“ طوط آ من کے چوری شدہ مجسمے کا ذکر سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔

”ایک ہندوستانی غنڈہ! عبداللہ دکاندار کو جس عربی آدمی نے قتل کیا تھا اس کے ساتھ ایک

ہندوستانی بھی تھا یاد ہے؟“

”ہاں یاد ہے۔“

”وہی آدمی میں نے اس مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ بہت حرامی آدمی ہے۔ اگر تمہیں پتہ چل جائے کہ وہ کون ہے تو تم ابھی اور اسی وقت اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہو گے۔“



”وشوانا تھ۔ جوان لڑکیوں کو اغوا کر کے عصمت فروشی کے اڈوں پر فروخت کرنے والے ایک بین الاقوامی گروہ کا سرگرم رکن اور نامی گرامی اسمگلر ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے تمہاری بہن نوشی کو اغوا کیا اور بعد ازاں بمبئی کے بازار حسن میں بیچ ڈالا تھا۔“

”نہیں!!“ میں چیخ اٹھا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ اس نے زور دے کر کہا۔

”اگر یہ بات ہے تو مجھے ابھی اور اسی وقت اس کا ٹھکانا بتاؤ۔ میں اس کی بوٹیاں کر کے کتوں کے آگے ڈال دوں گا!“ میں نے غصے سے مٹھیاں بھیج کر کہا۔

”صبر سے کام لو۔ زیادہ غصہ کبھی ٹھیک نہیں ہوتا۔“ وہ مجھے ٹھنڈا کرنے لگی۔

”کک۔۔۔ کمال کرتی ہوں تم بھی۔۔۔“ میں نے غصے سے لرزتی آواز میں کہا۔ ”مم۔۔۔ مجھے نوشی کے مجرم کا بتا کر تم یہ امید رکھتی ہو کہ میں آرام سے اپنے بستر میں لیٹا رہوں؟“

”ٹھیک ہے ابھی جاؤ اور اسے موت کے گھاٹ اتار کر خود پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ۔“

میں عالم ضبط میں چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”دیکھو جس مقصد کے لئے ہم یہاں آئے ہیں اسے پیش نظر رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ بیچ میں ایک رات ہی تو ہے۔ کل اس وقت تک تم اسے ذبح کر کے اپنے انتقام کی آگ سرد کر چکے ہو گے اور وہ مقصد بھی پورا ہو جائے گا جس کے لئے ہم یہاں آئے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ ”تم جو کہو گی میں وہی کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

”میں تمہارے جذبات سمجھتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر میرے قریب آ بیٹھی۔ ”مگر مصلحت بھی کسی چیز کا نام ہے!“

”تم نہیں جانتی مجھے اپنی بہن سے کتنی محبت تھی۔“ میں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور تسلی بخشی دینے لگی۔ اس کی آغوش میں کوئی عجیب سی تاثیر تھی جس کی بدولت میرا غم و غصہ زائل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ مجھے سونے کی تلقین کر کے غائب ہو گئی۔

صبح میں جلدی بیدار ہو گیا۔ نہادھو کر ناشتہ کیا اور یونہی ادھر ادھر گھومنے لگا۔ مجھے وشوانا تھ کی تلاش تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ یونہی سر راہ کہیں ٹکرا جائے گا، مگر صبح سے دوپہر ہو گئی وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میری پریشانی اور جھنجھلاہٹ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ چپون نہ جانے کہاں غائب تھی۔ میں نے اسے بار بار

اسے ٹپ دیتے ہوئے میری نظر باہر سڑک پر پڑی۔ وہ سفید سفاری سوٹ میں ملبوس چشمہ لگائے ایک سیاہ مرسیڈز کی عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں بدحواسی میں اٹھا اور باہر کو لپکا، مگر جونہی میں سڑک پر پہنچا، مرسیڈز وہاں سے روانہ ہو گئی۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی دیکھی۔ میں نے اس کی طرف دوڑ لگا دی اور جلدی سے اس کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

”اس مرسیڈز کے تعاقب میں چلو۔“ میں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔

”بہتر سر۔“ اس نے سر کو مؤدبانہ جنبش دی اور ٹیکسی مرسیڈز کے پیچھے لگا دی۔

وشوانا تھ کی مرسیڈز کا رخ بابل کے کھنڈرات کی طرف تھا۔ اس کی موت اسے کھنڈرات کی سمت کھینچ کر لے جا رہی تھی اور وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور گھاگ آدمی لگتا تھا۔ تعاقب کرنے کے باوجود اس نے مرسیڈز کے ڈرائیور کو بالکل شک نہیں ہونے دیا کہ اس کی گاڑی کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ اس سمت کئی کاریں، بسیں اور ٹیکسیاں جاری تھیں۔ وہ درمیان میں ایک گاڑی کا وقفہ دے کر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہم بابل کے کھنڈرات کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں ایک میدان میں گاڑیاں پارک کرنے کی سہولت موجود تھی جہاں باوردی عملہ ٹوکن دے کر گاڑیاں پارک کروا رہا تھا۔ مرسیڈز اس پارکنگ ایریا میں داخل ہو گئی۔ میں نے ٹیکسی والے کو سڑک پر روک کر فارغ کر دیا اور پھر ایک درخت کے سائے میں رک کر انتظار کرنے لگا۔

پانچ منٹ بعد وشوانا تھ مجھے اپنی جانب آتا نظر آیا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا اور میرا ہاتھ بے اختیار پتلون کی جیب میں پوشیدہ تیز دھارا سترے کوٹھولنے لگا جسے میں نے بطور خاص اس کا گلہ کاٹنے کے لئے ایک اسٹور سے خریدا تھا۔ وہ میرے قریب سے گذر گیا اور میں نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا۔ بڑا صبر آزمایہ تھا وہ بھی۔ خیر دس قدم کا فاصلہ رکھ کر میں اس کے پیچھے چلنے لگا۔ تیز دھوپ تھی اور دوپہر کا وقت اس لئے سیاہوں کا زیادہ رش نہیں تھا۔ میرے لئے یہ امر باعث اطمینان تھا۔ میں اسے کسی ویران جگہ آسانی سے گھیر سکتا تھا اور جہنم واصل کر سکتا تھا۔ ہم چلتے چلتے فصیل کے مرکزی دروازے ”عشتار گیٹ“ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ دروازہ صناعی اور کاریگری کا اچھوتا شاہکار تھا۔ کئی سیاح اس کی دیواروں پر منقش مورتیاں دیکھنے میں محو تھے، لیکن میری دلچسپی کا محور میرا شکار تھا جو عشتار گیٹ عبور کر کے اس راستے پر گامزن تھا جو بائیں گھوم کر مشرقی حصے کی طرف جاتا تھا۔ وہیں عشتار دیوی کا مندر تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد ہم عشتار دیوی کے عظیم الشان مندر پہنچ گئے۔ اس کے در و دیوار سے بوسیدگی



عیاں تھی۔ چند یورپی سیاح بن کی تعداد مسلسل پانچ یا چھ لکھوں ہوئی مندریں اور سڑاوسر ہاں رہے۔  
 وشوانا تھان سے الگ ایک برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ میں اسے نظروں میں رکھ کر اس گوشے میں پہنچ  
 گیا جہاں قربان گاہ تھی۔ یہ سنگ اسود سے بنائیں فٹ اونچا چوترہ تھا۔ اس کی لمبائی تقریباً چھ فٹ اور  
 چوڑائی تین چار فٹ تھی۔ بغور دیکھنے سے اس پر خون کے سیاہی مائل گہرے سرخ دھبے نظر آتے تھے۔  
 یہ ان انسانوں کے خون کے دھبے تھے۔ جنہیں صدیوں پہلے عشقار دیوی کے چرنوں میں قربان کیا گیا  
 تھا۔ وہاں عشقار دیوی کا کوئی بت نصب نہیں تھا۔ ممکن ہے کبھی وہاں کوئی مورتی موجود ہو جسے بعد ازاں  
 توڑ ڈالا گیا ہو یا ممکن ہے اسے کسی عجائب گھر کی زینت بنا دیا گیا ہو۔ میں نے قربان گاہ کے قریب  
 رُک کر سر کو قدرے جھکایا اور ایک مناجات پڑھی جس کی تلقین مجھے چپون نے کی تھی۔ مناجات میں  
 قدیم اشوری زبان میں عشقار دیوی کی تعریف و توصیف کی گئی تھی اور اس کے غضب (دراصل شر)  
 سے بچنے کے لئے التجا کی گئی تھی کہ وہ ایک ایسے نادم انسان کی تقصیر معاف کر دے جس نے انجانے  
 میں اس کے پجاری کو ایذا پہنچائی۔

مذکورہ مناجات تیرہ بار دہرا کر میں اٹے پاؤں پلٹا اور وشوانا تھ کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں کھڑا بار بار  
 اپنی دستی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اسے نوادرات کے بروکر کا انتظار تھا جو نہ جانے کہاں رہ گیا تھا۔ اس لمحے مجھے  
 خیال آیا کہ موقع ہے اسے دبوچ لینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ بروکر آٹپکے اور پھر اس کو قربان گاہ پر لا کر ذبح کرنا  
 ناممکن ہو جائے۔ میں نے یورپی سیاحوں کی سگن لی۔ وہ قربان گاہ دیکھ چکے تھے اور اب مندر سے باہر جا  
 رہے تھے۔ جب وہ دور نکل گئے تو میں تیز قدموں سے چلتا ہوا مندر کے دروازے تک گیا اور باہر جھانکا۔  
 کوئی نیا سیاح اس طرف آتا دکھائی نہ دیا۔ یہ وقت میرے لئے بہترین تھا۔ میں نے کن اکھیوں سے  
 وشوانا تھ کی طرف دیکھا اور قربان گاہ کے دروازے کے قریب پہنچ کر بے ہوش ہو کر گرنے کی اداکاری کی۔  
 گرتے وقت میں نے اپنے منہ سے ”ہائے رام“ کے الفاظ بھی نکالے تھے تاکہ وشوانا تھ مجھے اپنا ہم وطن  
 اور ہم مذہب سمجھ کر فوراً متوجہ ہو۔ میری چال نہایت کامیاب رہی۔ وشوانا تھ مجھے گرتا دیکھ کر بے اختیار  
 میری طرف لپکا اور میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے اٹھانے کی کوشش کی۔ عین اسی وقت میں نے بجلی کی  
 تیزی سے اسے دبوچ کر فرش پر پٹخا اور چشم زدن میں جیب سے استرانکل لیا۔ وہ میرا ارادہ بھانپ کے  
 بری طرح بوکھلا گیا۔ وہ حیران تھا کہ میری اس سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ میں نے شعلہ بار آنکھوں سے اس  
 کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”یاد کرو وشوانا تھ۔ تم نے دو سال پہلے کراچی کے ساحل سے ایک لڑکی کو اغوا کر کے بمبئی کے  
 بازار حسن میں بیچ ڈالا تھا۔ میں اس بدنصیب کا بھائی ہوں۔ آج آج میں تم سے اس گناہ کا حساب  
 چکانے آیا ہوں.....!“

میں نے اسے اس کے لمبے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور اٹھا کر قربان گاہ کے چوترے پر پٹخ دیا اور  
 پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا نہایت سرعت سے تیز دھارا ستر اس کی گردن پر پھیر دیا۔ وہ کسی مینڈھے  
 کی طرح ڈکارا اور اس کے زرخرے سے خون کی موٹی دھار فوراً کی صورت میں نکلی۔ میں نے بمشکل  
 اپنے کپڑوں کو خون کے چھینٹوں سے بچایا۔ وہ بُری طرح تڑپ رہا تھا اور چیخنے کی کوشش میں اس کے  
 حلق سے عجیب و غریب خرخراہٹ کی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں جنہیں کوئی کمزور دل انسان سنتا تو  
 خوف و دہشت سے بے ہوش ہو جاتا۔ دو چار منٹ تڑپنے کے بعد وہ ٹھنڈا پڑ گیا..... اور پھر میں نے جو  
 اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھا ایک عجیب وحشت ناک اور خوف آگیز نظارہ دیکھا۔  
 چوترے کی عقبی دیوار ایک گڑ گڑاہٹ کے ساتھ شق ہوئی اور اس کے اندر سے ایک آہنوی رنگت کی نیم  
 برہنہ عورت برآمد ہوئی۔ اس کے نسوانی اعضاء ہوشربا اور چہرے کے نقوش جاذب نظر تھے۔ اس کے  
 سراپے میں ایسی اشتہا انگیز کشش تھی جو کسی بھی مرد کے نفسیاتی جذبات کو بھڑکا کر اسے وحشی بنا سکتی  
 تھی..... لیکن اس کی آنکھیں۔ اُف میرے خدا! اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ اور تیز آنچ میں  
 جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان میں غضب تھا، پیاس تھی، فنا کر ڈالنے کی تمنا اور عجیب بے تابی تھی۔ وہ  
 آنکھیں وشوانا تھ کی خون میں نہائی ہوئی لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ یکا یک ان شعلہ بار آنکھوں سے دو  
 بڑے شعلے ایک خوفناک آواز کے ساتھ لاش کی طرف لپکے اور اسے لمحہ بھر میں یوں نکل گئے جیسے وہ  
 لاش نہ ہو رُدی کاغذ کا معمولی سا پرزہ ہو..... مگر شاید یہ مثال درست نہیں۔ کیونکہ کاغذ جلتا ہے تو کم از کم  
 وہاں جلنے کے بعد راکھ تو دکھائی دیتی ہے..... وشوانا تھ کی جلی ہوئی لاش کا تو نام و نشان بھی باقی نہ رہا  
 تھا.....! میں گنگ ہو کر پھرائی ہوئی نظروں سے یہ نظارہ دیکھا کیا۔ میرے بدن کو حرکت کا یا ر نہ تھا۔  
 میں سکتے کی سی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ ہوشربا نسوانی سراپا اب بھی میرے سامنے تھا، مگر اب آہستہ  
 آہستہ اس کی آنکھوں کی سرخی زائل ہو رہی تھی اور چہرے کا تناؤ نرمی میں بدل رہا تھا۔ پھر اس کے  
 یا قوتی لبوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ ابھری اور اس نے مجھ سے کہا:

”تمہاری قربانی قبول ہوئی خوبصورت نوجوان! تم سے جو جرم سرزد ہوا تھا وہ میرے نزدیک ناقابل  
 معافی تھا۔ تم میرا فوری رد عمل تو دیکھ چکے ہو..... مگر اب آسمان کی بیٹی تم سے درگزر کا سلوک کرتی ہے!“  
 ”میں آسمان کی بیٹی اور عظیم دیوی عشقار کی اس کرم نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“ میں نے کپکپاتے  
 ہوئے مرعوب اور مودب لب و لہجے میں کہا۔ اس کے لبوں پر تبسم کھیلنے لگا۔

”خوش بخت ہے تو اور قابل رشک ہے وہ ہستی جس کا تو منظور نظر ہے۔“ وہ تعریفی نظروں سے میرا  
 سراپا دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی نظروں میں چھپی پسندیدگی میری نگاہوں سے اوجھل نہ رہی..... اور معاً



”تو چلو پھر اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناؤ۔ میں بہت بیتاب ہو رہا ہوں۔“

”چلو! لیکن ہمیں یہاں لابی سے اٹھ کر کسی ایسے گوشے میں چلنا ہوگا جہاں کوئی نہ ہو۔“

ہم دونوں اٹھے اور ہوٹل کے عقبی لان میں چلے گئے جہاں صبح کی نرم دھوپ زیتون کی شاخوں پر پڑ رہی تھی اور آس پاس خاموشی اور تنہائی کا راج تھا۔

”میری کمر میں اپنا دایاں بازو ڈالو اور میرے بائیں پاؤں پر اپنا دایاں پاؤں رکھ دو۔“

چمپون نے مجھے ہدایات دینا شروع کیں۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ تعمیل کی۔ چمپون نے اپنا بایاں بازو میری گردن میں جمائل کر دیا۔

”اب آنکھیں بند کر لو اور میرے ساتھ ساتھ دہراؤ۔“ وہ مترنم لہجے میں بولی۔

”ستر ابو شے تام ناچورا۔“

”ستر ابو شے تام ناچورا۔“ میں زیر لب دہرانے لگا۔

کاشی مترے شام کا تورا۔“

کاشی مترے شام کا تورا۔“

”بابل بوشے حام باثورا۔“

”بابل بوشے حام باثورا۔“

اور جونہی یہ الفاظ مکمل ہوئے، ہمیں ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور کانوں میں سائیں سائیں کی آواز آئی جو لمحہ بہ لمحہ معدوم ہوتی گئی۔ میری آنکھیں ہنوز بند تھیں اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”آنکھیں کھول دو بوبی ہم ماضی میں پہنچ گئے! یہ قدیم بابل ہے!“ مجھے چمپون کی آواز آئی اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو مجھ پر حیرت و مسرت کا پہاڑ ڈھے گیا۔ میں ایک سرسبز باغ میں چمپون کے ساتھ ایک چھتنا اور درخت کے نیچے کھڑا تھا اور کچھ فاصلے پر ایک ایسا عظیم و خوشنما شہر نظر آ رہا تھا۔ اس کے اطراف خاصی اونچی سنگی دیوار تھی جس کی بلندی کم از کم ساٹھ فٹ ہوگی۔ اس میں بارہ برج تھے اور ہر برج پر ایک علم نصب تھا۔ دیوار کے اندر ایک بلند و بالا اور نہایت عالیشان محل نظر آیا جس پر دو سنگی شیر اور ایک عظیم الجثہ طلائی عقاب پر پھیلائے آمادہ پرواز دکھائی دیتا تھا۔ برجیوں میں چاک و چوبند سپاہی نیزہ بدست آمادہ پیکار پوری تہیہ سے اپنی ذمہ داری کے علاقے کی نگرانی میں مصروف تھے۔

”واہ! کیا خوبصورت نظارہ ہے۔“ میرے منہ سے تعریف کے الفاظ نکلے۔

”یہ بابل کے بادشاہ ہمورابی کی جہیتی بیوی صبوراکا محل ہے۔“ چمپون نے جواب دیا۔

”کیا میں اس کے اندر جا کر سیر کر سکتا ہوں؟“

”ویسے تو کسی مرد کے لئے ممکن نہیں کہ اس کے اندر داخل ہو کیونکہ بادشاہ نے اس محل میں لونڈیوں اور خواجہ سراؤں کے سوا سب کا داخلہ بند کر رکھا ہے۔ لیکن تمہیں میں اس طرح اندر پہنچاؤں گی کہ تم سب کی نگاہوں سے اوجھل رہو گے۔ لیکن خود سب کچھ دیکھ سکو گے۔“

”پھر تو بڑا ایڈونچر رہے گا۔ لیکن کیا تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گی؟“

”جاؤں گی مگر ہر جگہ تمہارا سایہ بن کر نہیں رہوں گی ورنہ تمہیں خاک مزہ آئے گا!“

”تو پھر چلو۔“

”میں چاہتی ہوں پہلے تمہیں شہر کی چیدہ چیدہ جگہوں کی سیر کرادوں کیونکہ مجھے یقین ہے صبوراکا محل ایسا طلسم کدہ ہے کہ ایک بار تم اس میں داخل ہو گئے تو حسیناؤں کی قربت تمہیں واپسی کا راستہ بھلا دے گی!“ وہ مسکرائی۔

میں نے متبسم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جو مزاج یار میں آئے۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور زیر لب کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکا جس کے اثر سے میں اور وہ عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ ہماری گفتگو سننے سے بھی قاصر تھے۔ یہ بڑا ہی دلچسپ تجربہ تھا۔ ہم لوگوں کے درمیان چل رہے تھے مگر کسی کو ہماری موجودگی کا علم تھا نہ احساس۔ سب سے پہلے ہم فصیل میں بنے ہوئے ایک فیل قامت دروازے پر پہنچے جو فن تعمیر اور صنایع کا شاہکار تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ چمپون نے بتایا کہ یہ باب عثمان ہے۔ جس سے گزشتہ روز گذر کر میں قربان گاہ کی طرف گیا تھا۔ دروازے کے دونوں طرف مستعد فوجی سپاہی کھڑے تھے جو سب آنے جانے والوں کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مشکوک آدمیوں اور اجنبیوں سے وہ پوچھتاچھ بھی کر رہے تھے۔ چمپون اور میں ان کے قریب سے گذر کر اندر داخل ہو گئے۔

”یوں تو یہ ایک بین الاقوامی شہر ہے اور اشوریہ، فارس، مصر، ہندوستان اور چین کے تجارتی قافلے یہاں آزادانہ وارد ہوتے ہیں، مگر یہ دروازہ شارع عام نہیں۔ صرف شاہی خاندان کے افراد و وزراء، مذہبی پیشوا اور ان کے خدمت گار یا دفتری کارندے ہی اس دروازے کو استعمال کرتے ہیں۔“ چمپون نے بتایا۔

ہم دروازے سے اندر داخل ہوئے تو تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر شاہی محلات اور وزراء کی رہائش گاہیں نظر آئیں۔ وہاں تک ایک کشادہ سڑک تھی جسے سرخ ترشیدہ پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف سرسبز گھاس کی پٹیاں، پھولوں کی روشیں اور آرائشی پودے اُگائے گئے تھے جن کے درمیان مناسب فاصلے پر سنگی شیر، نیل اور اژدہ ایستادہ تھے اور ان کے کھلے منہ سے پانی کے فوارے جاری تھے۔

”دائیں طرف دیکھو۔“ چمپون نے اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا اس طرف ایک عظیم الشان مینار نظر



آ رہا تھا۔

”یہ بابل کا عظیم اور پر شکوہ مینار ”زیگورات“ ہے جسے گول زینے کی شکل میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی سات منازل ہیں اور اس کی چوٹی پر نیلے پتھر سے ایک مندر اور قربان گاہ بنائی گئی ہے۔ مینار کی بنیادوں کی چوڑائی یعنی قطر تقریباً سو فٹ ہے جبکہ بلندی پر پہنچ کر اس کا قطر تقریباً تیس فٹ رہ جاتا ہے۔“

”اس کی اونچائی کیا ہے؟“ میں نے تعریفی نظروں سے مینار کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ ڈیڑھ سو فٹ سے بلند ہی ہوگا۔“ چمپون نے جواب دیا۔

”اس کے قریب شاید کوئی مندر ہے؟“ میں نے ایک بلند اور پر شکوہ عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہارا خیال درست ہے۔ یہ بابلیوں کے خدا ”مردوک“ کا مندر ہے جسے اس اگیلا مندر کہا جاتا ہے۔ یہ بابل کا سب سے بڑا مندر ہے۔ اس کے علاوہ چار مندر اور ہیں جو مشرقی حصے میں واقع ہیں۔ ان میں عشتار دیوی کا وہ مندر بھی شامل ہے جس کی قربان گاہ پر تم بلیدان کے لئے گئے تھے۔ بائیں طرف کا راستہ وہیں جاتا ہے۔“

اس نے اشارہ کیا تو میں نے مڑ کر دیکھا اور مجھے یاد آ گیا۔ گذشتہ روز میں نے اسی راستے کو اختیار کیا تھا۔

”میں نے بابل کے معلق باغات کے متعلق بہت سن رکھا ہے۔ مجھے وہاں بھی لے چلو گی؟“

”ہاں ضرور مگر اس کے لئے ہمیں مشرقی فصیل پار کر کے دریائے فرات کے کنارے پہاڑیوں پر جانا ہوگا۔ پہلے یہاں کے چند مشہور مقامات دیکھ لیں پھر وہاں چلیں گے۔“

ہم کئی گھنٹے شہر میں گھومتے رہے اور وہاں کی رعایا، حکمران طبقے اور ثقافت کو دیکھتے رہے۔ چمپون کی معیت میں میں نے جو کچھ دیکھا اور اس نے مجھے جو کچھ بتایا وہ مختصر بیان کرتا ہوں۔

شہنشاہ ہمورابی کے دور میں بابل سلطنت بابلیہ کا دار الحکومت تھا جس کا رقبہ پچیس سو ایکڑ اور آبادی بیس لاکھ نفوس سے تجاوز کر چکی تھی۔ سلطنت بابلیہ کی سرحدیں مشرق میں فارس اور مغرب میں دریائے نیل تک پھیلی ہوئی تھیں۔ شمال میں شام کا سارا علاقہ اور جنوب میں ساحلی شہر اربھی سلطنت بابلیہ کا حصہ تھا۔ شہر کے اطراف تین فصلیں تھیں۔ بیرونی فصیل سب سے بلند تھی جس میں بارہ دروازے تھے۔ آبادی دریائے فرات کے دونوں کناروں پر موجود تھی۔ دریائے فرات پر آ رہا پار جانے کے لئے ایک مضبوط سنگی پل تعمیر کیا گیا تھا۔ شہر کی گلیاں کشادہ تھیں اور صفائی کا شاندار انتظام تھا۔ جابجا بازار، حمام، بالا خانے، شراب خانے، سرائے اور مہمان خانے قائم تھے۔ لوگ خوبصورت اور دراز قد تھے، خصوصاً عورتیں خوب رو اور تراشیدہ بدن تھیں۔ دریائے فرات میں منقش رنگین کشتیاں اور ہنڈولے چلتے تھے جو شام سے لے کر اُرتک دریائے فرات کی لہروں پر محو سفر رہتے۔ سفر کے لئے نیل

گاڑیاں، اونٹ اور کھوڑے بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ شہر کے کھاٹ، کارواں سرائے اور باغات ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کے مرکز تھے جہاں رات گئے تک تاروں کی چھاؤں اور مشعلوں کی روشنی میں قصہ گوئی، داستان سرائی اور نظم گوئی کی محافل جمتیں۔ شہر کا عمومی ماحول رنگین اور رومان پرور تھا۔ بابلی مرد طبیعتاً عاشق مزاج اور عورتیں عشوہ و ادا میں طاق تھیں۔ بادشاہ عیاش، حسن پرست اور تعمیرات کے شائق تھے۔ انہوں نے دنیا بھر کا حسن وہاں جمع کیا اور شہر بابل کو بے مثل اور عالم میں انتخاب بنانے کے لئے اپنا اپنا حصہ ڈالا۔ اس ضمن میں سموابم، تیگیو لاتھ، سارگون اور ہمورابی نے سب سے زیادہ تعمیرات کیں۔ بعد میں آنے والوں نے بھی اس سلسلے کو جاری و ساری رکھا۔ خاص طور پر معلق باغات قابل دید اور حیران کر دینے والے تھے۔ دریا کے کنارے پہاڑیوں کو مرحلہ وار قطعات کی شکل میں ہموار کر کے وسیع و عریض باغات کی شکل دے دی گئی تھی۔ جن میں سیب، انار، انجیر، زیتون اور کھجور کے درخت ترتیب سے لگائے گئے تھے اور کئی اقسام کے انگوروں کی بلیں خاص طرح کے چوبی جالوں پر چڑھائی گئی تھیں۔ ہر سطح قطعے پر ایک آبی نہر تھی جس میں پانی دریائے فرات سے سپلائی ہوتا تھا۔ یہ لہریں ایک خاص تکنیک سے پانی پہاڑیوں کی بلند چوٹیوں تک لے جاتی تھیں جو آج کے سائنسی دور میں بھی ایک عجوبہ لگتا ہے۔ یہ باغات اعلیٰ درجے کی سیرگاہیں تھیں جن میں سنگی مجسمے، بارہ دریاں، روشیں، سرسبز گھاس کے قطعات، سنگی نشست گاہیں اور نہانے کے تالاب بھی بنائے گئے تھے۔ خواص اور عوام کے لئے علیحدہ سیرگاہیں تھیں۔ ان باغات سے اترنے والے پھل، سب سے نچلے قطعات میں قائم فروٹ مارکیٹوں میں فروخت ہوتے اور وہیں سے ٹوکروں میں بند کر کے کشتیوں کے ذریعے دوسرے شہروں میں بھیجے جاتے تھے۔

میں نے بھوک لگنے پر ان باغات کے تازہ پھل نہر کے ٹھنڈے پانی میں دھو کر کھائے۔ میرا خیال ہے ان جیسے خوش ذائقہ پھل فی زمانہ کہیں دستیاب نہیں۔

شہر کی سیر سے فراغت پانے کے بعد چمپون مجھے صبرا کے محل میں لے گئی۔ اس وقت دن بھر کا تھکا ماندہ سورج افق کے دامن میں منہ چھپا چکا تھا تاہم اندھیرے نے اپنے پر ابھی نہیں پھیلائے تھے۔ اس نے سنگ مرمر کے ایک خوبصورت مور کے قریب ٹھہر کر مجھ سے کہا:

”بوی میں تمہیں چند روز کے لئے یہاں تنہا چھوڑ کر جا رہی ہوں، انجوائے کرو۔ جب تمہارا جی بھر گیا تمہیں واپس لے جاؤ گی۔“

”لیکن..... کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا تو؟“ میں نے بے تابی و بے چینی سے کہا۔

”کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔ جہاں کہیں میری ضرورت محسوس کرو مجھے آواز دے دینا، میں پہنچ جاؤں گی۔“



”ویسے تو سب ٹھیک ہے، مگر فرض کرو میں یہ خواہش کروں کہ دوسروں کو نظر آسکوں؟“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”اس صورت میں تم ایک منتر پڑھنا..... صیدونس، آمنس، عمانیل و عمانات۔ یہ منتر پڑھتے ہی تم ظاہر ہو جاؤ گے۔ پھر نگاہوں سے اوجھل ہونا چاہو تو الثا عمل کرنا ہوگا۔ عمانات و عمانیل، آمنس، صیدونس!“

میں نے دو تین مرتبہ دہرا کر منتر یاد کر لیا تو چپون مجھے وہاں چھوڑ کر غائب ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں ایک روش پر ٹھہرنے لگا۔ کچھ ہی دور مجھے ایک خوبصورت لونڈی کانٹوں سے بچ بچ کر گلاب کے پھول توڑتی اور انہیں ایک ٹوکری میں ڈالتی نظر آئی۔ اس کی عمر سترہ اٹھارہ برس ہو گی۔ وہ اشوری زبان میں ایک عشقیہ گیت گنگنا رہی تھی جو چپون کی طرف سے عطا کردہ لدنی علم کی بدولت میں بخوبی سمجھ رہا تھا اور وہی زبان بولنے پر بھی قادر تھا۔ لڑکی ایسی معصوم اور پیاری سی تھی کہ میرا دل اس سے بات کرنے کو مچلنے لگا، مگر میں نے بمشکل خود کو تھامے رکھا، ورنہ وہ سراسیمگی کا شکار ہو کر شور مچا دیتی اور سارا کھیل بگڑ جاتا۔ البتہ میں نے اتنا ضرور کیا کہ چپکے سے بہت سے پھول توڑ کر اس کی آنکھ بچا کر ٹوکری میں ڈال دیئے۔ وہ بے خیالی میں گیت گنگناتی پھول توڑ رہی تھی، مگر ٹوکری اچانک لبالب بھری دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔

”کمال ہے، مردوک کی قسم! میں نے اتنے پھول ہرگز نہیں توڑے تھے۔ کیا آسمانی دیوتاؤں نے ٹوکری پھولوں سے بھر دی؟ مگر وہ مجھ غریب پر کیوں مہربان ہونے لگے۔ ضرور ملکہ صبور اپہ ان کی نگاہ کرم ہو گئی ہے! میں اس کا ذکر ملکہ عالیہ سے ضرور کروں گی..... لگتا ہے شہنشاہ معظم ہمورابی کی بے رخی اور تک چڑھی لونڈیا ”آشتیا“ پر ان کی فریفتگی دیوتاؤں کو پسند نہیں آئی.....“

میں نے گہری سانس لی۔ وہی محبت و رقابت کی ازلی داستان، اس محل کی غلام گردشوں میں بھی سانس لے رہی تھی!

لونڈی پھولوں کی ٹوکری اٹھا کر لوٹی تو میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ راستے میں ہمیں کئی خوش لباس لونڈیاں ملیں جو خوبصورتی و نزاکت میں بے مثل تھیں مگر ان میں غلامانہ عاجزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس محل میں عام شکل و صورت یا بد صورتی کا پرتو بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک باغ میں سنگ مرمر کی بارہ دری اور شفاف نیلگوں پانی کا بلوریں تالاب دیکھا جس کے کنارے ایک مریض تخت بچھا تھا اور اس پر ایک نہایت حسین مہلقا، دختر فردوس کا وکتیہ لگائے طلسم و دیبا کا لباس زیب تن کئے چند لونڈیوں کے جلو میں نہایت تمکنت سے بیٹھی تھی۔ وہ یقیناً ملکہ صبور تھی۔ میں اس کا حسن و جمال دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ وہ ایسی تھی کہ چودھویں کا چاند دیکھتا تو شرما کر مارے بدلی میں منہ چھپا لیتا۔ لونڈی اس کے قریب پہنچ کر

مودب انداز میں بھی اور پھولوں کی ٹوکری آگے لے کر ہوئے لویا ہوئی۔

”ملکہ عالیہ۔ آپ پر مردوک و عشثار کا سایہ ہو۔ اس پھولوں کی ٹوکری میں جو کچھ ہے، میری کوشش کا ثمر نہیں بلکہ آسمانی دیوتاؤں کی عطا ہے۔“

ملکہ عالیہ اور سب لونڈیاں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”کیا کہہ رہی ہو عاٹیبہ؟“ ملکہ نے حیرانی سے سوال کیا۔ اس کی آواز کو ہستانی جھرنوں سے پھوٹنے والی جلت رنگ سے مشابہہ تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں دختر فلک۔ میں جب پھول توڑ رہی تھی تو گلاب کے کانٹے میرے لئے دشواری پیدا کر رہے تھے۔ ایسے میں کسی نادیدہ ہاتھ نے ڈھیروں پھول توڑ کر اس ٹوکری میں بھر دیئے۔ میرا دل کہتا ہے آسمانی دیوتا قابوس آپ کی مدد کو پہنچنے والا ہے۔ کاہن اعظم شامان کی بیٹی سانیا نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ شہنشاہوں کے التفات میں کمی کا شکار ہو جانے والی ملاؤں کے پاس آسمان سے قابوس دیوتا آتا ہے اور انہیں رنج و غم سے نجات دلاتا ہے.....“

”میری ایسی قسمت کہاں عاٹیبہ۔“ اس ماہ لقانے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”جہاں تک کاہن زادی سے سنی ہوئی داستانوں اور اساطیر کا تعلق ہے، میں اس پر پورا یقین رکھتی ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے آسمانی دیوتا قابوس کی کبھی پوجا کی ہے اور نہ نذر گزاری ہے، پھر وہ کیوں میری مدد کو آسمان سے اترنے لگا؟“

”تو ملکہ عالیہ۔ اب اس کی پوجا شروع کر دیجئے۔“ عاٹیبہ نے جلدی سے کہا۔ ”اس نے مائل بہ کرم ہونے کا اشارہ تو کر ہی دیا ہے..... میرا دل کہتا ہے کہ پھولوں کی ٹوکری قابوس دیوتا ہی نے بھری ہے۔ وہ جانتا ہوگا کہ میں یہ پھول آپ کے بستر کی زینت بنانے کے لئے لے جا رہی ہوں.....“

یہ سن کر ملکہ صبور اداسی سے بولی۔ ”آج چالیسویں رات ہے مجھے بستر پر گلاب بکھیرتے۔ شہنشاہ ایک شب بھی ان پھولوں کو روندنے نہیں آئے۔ وہ آشتیا کی محبت میں مجھے یکسر بھلا بیٹھے ہیں۔ وہ آج بھی نہیں آئیں گے چاہے پھول دیوتا ہی کی عطا ہوں۔“

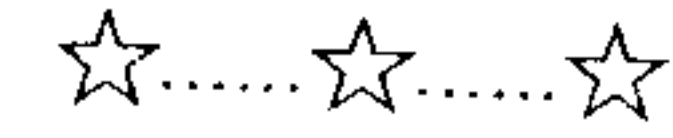
ان کی باہمی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہمورابی جس نے بڑی چاہت اور محبت سے صبور کو جو سابقہ سپہ سالار کالات کی بیٹی تھی، ملکہ بنایا تھا، اب وزیر مال سیفون کی بیٹی آشتیا پر فریفتہ ہو گیا تھا اور عنقریب اس سے بیاہر چانے والا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ملکہ صبور اسے اسے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی اور وہ ایک عدد بیٹے کی آرزو میں دبلا ہو رہا تھا۔ کاہن اعظم نے پیش گوئی کی تھی کہ اگر وہ آشتیا سے شادی کر لے تو اس کی مراد بر آئے گی۔ (غالباً وزیر مال کا مال کام آیا تھا کہ کاہن اعظم نے ایسی پیش گوئی کی تھی!)۔ بادشاہ کاہن اعظم کی پیش گوئی کو پورا کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا اور آشتیا کے





ساتھ باقاعدہ بیاہ سے پہلے ہی داد عیش دینے میں مصروف ہو گیا تھا۔ وہ سب آشتیا کو کلمو ہی، ٹکوڑی، بدبخت اور نہ جانے کیسے کیسے القابات سے نواز رہی تھیں مگر مجھے یقین تھا کہ اس حسینہ میں ضرور کوئی انوکھی بات ہوگی۔ جہاں دیدہ شہنشاہ کسی کم تر چیز پر کبھی نہیں رتھتے! اب میں دل ہی دل میں مسکرانے اور سوچنے لگا کہ ملکہ صبور اسی حسین عورت سے حظ اٹھانے کے لئے قابوس دیوتا کا روپ دھارنا کیسا بے گاہ؟

”آہ! میری ماہ لقا..... ملکہ صبور! شہنشاہ ہمو رابی یقیناً تمہاری ناقدری کا مرتکب ہو رہا ہے مگر یہ دیوتا..... قابوس ہرگز ایسا نہیں کرے گا.....“ یہ کہہ کر میں ایک قدم آگے بڑھا اور جھک کر ملکہ کے لبوں کا بوسہ لے لیا..... میرے لب اس کے پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے مس ہوئے تو وہ چونک گئی اور حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔



ملکہ صبور کی منظور نظر لونڈی عاطیہ نے اس کی بدلی ہوئی کیفیت کو محسوس کر کے سوال کیا۔

”کیا ہوا ملکہ عالیہ۔ باندی آپ کو حیران و سر اسیمہ پاتی ہے۔“

”کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں۔“ ملکہ نے کسی نوخیز دوشیزہ کی طرح شرما تے اور گھبراتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔ اب باہر بیٹھنا مناسب نہیں۔ میں اپنی خواب گاہ میں جانا چاہوں گی.....“ یہ کہہ کر وہ رشک مہ و شاں اپنے تخت سے اٹھی اور تیز قدم اٹھاتی محل کی طرف بڑھی۔ لونڈیوں نے بھی اس کی تقلید کی تاہم وہ متعجب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان نگاہوں میں انگنت سوال تھے۔

ملکہ عالیہ نے اپنی شاندار خواب گاہ میں قدم رکھا تو باقی لونڈیاں دروازے سے واپس لوٹ گئیں صرف عاطیہ اس کے ہمراہ خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ جب ملکہ مسہری پر نیم دراز ہوئی تو اس نے پست آواز میں سوال کیا۔

”ملکہ عالیہ یقیناً کوئی خاص بات تھی جس نے آپ کی طبیعت کو اچانک متغیر کر دیا۔“

”ہاں عاطیہ!“ ملکہ نے اقرار میں اپنی صراحی دار گردن ہلائی۔ ”کسی سے ذکر نہ کرنا۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ کسی جوان مرد نے بھرے بھرے ہونٹ میرے نازک لبوں سے مس کئے اور انہیں چومنے کی کوشش کی۔“

”سچ ملکہ عالیہ؟“

”ہاں عاطیہ۔ مجھے لگتا ہے تم نے جو کچھ کہا تھا وہ واقعی حقیقت ہے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ آسمانی دیوتا قابوس میری مدد کو پہنچنے والا ہے۔ یقین کرو اب تو میرا بھی جی چاہ رہا ہے کہ وہ جلد آسمان سے اس آنگن میں اترے اور مجھے اس غم سے نجات دلائے جس نے میرے دن کا چین اور راتوں کی نیند چھین لی ہے۔ تم ابھی اور اسی وقت سنگتراش صیدونی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ آسمانی دیوتا قابوس کی مورتی تراش دے۔ مجھے کل آفتاب طلوع ہونے سے پہلے اس کی مورتی چاہیے۔ پھر میں اس کی پوجا کا اہتمام کروں گی۔ پوجا کا طریقہ تم کاہن اعظم شامان کی بیٹی سانیا سے پوچھ لینا۔“



”جو علم ملکہ عالیہ۔“ عاٹھ لورس بجالائی۔ پھر پھولوں کی ٹوکری کی طرف دیکھے ہوئے پوچھا۔

”مسہری پر پھول ڈالوں؟“

”چالیس دنوں سے یہ بیکار مشق جاری ہے اور نتیجہ صفر..... اب تو یہ پھول میرے بدن کو بچھوؤں کی طرح ڈسنے لگے ہیں۔ میں انہیں بستر کی زینت بنا کر کیا کروں گی؟“

”میرے خیال میں یہ پھول ان پھولوں سے بہتر ہیں جو میں روزانہ آپ کے لیے چنتی رہی۔ ان میں دیوتا کے توڑے ہوئے بہت سے پھول بھی شامل ہیں۔“

”نہیں۔ آج یہ پھول تم اپنی مسہری پر ڈال لو۔ مجھے اسی وقت یقین آئے گا جب میری پوجا کو پزیرائی بخش کر آسمانی دیوتا بنفس نفیس میرے پاس تشریف لائے گا۔“ ملکہ نے اداسی سے کہا اور کروٹ بدل لی۔

عاٹھ پھول کی ٹوکری اٹھا کر باہر نکلی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے خواب گاہ سے باہر آ گیا۔ ملکہ کی گفتگو سننے کے بعد مناسب یہی تھا کہ اس کی پوجا بار آور ہونے دی جائے اور پھر اس کے بعد اس کے سامنے دیوتا کے روپ میں رونمائی ہو۔ فی الحال عاٹھ کے مرمریں بدن سے حظ اٹھانا زیادہ مناسب تھا!

ماٹھ ملکہ کے رہائشی حصے سے نکل کر اس حصے کی طرف بڑھی جہاں بیرونی فصیل میں قطار در قطار کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں باندیاں سکونت پذیر تھیں۔ کوٹھڑی عاٹھ کی تھی۔ اس نے اپنی کوٹھڑی کا قفل کھولا اور چمقاق سے ایک چراغ روشن کیا۔ میں پہلے ہی اندر داخل ہو چکا تھا۔ کوٹھڑی میں روشنی پھیلی تو میں نے اس پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ وہ بمشکل ۹x۹ فٹ کی کوٹھڑی تھی جس میں ایک پرانی چوٹی مسہری بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں لکڑی کا صندوق رکھا تھا جس میں کپڑے اور ضرورت کی اشیاء ہوں کی۔ دیوار میں چند کھونٹیاں تھیں جن پر عام استعمال کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ اس نے پھولوں کی ٹوکری مسہری پر رکھ دی اور چراغ کی لودھم کر کے اگلے قدموں باہر نکلی۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ اب وہ محل کے عقبی دروازے سے ایک تنگ گلی میں داخل ہوئی اور تیز قدموں سے مشرق کی سمت روانہ ہو گئی۔ وہ ملک کی ہدایت کے مطابق سنگتراش صیدوئی کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے اس کے پیچھے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور کچھ دور واقع ایک باغ میں چلا گیا۔ محل میں واپس جانا میرے لیے محال تھا کیونکہ محافظ نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اب مجھے عاٹھ کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔ میں سنگ مرمر کے ایک بیچ پر لیٹ گیا اور آسمان پر بکھرے ہوئے تارے دیکھنے لگا۔ تارے جنہوں نے زمانے دیکھے ہیں۔ جو زمانے دیکھیں گے اور ان کی چھاؤں سے تکراروں اربوں انسان پیدا ہو کر جوان پھر بوڑھے ہوں گے اور رزق خاک ہو جائیں گے۔ آسمان پر چاند بھی تھا۔ ادھورا آدھا چاند جس کی منجلی روشنی ہر سو

پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں دریائے فرات کے قریب کی بدولت خوشگوار حسلی تھی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ اگر چمپون سنگتراش صیدوئی کے ذہن میں میرا خیال ڈال دے تو وہ آسمانی دیوتا قابوس کا جو مجسمہ بنائے گا اس کے خال و خد مجھ سے مشابہہ ہوں گے اور یہ امر میرے بنائے ہوئے منصوبے کے لیے انتہائی کارآمد ہوگا..... یہ خیال آتے ہی میں اٹھ بیٹھا اور اسے پکارنے لگا:

”چمپون! چمپون!“

چند لمحے گزرے تھے کہ چمپون پہنچ گئی تھی۔ مجھے اپنے عقب میں چمپون کے پروں کی پھر پھر اہٹ اور اس کی مخصوص سرسراہٹ محسوس ہوئی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے سوال کیا۔ میں نے سب ماجرا اسے کہہ سنایا۔ میری بات سن کر وہ مسکرائی:

”فکر نہ کرو۔ میں سب سنبھال لیتی ہوں۔ اب ایسی اسٹوری ترتیب دوں گی کہ تم بھی اش اش کراٹھو گے.....“

یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔

عاٹھ کافی دیر کے بعد لوٹی۔ میں نے اسے تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹتے دیکھا تو اس نازک اندام لڑکی پر بہت ترس آیا۔ وہ یقیناً کافی دور گئی تھی۔ میں اس کے پہلو میں چلنے لگا۔ جی چاہا اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھالوں اور کوٹھڑی تک لے جاؤں مگر یہ ممکن نہ تھا۔ محافظ نے اسے پہچان کر دروازہ کھولا تو میں بھی اندر داخل ہو گیا۔ ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کوٹھڑیوں تک گئے۔ عاٹھ نے بلاؤز کے کریمان میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی اور کوٹھڑی کا قفل کھولا۔ ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ اس نے چراغ کی لوا اونچی کی۔ دروازے کو اندر سے کندی لگا کر وہ پھولوں کی ٹوکری پر اچلتی ہوئی نگاہ ڈال کر اپنا لباس اتارنے لگی۔ میری آنکھیں پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔ اس کا بدن تھا یا مرمر کا تراشا ہوا مجسمہ۔ مجھے یقین ہے اگر سنگتراش صیدوئی اس کا تراشا ہوا بدن دیکھ لیتا تو اپنا تیشہ توڑ دیتا۔ میرے رگ و پے میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ انگڑائیوں پر انگڑائیاں لے رہی تھی اور اپنے خوبصورت بدن کے ابھار اور خطوط کا نہایت غرور اور پیار سے جائزہ لے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کھونٹی سے شب خوابی کا لباس اتار کر پہنے گی مگر اسے نہ جانے کیا ہوا۔ پرانا لباس پہننے کی بجائے وہ پھولوں کی ٹوکری کی طرف بڑھی اور سارے کتاب مسہری پر پھیلا دیئے۔ پھر ان پر لیٹ کر آہیں اور سسکیاں بھرنے لگی۔

”آہ قابوس! ارغمانی اور شباب کے دیوتا۔ مجھے یہ پھول بخشے ہیں تو اپنا قرب بھی بخش۔ مجھ پر بھی اپنی نظر کرم فرما مگر تو تو صرف تم زدہ مکاؤں کے پاس آتا ہے جو بے اعتنائی کا شکار ہوں۔ مجھے جیسی قریب باندیوں کی طرف تمہاری نگاہ کہاں اٹھتی ہے۔“



اب کس کافر کو ضبط کا یارا تھا۔ میں نے فوراً پیش قدمی کی اور اس کے ہوشربا بدن کو پھولیا۔ وہ بری طرح چونک گئی اور کسی قدر ڈر گئی..... مجھے احساس ہوا کہ اس طرح بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ ممکن ہے خوف کے مارے وہ چیخنے لگے۔ خواہشات کا اسیر ہو کر آسمانی دیوتاؤں کو پکارنا الگ بات ہے اور انہیں مجسم صورت میں سامنے دیکھنا اور بات۔ میں ایک کونے میں کھڑا ہو گیا اور بمشکل اپنے جذبات پر قابو پا کر اسے دوبارہ دیکھنے لگا۔ چند لمحے وہ ساکت رہی پھر کچھ دیر پہلے وقوع پذیر ہونے والی بات کو ایک واہمہ سمجھ کر دوبارہ مسہری پر کروٹیں بدلنے لگی۔ میں نے ارادہ باندھا کہ ظاہر ہو جاؤں چنانچہ میں نے چپون کا بتایا ہوا منتر دہرانا شروع کیا۔ جونہی منتر مکمل ہوا میں اس کی مسہری کے عین سامنے ظاہر ہوا اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہا:

”آسمانی دیوتا قابوس تمہاری مراد پوری کرنے آپہنچا ہے عاٹیہ.....!“

اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی اور وہ سہم کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

”کک..... کون ہو تم؟“ وہ اپنے ہوشربا بدن کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ہکا کر بولی۔ ”ڈرو نہیں عاٹیہ۔ میں فرزند فلک قابوس ہوں۔ شباب و رعنائی کا دیوتا۔ وہی جس نے تمہاری نوکری میں گلاب کے پھول ڈالے تھے اور وہی جس کا ذکر تم نے آج شام اپنی ہم جولیوں کی موجودگی میں ملکہ صبور سے کیا تھا اور جس کی مورقی تراشنے کے لیے سنگتراش صیدونی اس سے تیشہ لیے بیٹھا ہے۔ تم ابھی اسے ملکہ کا حکم سنا کر آئی ہو کہ طلوع آفتاب سے پہلے مورقی محل میں پہنچا دے۔“

”آہ! تم..... تم تو واقعی دیوتا ہو..... لیکن تم اندر کیسے چلے آئے۔ دروازے کو تو کنڈی لگی ہوئی ہے؟“

”دیوتاؤں کے لیے دیواریں اور بند دروازے کوئی حیثیت نہیں رکھتے نادان لڑکی۔“ میں مسکرایا۔

”مجھے اپنی حماقت اور ناقص عقل پر افسوس ہے“ وہ خجالت سے بولی۔ ”مجھے یہ احمقانہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ تم..... تم تو سب جانتے ہو۔ میرا نام بھی اور جو کچھ میں نے ملکہ سے کہا وہ بھی!“

میں نے جواب میں کچھ نہ کہا بس مسکراتا رہا۔ اس کا ڈر خاصا دور ہو گیا تھا اور اب وہ اپنا بدن چھپانے کی کوشش بھی ترک کرتی نظر آتی تھی۔

”کوٹھڑی میں بہت جس اور گرمی ہے۔ کیا ہوا کے گزر کے لیے اس میں کوئی روزن نہیں۔ باہر خوشگوار ہوا چل رہی ہے؟“

”روزن ہیں مگر اندر چھپکلیاں آ جاتی ہیں اس لیے میں نے انہیں کپڑاٹھوس کر بند کر دیا ہے۔ ویسے رات کو میں دروازہ کھول کر اور چراغ بجھا کر سوتی ہوں۔ جس سے گرمی کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔“

”لیکن آج تو تم نے اندر سے دروازہ بند کر کے باقاعدہ کنڈی لگا رکھی تھی؟“

”وہ..... وہ تو.....“ اسے کوئی معقول جواب نہ سوجھا۔ وہ اپنے عمل کا کیا جواز پیش کرتی؟

”میں چراغ گل کر کے دروازہ کھول دوں؟“ میں نے سوال کیا۔

”کیا دیوتاؤں کو بھی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے؟“ اس نے تیکھے پن سے جواب دیا۔

”وہ جنہیں محبوب رکھتے ہیں ان پر حکم نہیں چلاتے۔“ میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر چراغ گل کر دیا۔ کوٹھڑی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ جب میں دروازے کی کنڈی کھول رہا تھا تو اس نے جذبات میں لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

”میرے دیوتا! کنڈی کھول دو مگر دروازے کا پٹ پورا نہ کھولنا.....“

”کیوں.....؟“

”باہر چاند کی روشنی ہے جو دروازے سے اندر آئے گی۔ کوئی گزرتے ہوئے ہمیں دیکھ سکتا ہے.....“

”اوہ! آئی سی!“

”تم نے کیا کہا دیوتا؟“ میرے منہ سے یہ اجنبی اور نامانوس الفاظ سن کر اس نے بے اختیار سوال کیا۔ میں گڑبڑا گیا۔

”ک..... کچھ نہیں۔ یہ آسمانی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب ہے میں سمجھ گیا.....!“

”آسمانی زبان عجیب سی ہے۔ میرے دیوتا!“ وہ ہنسی ”تمہارا لباس بھی عجیب ہے۔“

میں نے سرمئی رنگ کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور نیچے مکیشن شوز تھے۔

”ہاں..... آسمان کی ہر شے زمین سے مختلف ہے۔“ میں نے جواب دیا اور اس کے قریب مسہری پر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے انتہائی قریب پا کر اس کے سانس زیر و زبر ہونے لگیں۔ میں نے صرف ایک بار اس کے شیریں لبوں سے شباب کا رس کشید کیا تھا کہ اس پر خود سپردگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

صبح کا ذب کے وقت جب وہ ہنوز سوئی ہوئی تھی میں نے منتر پڑھ کر خود کو غائب کیا اور کوٹھڑی کا دروازہ آہستگی سے کھول کر باہر نکل گیا۔ محل پر سنائے کا راج تھا۔ سب مکین محو خواب تھے۔ صرف خولجہ سرا جو محل کی محافظت پر مامور تھے پہرہ دے رہے تھے۔ میں ان کے قریب سے گزر کر ایک کھلے دروازے سے باہر نکل گیا جس میں سے ایک کبڑا سا مفلوک الحال بابا اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے میں لپی ہوئی کوئی چیز تھی جسے وہ پہرے داروں کو دکھانے سے گریزاں تھا۔

”کیا لے جا رہا ہے یہ ملکہ کے پاس؟“ ایک پہرے دار نے دوسرے سے پوچھا۔

”کہتا ہے کوئی مورقی ہے جو ملکہ عالیہ نے بنوائی ہے؟“



ملکہ نے اس بڑے کوچہ زیادہ ہی سر پر ہار رکھا ہے۔ بڑوں بڑوں کو حاسر میں لانا ناممکن ہو رہا ہے۔  
معمولی پہرے دار ہیں۔ اب بھلا مورتی دکھانے میں کیا حرج ہے، مگر نہیں۔ بڑھے کا مزاج.....  
”آہستہ بھئی۔ سن لے گا اور ملکہ معظمہ سے جا کہے گا۔ کیوں اپنی اور میری جان کے درپے ہو۔“  
دوسرے پہرے دار نے اسے ٹوک دیا۔

وہ سنگتراش صیدونی کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ اس عظیم مجسمہ ساز نے رات ہی رات میں مورتی تراش لی تھی۔ مجھے اشتیاق ہو رہا تھا کہ مورتی دیکھوں۔ بھلا کس حد تک مجھ سے مشابہہ ہے، مگر میں نے فی الحال یہ ارادہ معرض التوا میں ڈالا اور باہر نکل گیا۔

دو تین گلیاں گھوم کر میں اسی سبزہ زار میں پہنچ گیا جہاں رات میں بیچ پر دراز تھا۔ دریا اس باغ سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں دریا کے کنارے پہنچا تو مشرقی افق پر سفیدی ظاہر ہو چکی تھی۔ میں نے سفاری سوٹ اتار کر دریا کے کنارے رکھا اور پانی میں اتر گیا۔ دریا کا پانی ٹھنڈا اور راحت بخش تھا۔ میں کتنی ہی دیر اس میں نہاتا اور تیرتا رہا۔ جب سیری ہو گئی تو باہر نکل کر کپڑے پہن لیے۔

سورج تانے کے ایک بڑے سے تھال کی طرح مشرقی افق پر ٹنگا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بلند اور مزید چمکدار ہو رہا تھا۔ سورج طلوع ہوتے ہی دریا پر چہل پہل میں اضافہ ہو گیا تھا۔ صبح کی سیر کے شائق مرد و زن دریا کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ چند ٹھیرے جو رات بھر دریا میں مچھلیاں پکڑتے رہے تھے، اپنی کشتیاں کنارے کی طرف بڑھا رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی شکتہ کشتی میرے بالکل قریب آ کر کنارے سے لگی۔ اسے دو غریب ماہی گیر چپو چلاتے وہاں لے کر آئے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا مرد تھا جس کی عمر چالیس پینتالیس برس ہوگی۔ اس نے ایک میلا سا لنگوٹ باندھ رکھا تھا اور باقی بدن برہنہ تھا جو دھوپ میں جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔ اس کی عمومی صحت بہت خراب تھی۔ دوسرا سولہ سترہ برس کا جوان لڑکا تھا جو شکل و صورت سے اس کا میٹا لگتا تھا۔ اس کی صحت قدرے بہتر تھی اور رنگت صاف تھی۔ اس نے ایک چونہ پہن رکھا تھا جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور اس پر پیوند لگے ہوئے تھے۔ میں نے کشتی میں جھانک کر دیکھا تو ایک پھنسا پرانا جال اور اس میں پھنسی ہوئی درجن بھر مچھلیاں دکھائی دیں۔ وہی ان کی رات بھر کی کمائی تھی۔

”مینا..... اس سے پہلے کہ وزیر مال کا کوئی کارندہ ادھر آئے جلد از جلد یہ مچھلیاں کسی بیوپاری کے ہاتھ بیچ ڈالو.....“ ادھیڑ عمر ماہی گیر نے کھانستے ہوئے کہا۔

”مجھے تو یہاں کوئی بیوپاری نظر نہیں آ رہا۔“ نوجوان نے آنکھوں پر اپنے دائیں ہاتھ کا تھچہ بنا کر دور و نزدیک نگاہ دوڑائی۔

”باغ کی طرف جا کر دیکھو۔ ممکن ہے عاٹون پہنچ چکا ہو۔ وہ رحمدل انسان ہماری مچھلیوں کے اچھے

دراں کا نام ہے۔ حدت کے اعانت کردوں اس پر مرام ہے۔ اس کا مرام ہے نہ۔ مرام ہی رہے ہیں دور نہ مرام دور یہ مال تو آدمی مچھلیاں بطور لگان ہتھیا لیتا ہے۔“

”ابا..... کب تک وزیر مال ہم ماہی گیروں پر یہ ظلم روا رکھے گا۔ جس دن بادشاہ کو خبر ہوگئی وہ اسے معزول کر دے گا اور کڑی سزا دے گا.....“ بیٹے نے جواب دیا۔

”تم کیا سمجھتے ہو بادشاہ اس کی حرکتوں سے بے خبر ہے؟ میرے بیٹے وہ شخص بادشاہ ہو ہی نہیں سکتا جسے اپنے ماتحت وزراء کی حرکات کا علم نہ ہو.....“  
”اگر ایسا ہے تو بھروہ اسے اس ظلم سے روکتا کیوں نہیں؟“

”میرے بیٹے۔ بادشاہ آج کل اس کی بیٹی آشتیا کے عشق میں مبتلا ہے اس لیے اسے کچھ نہیں کہتا۔ اسی لیے تو وہ اتنا ظالم اور جابر بن گیا ہے کہ جو تاجر کسان دکاندار ماہی گیر یا بیوپاری اس کی مرضی کے مطابق لگان یا ٹیکس ادا نہیں کرتا وہ اسے دردناک سزا دیتا ہے۔ اب تک کئی لوگوں کو بھوکے شیروں کے سامنے ڈال چکا ہے۔ سنا ہے کل پھر وہ ایک ”باغی“ تاجر کو بھوکے شیروں کے سامنے ڈالنے والا ہے!“  
ادھیڑ عمر ماہی گیر نے یاسیت سے کہا۔

دونوں باپ بیٹے کی گفتگو سن کر مجھے بہت دکھ پہنچا۔ میں نے تاریخ کی کتابوں میں ایسے واقعات پڑھے تھے کہ بادشاہوں نے بعض قلعوں میں باقاعدہ ایسے گہرے پنڈال بنا رکھے تھے جہاں قیدیوں اور مجرموں کو بھوکے شیروں کے سامنے ڈال دیا جاتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے جاہ و جلال کا مظاہرہ کرتے اور رعایا کو خوف میں مبتلا کر کے من مانے طریقے سے حکومت کرتے تھے۔ شہنشاہ ہمورابی خود ایسا تھا یا نہ۔ مجھے اس کا علم نہ تھا مگر ان ماہی گیروں کے کہنے پر اس کا وزیر مال ایسی حرکات کر رہا تھا تو بادشاہ کی چشم پوشی اس کی اعانت کے مترادف تھی۔ مجھے ہمورابی پر افسوس ہوا جو محض ایک دوشیزہ کے عشق میں مبتلا ہو کر اس کے باپ کی جان نہ حرکات برداشت کئے جا رہا تھا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ کم از کم آج وزیر مال کو کسی انسان کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔

نوجوان لڑکا کسی بیوپاری کی تلاش میں چند قدم دور گیا ہو گا کہ وہاں ایک موٹا تازہ کوڑا برادر آدمی اچانک کہیں سے نمودار ہوا اور ادھیڑ عمر ماہی گیر سے حکم بھرے لہجے میں کہا:

”چل بے اپنی مچھلیاں کنارے پر ڈھیر کرتا کہ میں لگان لگاؤں..... جلدی کر مجھے ابھی بہت کام ہیں.....“

”مائی باپ۔ آج تو صرف دس بارہ مچھلیاں جال میں آئی ہیں۔ اگر آپ آج کا لگان معاف فرما دیں تو میں انہیں بیچ کر نیا جال لے آؤں گا اور یوں کل سے زیادہ مچھلیاں پکڑنے کے قابل ہو جاؤں گا..... میرا جال بالکل پھٹ گیا ہے اس لیے.....“



”بکواس نہ کر۔ مچھلیاں نکال..... اس ادی لے لوراما ہی میرے سے پیدے پر زید زریا۔“  
 نے اپنے حرام ختم بیٹے کو بیوپاری کی تلاش میں روانہ کیا ہے تاکہ دھوکے سے مچھلیاں غائب کر سکو۔ میں اسے بھی مزا چکھاتا ہوں.....“  
 ”نہیں نہیں..... وہ بیچارہ تو پیشاب کرنے گیا ہے!“ اس نے سہم کر ہاتھ جوڑے اور پھر اپنا بدن سہلانے لگا جس پر کوڑے نے نشان ڈال دیا تھا۔  
 کوڑا بردار آدمی نے مچھلیاں نکلا کر گئیں اور اچھی اچھی مچھلیاں چھانٹ کر علیحدہ کر دیں۔ بچی کچھی مچھلیاں اس نے واپس کشتی میں پھینک دیں اور پھنکارتے ہوئے بولا۔  
 ”مزدور اٹھانے آرہا ہے۔ خبردار جو ایک مچھلی بھی ادھر ادھر کی تو.....“  
 یہ کہہ کر وہ ایک اور کشتی کی طرف بڑھ گیا جو ابھی ابھی کنارے آ کر لگی تھی۔ اس کے دور جانے کے بعد ماہی گیر بڑبڑانے اور آنسو بہانے لگا۔ وہ اسے بددعائیں دے رہا تھا۔ اس کا نوجوان بیٹا پلٹ آیا۔ وہ اندر سے کھول رہا تھا مگر وزیر مال کے کارندے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا.....  
 مجھے کوڑا بردار پر غصہ آ گیا۔ میں نے اسے سبق سکھانے کا ارادہ کیا اور اس کی طرف بڑھا۔ وہ دوسری کشتی کے قریب پہنچا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اسے اڑنگی لگائی۔ وہ لڑھک کر دریا کے کنارے پڑے ایک بھاری پتھر پر منہ کے بل گرا۔  
 ”ہائے مر گیا!“ اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی۔ اس کا منہ پتھر سے بڑے زور سے ٹکرایا تھا جس کے سبب اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور ناک سے خون جاری ہو گیا۔ وہ بری طرح ڈکارنے لگا۔ میں نے بمشکل ہنسی ضبط کی۔ ماہی گیروں کے چہرے خوشی سے متمتاٹھے تھے مگر وہ آگے بڑھ کر بظاہر ہمدردی سے اسے اٹھا رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ زیادہ چوٹ تو نہیں لگی۔ میں انہیں اسی حال میں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔  
 باغ عبور کر کے میں نے دائیں جانب کا رخ کیا۔ اس طرف بازار تھا۔ دکاندار دکانیں کھول چکے تھے اور روزمرہ کا کاروبار شروع ہو چکا تھا۔ کہیں مٹی کا ٹیچ اور کانسی کے برتن بک رہے تھے تو کہیں کپڑے کے تھان ڈھیر تھے۔ نانباٹیوں کی دکانوں پر صبح کا ناشتہ لینے والوں کا ہجوم تھا۔ وہ لمبے لمبے عجیب وضع کے نان لگا رہے تھے اور گوشت کی ہانڈیاں چولہوں پر چڑھا رکھی تھیں۔ مجھے بھوک ستانے لگی۔ میں ایک دکان میں داخل ہو گیا جہاں زمین پر کھجور کی چٹائی بچھی تھی اور چار آدمی اس پر براجمان ہو کر ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے درمیان گوشت کے سالن اور سبزیوں کی ترکاری کا طباق رکھا تھا اور بہت سے نان ڈھیر تھے۔ وہ بڑی رغبت سے طباق سے نوالے لے کر ناشتہ کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور بلا تکلف ناشتے میں شامل ہو گیا۔ آپ کو کیا بتاؤں اس چوری کے ناشتے کا کیسا لطف آیا۔ ایک تو سامان

خورد و نوش بے حساب تھا دوسرے وہ باہم خوش گپیوں میں مصروف تھے اس لیے انہیں بالکل پتہ نہیں چلا کہ کوئی پانچواں نادیدہ (بلکہ ندیدہ) شخص ان کے ناشتے پر ہاتھ صاف کر رہا ہے!  
 وہ تاجر تھے۔ ان میں سے ایک ترکمانی تھا ایک مصری ایک ایرانی اور ایک کا تعلق دمشق سے تھا۔ وہ اپنے سفری اور تجارتی تجربات بیان کر رہے تھے۔ سب نے دنیا گھوم رکھی تھی۔ ترکمانی تاجر جسے سب تیمور کہہ کر پکار رہے تھے ایک قصہ سناتے لگا:  
 ”دوستو! مجھے ایک مرتبہ تجارت کی غرض سے ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا بتاؤں کیسا پراسرار اور عجیب و غریب ملک ہے، خصوصاً بنگال جو اس کے مشرق میں واقع ہے حیرت انگیز حد تک فسوں کا رخطہ ہے۔ وہاں کا جادو سارے عالم میں مشہور ہے.....“  
 ”جادو تو خیر بابل کا بھی بہت مشہور ہے مگر تم آگے کہو.....“ مصر کے تاجر نے لب کشائی کی۔  
 ”ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میں نے ہندوستان کا سفر اختیار کیا تو بنگال سے میرا گزر ہوا۔ وہاں کے باشندے ایک دیوی کو پوجتے ہیں جسے کالی مائی کہا جاتا ہے۔ وہاں دریائے گنگی کے کنارے اس کا بہت بڑا مندر ہے جہاں اس کی بے حد بھیا نک مورتی نصب ہے۔“  
 ”کیا تم نے وہ مندر اور مورتی دیکھی ہے؟“ ایک ایرانی تاجر گوشت کی بڑی سی بوٹی بھنبھوڑتے ہوئے بولا۔  
 ”ہاں.....“ ترکمانی تاجر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ ایک پرانا اور بڑا مندر ہے جس کے سامنے کے رخ پر سنہرے اور نقرئی پتھر نصب ہیں اور اس کے طلائی کلس دور سے چمکتے نظر آتے ہیں۔ اس مندر کے وسط میں کالی دیوی کا مجسمہ نصب ہے جو میرے خیال میں دنیا کی بھیا نک ترین تخلیق ہے۔ کالی مائی کو ہندو لوگ بیک وقت موت، تباہی اور مامتا کی علامت گردانتے ہیں۔ ہاں تو میں اس مجسمے کے بھیا نک پن کا تذکرہ کر رہا تھا..... وہ چار ہاتھ اونچا ایک سنہرا نسوانی مجسمہ ہے جس کی تین آنکھیں اور چار ہاتھ ہیں۔ منہ کھلا ہوا اور سرخ زبان منہ سے باہر نکلی ہوئی۔ اس کے جسم پر دھات میں ڈھلے ہوئے سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔ وہ ایک لاش پر قفس کناں ہے اور گردن میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا پہن رکھی ہے۔ منہ اور سینے پر خون کے دھبے ہیں۔ اس کے چاروں ہاتھوں میں سے ایک میں خون آلود تلوار اور دوسرے میں کٹا ہوا انسانی سر ہے۔ باقی دونوں ہاتھ اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جیسے کسی حملہ آور کے خلاف مدافعت کرنا چاہتی ہو۔“  
 ”تم نے اس کے بھیا نک پن کی تصویر کشی خوب کی ہے۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے!“ دمشق کا تاجر ہنسنے لگا۔  
 ”ابھی تو میں نے تمہیں انسانی قربانی کے متعلق نہیں بتایا جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیوی کے



انسانوں کا گلا ہی کاٹا آیا ہے۔ درندوں اور جانوروں نے کبھی اپنے ہم جنسوں کو یوں ہلاک نہیں کیا جس طرح انسانوں نے اپنے ہم جنسوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے!

چاروں تاجر ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر مکے سے ایک کٹورا چھاپھ کا بھر کر چڑھایا..... بہت خوش ذائقہ شیریں اور ٹھنڈا تھا۔ اس کے بعد میں دکان سے باہر نکل گیا۔



میں بازار میں گھومتا رہا۔ ایک جگہ خوبصورت مرصع لباس بک رہے تھے۔ میں نے وہاں سے اپنے سائز کا ایک خوبصورت اور موسم کے حساب سے آرام دہ چوغا پار کر کے زیب تن کر لیا۔ جب میں محل میں پہنچا تو دھوپ خاصی پھیل چکی تھی۔ پہلے میں نے عاٹھ کی کوٹھڑی کا رخ کیا۔ اس پر قفل پڑا ہوا تھا۔ وہ غالباً اپنی روزانہ کی ڈیوٹی پر جا چکی تھی۔ میرے غائب ہو جانے کے بعد اس کا حال کیا ہوا ہوگا میں اس کا تصور کر سکتا تھا..... بہر حال میں نے ایوان خاص کا رخ کیا۔ راستے میں کئی خوش جمال و خوش خصال باندیاں ادھر سے ادھر بھاگتی دوڑتی دکھائی دیں۔ کئی تو ایسی تھیں کہ خواہ مخواہ دل میں گدگدی ہونے لگی مگر میں نے اپنے شوق کی لگامیں کھینچ کر رکھیں۔ چپون نے سچ کہا تھا۔ محل واقعی ایسا سحر انگیز تھا کہ کوئی بھی انسان واپسی کا راستہ بھول جاتا.....

ملکہ کی خواہگاہ کے باہر عاٹھ کو میں نے ایک فوارے کے پاس حسرت و یاس میں ڈوبا دیکھا۔ اس کی گود میں شراب کی ایک صراحی تھی اور وہ پاؤں پیارے بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ وہ میرے فراق میں آزرده بیٹھی تھی۔ جی چاہا اسے بانہوں میں بھر کر کہیں دور لے جاؤں۔

اسی اثناء میں پیتل کی ایک گھنٹی بجی اور وہ یوں ہڑبڑا کر اٹھی جیسے کسی نے اسے سپنے سے چونکا دیا ہو..... ملکہ نے اسے طلب کیا تھا۔ میں بھی اس کے ہمراہ ہولیا۔ خواہگاہ میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ملکہ مسہری پر نیم دراز ہے اور ایک منقش میز پر طلائی تھال میں انواع و اقسام کے پھل دھرے ہیں۔ عاٹھ نے شراب کی صراحی میز پر رکھ دی اور مودب کھڑی ہو گئی۔ ملکہ نے اسے بغور دیکھا اور بولی:

”طاچی سے جام نکالو.....“

اس دوران میں نے خواہگاہ کا تنقیدی جائزہ لیا۔ یہ ایک خاصا بڑا کمرہ تھا جس کی دیواریں چھت اور فرش نیلگوں پتھروں سے بنے ہوئے تھے اور ان میں یا قوت، لعل، زمرد اور زبرجد سے پھول بوٹے بنائے گئے تھے۔ جس مسہری پر وہ مصروف استراحت تھی اس کی ساخت بھی قابل دید تھی۔ قیمتی لکڑی پر نقری نقش کاری اور جواہرات سے مرصع مسہری کے پائے اژدہ کی شکل کے تھے جنہوں نے خوفناک انداز میں

استھان پر ہونی دیکھی۔ میں وہ منظر بیان کروں تو مہرا اٹھو!

”بس بس یار۔ ناشتہ کرنے دو۔“ مصری تاجر بول اٹھا۔

”نہیں، رعمس کے فرزند۔ میں یہ قصہ ضرور سناؤں گا۔ مرد بچے ہو۔ اگر تمہارا جی بھی متلاتا ہے تو اعتراف کر لو کہ عورت ہو!“

ترکمانی تاجر کی اس بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔ مصری تاجر جھل ہو گیا اور لقمہ توڑتے ہوئے بولا ”اچھا اپنا فضول قصہ جاری رکھو.....!“

ترکمانی تاجر نے سلسلہء کلام پھر سے جوڑا۔

”دوستو۔ کالی دیوی کی بھیٹ کا منظر میں نے اتفاقاً دیکھ لیا تھا۔ مندر کے احاطے میں ایک طرف لوگوں کا مجمع سا لگا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو انسانی بھیٹ چڑھانے آئے تھے۔ ان کے گاؤں پر کوئی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں لکڑی کی دو بالشت اونچی ایک چوکی ہے جس کے سامنے ایک جلاد کھڑا ہے۔ وہ کالا بھنگ نہایت مکروہ شکل کا تنومند آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر سفاکی اور بے رحمی تھی۔ اس نے ایک لنگوٹ باندھا ہوا تھا اور سر منڈوا رکھا تھا۔ اس کا بدن اور لنگوٹ خون آلود تھا۔ چہرے پر لہو کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ نہ جانے دن میں کتنی انسانی قربانیاں کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چوڑے پھل کی مختصر تلوار تھی۔“

اتنا کہہ کر ترکمانی تاجر نے قدرے توقف کیا اور مٹی کے مٹکے سے چھاپھ کا کٹورا بھر کر لبوں سے لگایا۔ کٹورا خالی کر کے وہ دوبارہ گویا ہوا:

”کچھ دیر بعد ایک طرف سے چند ہندو ایک بچہ پکڑے ہوئے آئے۔ اس کی عمر بمشکل سات آٹھ برس ہوگی۔ معلوم نہیں کس ممتا کی آنکھ کا تار تھا اور وہ پانی اسے کہاں سے پکڑ کر لے آئے تھے۔ بچہ بری طرح سہا ہوا تھا۔ میرے سامنے ظالموں نے اس کے ہاتھ پشت پر ایک رسی سے باندھے۔ اسی طرح پاؤں بھی باہم جوڑ کر باندھ دیئے اور اسے منڈھی پر اس طرح لٹا دیا کہ اس کا سر منڈھی سے باہر ہوا میں معلق ہو گیا اور گردن کنارے پر ٹک گئی۔ بھیٹ دینے والے سنسکرت زبان میں اشلوک پڑھنے لگے۔ پھر جلاد کی تلوار حرکت میں آئی اور بچے کا سر کٹ کر دور جا گرا! جلاد نے بچے کے کٹے ہوئے سر کو اٹھا کر اس سے ٹپکنے والا خون کانسی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں بھر دیا اور بھیٹ چڑھانے والے اس خون میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر اپنی پیشانیوں پر تک لگانے لگے.....!“

”بڑے گنوار ظالم اور جاہل ہیں یہ ہندوستانی!“ سب تاسف سے سر ہلانے لگے۔

میں دل میں سوچنے لگا ”ان کی بات غلط نہیں مگر ہر ایک نے ظلم و جہالت کے اپنے اپنے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ تاریخ میں کبھی بھی انسان بحیثیت مجموعی متمدن، مہذب اور رحمدل نہیں رہا۔ وہ اپنے جیسے



اپنے منہ واکر رکھے تھے اور ان کی آنکھوں میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ منہ میں یا قوت سرخ اور نیلم کا کام تھا۔ کمرے کے کونوں میں انواع و اقسام کے نوادر اور آرائشی ظروف دھرے تھے۔ ایک طرف مہین ریشمی پردے کے پیچھے طاق میں ایک مورتی نظر آئی تو میں بے اختیار اس کی طرف بڑھا اور پھر حیران و ششدر رہ گیا۔ وہ ہو ہو میری مورتی تھی!

سنگتراش صیدونی بہت بڑا فنکار تھا۔ چپون نے اس کے ذہن میں میری جوشبیہ بٹھائی تھی اس نے بعینہ اسے پتھر تراش کر مجسم کر دیا تھا اور یہ سب کچھ اس نے ایک رات میں کر دکھایا تھا۔

”کیا آپ نے آسمانی دیوتا قابوس کی پوجا کی؟“ عاٹیہ نے شراب صراحی میں انڈیلتے ہوئے ملکہ سے سوال کیا۔

”ہاں۔ ناصرف پوجا کی بلکہ اس کی نذر بھی مانی۔ اگر وہ میرے آنگن میں اترتا تو میں تمہیں آزاد کر دوں گی!“

عاٹیہ خاموش رہی۔

”کیا بات ہے تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“ ملکہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔ ملکہ عالیہ میں خوش ہوئی.....“ عاٹیہ نے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی۔

”نہیں..... میری آنکھیں دھوکا نہیں سکتیں۔ تم گم سم ہو۔ کوئی بات ایسی ضرور ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو؟“

”نہیں ملکہ معظمہ۔ آپ کے سر کی قسم کوئی خاص بات نہیں۔ بس سر میں ہلکا سا درد ہے۔ رات میں ٹھیک طرح سو نہیں سکی.....“

”اگر یہ بات ہے تو جا کر آرام کرو، شام کو آنا۔“

”جی بہتر۔“ عاٹیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ لو تھوڑی شراب پی لو۔ یہ تمہیں سکون دے گی۔“ ملکہ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا آدھا جام عاٹیہ کی طرف بڑھایا۔ عاٹیہ جھجکی اور یوں ملکہ کو دیکھنے لگی جیسے اسے اس عنایت پر یقین نہ آیا ہو۔

”میں..... آپ کے بلوریں جام میں؟“

”تو کیا ہوا تم بھی میری طرح انسان ہو.....“ ملکہ نے اپنائیت سے کہا۔

مجھے ملکہ کی اس ادا پر پیار آیا۔ ملکہ ہونے کے باوجود اس کے دماغ میں خناس نہیں تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی پر عاٹیہ نے شراب کا جام تھام لیا اور غنا غٹ چڑھا گئی۔ اس کے بعد وہ خواب گاہ سے نکل کر اپنی کوٹھڑی کی طرف چلی گئی۔ میں ملکہ کی خواب گاہ ہی میں رہا۔ اس نے دوسرا پیانا بھرا اور گھونٹ گھونٹ شراب حلق سے اتارنے لگی۔ کچھ دیر بعد تیز شراب کا نشہ اس کے سر پر چڑھنے لگا تو وہ اٹھ کر بہکے بہکے قدموں

سے چلتی ہوئی میری مورتی کے مقابل آکھڑی ہوئی اور مہین پردے کی ڈوری کھینچی۔ مورتی پوری طرح واضح ہو گئی۔

”اے میرے دیوتا تو کس قدر خوب رو ہے۔ کیسا خوبصورت بدن ہے تیرا اور تیرے وجود سے کیسا وقار کیسی تمکنت اور کیسا شباب جھلک رہا ہے!“ وہ آسمانی دیوتا قابوس کی مناجات پڑھنے لگی اور پھر فریاد کرنے لگی۔ ”میرے دیوتا۔ میرے آنگن میں اتر اور مجھے اپنی آغوش میں بھر لے۔ میں تیری باندی تیرے التفات کی منتظر ہوں۔ میں بے اعتنائی اور بے وفائی کا شکار ہوں۔ میرا سرتاج مجھے چھوڑ کر کسی اور کا دم بھرنے لگا ہے۔ اس نے مجھ پر پہرے بٹھا رکھے ہیں اور خود عیش پرستی کو دوست رکھتا ہے۔ کیا وہ خود بے وفا ہو کر مجھ سے وفا کا متمنی ہے؟ وہ ایسی توقع کیوں رکھتا ہے۔ مجھے شوق آوارگی نہیں مگر تیری محبت بھری آغوش ضرور درکار ہے۔ آہ! چالیس روز سے میرے سرتاج نے میرا بستر نہیں روندنا۔ میری مسہری کے گلاب سوکھ گئے اور خاروں میں بدل گئے۔ آ اور میری خواب گاہ میں اتر..... مجھے اپنے لمس سے سرفراز کر تاکہ تیرے لمس کی برکت سے میرا سرتاج واپس لوٹ آئے۔ میری گود ہری کر دے۔ مجھے شاداب کر۔ اے میری دیوتا۔ اے میرے قابوس!“

ملکہ کی خوبصورت غزالی آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار بہہ رہا تھا اور وہ ہلکے ہلکے کردعا کر رہی تھی۔ مجھے اس کے اشتہاء انگیز وجود پر پیار اور اس کی معصوم صورت پر ترس آ رہا تھا۔ میں نے ظاہر ہونے کا منتر پڑھا اور عقب سے اسے آواز دی۔

”تمہاری تمنا پوری ہوئی ملکہ صبور..... پلٹ کر دیکھ۔ تیری پشت پر تیرا مطلوب کھڑا ہے!“

اس نے چونک کر پیچھے دیکھا اور جیسے سکتے میں آ گئی۔ وہ گنگ تھی اور بے یقینی کے عالم میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے لب وا ہوئے۔

”ہاں..... یہ تم ہو۔ واقعی یہ تم ہو!“

”فکر نہ کرو ملکہ صبور۔ تمہیں تمہارا شوہر شہنشاہ ہمو رابی ضرور لوٹایا جائے گا..... آشتیا اور اس کا بندھن کبھی نہ ہو پائے گا۔“

”آہ! میرے دیوتا! تمہیں میرا دکھ خوب معلوم ہے۔ کیوں نہ ہو تم آسمانی دیوتا ہو سارا علم رکھتے ہو۔ میں تمہاری باندی ہوں۔ تمہاری پجارتن ہوں!“ یہ کہہ کر وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے سینے میں بھر لیا۔ وہ میرے سینے میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ اس کے وجود پر لرز اطاری تھا۔ میں نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں پر اٹھالیا۔ وہ پھول کی طرح نازک اور معطر تھی۔ میں نے ہولے سے اسے مسہری پر لٹایا تو اس نے اپنا آپ برضا و رغبت میرے سپرد کر دیا۔



حشر دیکھنے آئے تھے جس نے وزیر مال کے اہل کار سے بدتمیزی کی تھی اور اسے مطلوبہ لگان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر ان کے درمیان بیٹھا تھا۔ سب خوفزدہ سے تھے اور آپس میں سرگوشیوں میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایک نوجوان جو میرے ساتھ جڑا بیٹھا تھا اپنے دوست سے کہنے لگا۔

”یار خوف۔ بیچارہ تاجر بالکل جوان ہے۔ ابھی حال ہی میں اس کی شادی ہوئی ہے۔ آہ ازندگی کا حقیقی لطف اٹھانے کے دنوں میں اسے موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔“

”یار تگلات اس کی جوان بیوی پر کیا گزر رہی ہوگی.....؟“ دوسرے نے کہا۔

”دھیاری نے جب سے سنا ہے مسلسل رو رہی ہے۔ ہمارے ہمسائے میں ایک بزاز ہے اس کی بیٹی ہے۔ میری بہن اس سے ملنے گئی تھی اس نے بتایا ہے۔ وہ دیکھو۔ سامنے تماشائیوں کے انتہائی دائیں جانب بیٹھی ہے۔“ اس نے اشارہ کیا۔

میں نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں اپنی نظر دوڑائی تو مجھے بیس بائیس برس کی ایک نازک سی عورت نظر آئی جس نے سفید چادر میں اپنا بدن چھپا رکھا تھا۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ ایک بوڑھا سا مرد اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے تسلی بخشی دینے میں مصروف تھا۔ وہ غالباً اس کا والد یا سر تھا۔

پنڈال کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ زمین میں لگ بھگ سو فٹ قطر کا ایک بیس فٹ گہرا کنواں کھدوا ہوا تھا جس میں پانی نہیں تھا۔ اس میں ایک طرف قید خانے کا دروازہ تھا جس میں وہ نوجوان تاجر بند تھا جسے سزا کا مستحق سمجھا گیا تھا۔ دوسری دیوار میں ایک پنجرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا جس میں بھوکا شیر بند تھا۔ نوجوان اس شیر کو اور شیر اپنے ہونے والے شکار کو با آسانی دیکھ سکتا تھا۔ دونوں دروازے ایک خود کار لیور سے اوپر اٹھ جاتے تھے جسے پنڈال کی منڈیر پر بیٹھا ہوا ایک سرکاری کارندہ کھینچتا تھا۔ کنویں کے وسط میں ایک درخت کا اوپر سے دو شاخہ سوکھا تنا گاڑا گیا تھا جس کی چھال اتری ہوئی تھی اور اس کے اوپر والے حصے پر تیل مل کر اسے چکنا بنا دیا گیا تھا۔ کنویں کے ارد گرد تین فٹ کی منڈیر تھی اور چند گز دور اسٹیڈیم کی شکل کی سیڑھیاں بنائی گئی تھیں جن پر بیٹھ کر بابل کے عوام یہ خونی ڈرامہ دیکھا کرتے تھے جو اب اکثر اسٹیج کیا جانے لگا تھا۔ خواص کی تفریح ضیع کے لیے قدرے اونچی جگہ ایک الگ چبوترہ بنایا گیا تھا جس پر غالیچے بچھا کر آرام دہ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ خواص کی محافظت کے لیے درجن بھر فوجی سپاہی برہنہ شمشیروں سے لیس چوکنہ کھڑے تھے۔ شاہی مہمانوں کی معقول تعداد ان کرسیوں پر براجمان تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان کے سرخ و سپید چہروں، فربہ مائل جسموں اور اعلیٰ پوشاکوں سے میں نے غریب عوام الناس کا موازنہ کیا۔ ان کے پیلے سانولے مدقوق چہروں سے

چاہا اس استحصالی طبقے کو تہس نہس کر دوں جو ازل سے جو تک کی طرح غریبوں کا خون چوس کر پلتا اور ان پر ظلم ڈھاتا آیا ہے۔

سب کچھ تیار تھا۔ صرف ”مہمان خصوصی“ کا انتظار تھا۔ میں اس ذات شریف کا جلد از جلد دیدار کرنا چاہتا تھا جو بادشاہ کا وزیر مال ہو کر ایسا ظالم و جابر تھا۔ خدا نخواستہ اسے بادشاہت مل جاتی تو نہ جانے غریب رعایا کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ خواص کے چبوترے کے قریب ایک حبشی غلام سٹکھ لیے کھڑا تھا جو سمندری سیپ کا بنا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں اس راستے پر لگی ہوئی تھیں جدھر سے ”وی آئی پی“ کی آمد ہونے والی تھی۔ آخر دور سے دھول اڑتی دکھائی۔ غالباً وہ رتھ پر سوار ہو کر آ رہا تھا۔ حبشی غلام نے اس کی آمد کا اعلان کرنے کے لیے سٹکھ بجایا۔ سب لوگ مستعد ہو گئے۔ اسٹیج پر پچھی کرسیوں سے کچھ امراء وزیر مال کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر رتھ سنگی چبوترے کے عقب میں آ کر ٹھہر گیا۔ وہ ایک مرصع و منسج چوہی رتھ تھا جس پر سونے چاندی سے اعلیٰ کام کیا گیا تھا۔ اس کی چھت آج کل کی بگیوں سے خاصی مشابہت رکھتی تھی اور قیمتی زرباف اور اطلس کی بنی معلوم ہوتی تھی۔ سیٹیں نہایت آرام دہ اور گدلی تھیں اور ان پر پریشی غلاف چڑھے تھے۔ رتھ کے آگے جتے ہوئے گھوڑے جو تعداد میں چار تھے اس پر تازی و تیز گام تھے ان کی صحت اور جسامت قابل رشک تھی۔ خدا جانے انہیں مرے کھلائے جاتے تھے یا معجونیں۔ ان کی رقابیں اور سامان اعلیٰ چرم اور سونے چاندی کا تھا اور ان کے سروں پر سرخاب و ہما کے پر بصورت کلع سجائے گئے تھے۔

رتھ میں سے ایک کیم شیم شخص کہ قد اس کا بلا مبالغہ سات فٹ اور جسم چا پانی پہلوانوں جیسا تھا سپاہیوں کا سہارا لے کر اتر ا۔ اس کی پوشاک اعلیٰ رنگت سرخ و سپید اور شخصیت بہت رعب دار تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک مرصع عصا دیکھی جس پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت گوری چٹی اور غزالی آنکھوں والی دو شیزہ تھی جو نسوانی حسن میں یکتا اور نزاکت و تمکنت میں بے مثال تھی۔ وہ ایک عجیب نسوانی غرور آنکھوں میں سجائے وزیر مال کے ساتھ چل رہی تھی۔ سب کی نظریں اس قتالہ پر جمی ہوئی تھیں۔

”یہ کون ہے؟“ اس نوجوان نے جس کا نام خوف تھا اپنے دوست تگلات سے سوال کیا۔

”یہ اس کی بیٹی ہے آشتیا۔ اسی پر تو آجکل ہمو رابی لٹو ہے۔ اگلی ملکہ یہی ہوگی۔“

”ویسے ہے تو سہی ملکہ بننے کے قابل!“ دوسرے نے تعریفی انداز میں کہا۔

”اچھا تو یہ ہے ملکہ کی سوکن۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا اور اس کے سراپے کا بغور جائزہ لینے لگا۔

وہ حد درجہ حسین تھی۔ میرا جی چاہا اسے قریب سے دیکھوں چنانچہ میں اٹھا اور لوگوں کو پھلانگتا خواص کے



کانوالہ بن جائے گا۔ وہ ان خوش بختوں میں سے ہرگز نہ لگتا تھا جو دوشاخے پر چڑھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

یہ کھیل جاری تھا کہ مغرور اور حسین آشتیا نے اپنے باپ سے خواہش ظاہر کی وہ یہ منظر قریب سے دیکھنا چاہتی ہے۔ باپ نے لاڈلی بیٹی کی معصوم خواہش رد کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے لے کر کنویں کی منڈیر کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ اسی لمحے مجھ پر بابل کے غریب غرباء اور مظلوموں کی آہوں کے اثر سے عجیب وحشت سی طاری ہوئی اور میں آن واحد میں اس ظالم شخص کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے لیے میرا ایک زوردار دھکا کافی تھا۔ وہ ایک دھماکے سے کنویں کے اندر جا گرا۔ پنڈال اس کی دلدوز چیخوں سے گونج اٹھا!

☆.....☆.....☆

چوتھے کی طرف بڑھنے لگا۔ بالآخر میں اس کے پہلو میں پہنچ گیا اور جی بھر کے اسے ہر زاویے سے دیکھا۔ اس کی خوبصورتی میں کوئی کلام نہ تھا مگر بے حد مغرور تھی جو حسین لڑکیوں کی خامی ہوتی ہے۔ نہ جانے وہ اسے اپنی خوبی کیوں سمجھتی ہیں۔ میں نے اپنے شباب اور اس کے نسوانی حسن و جو بن کی قسم کھا کر تہیہ کیا کہ اس کا فرہ کا غرور بھی ضرور خاک میں ملاؤں گا۔

مہمان خصوصی کی تواضع اعلیٰ قسم کی شراب سے کی گئی۔ دیگر معزز مہمانوں کو بھی مشروبات پیش کئے گئے جس کے بعد ایک شخص نے جو ”اسٹیج سیکریٹری“ کے فرائض سرانجام دے رہا تھا ”تقریب“ کے آغاز کی اجازت طلب کی۔ اسے اجازت مرحمت فرمادی گئی۔

پہلے ایک کاہن نے آسمانی دیوتا مردوک اور عشتر دیوی کی مناجات پڑھی جسے حاضرین نے سر جھکا کر مؤدب انداز میں سنا۔ اس کے بعد اسٹیج سیکریٹری کھڑا ہوا اور اس نے مختصر انو جوان تاجر کے جرم کی نوعیت بیان کی اور خوشامدی لہجے میں وزیر مال کی تعریف کرتے ہوئے اس کے ان اقدامات کو سراہا جس کی بدولت بابل کے طول و عرض میں قانون مالیات پر موثر عمل درآمد ممکن ہو رہا تھا..... جب اسٹیج سیکریٹری خاموش ہوا تو اس کا رندے نے جو لیور کھینچنے پر مامور تھا ایک جھٹکے سے لیور کھینچ دیا۔ اسی لمحے سفید چادر میں لپیٹی ہوئی اس عورت کی چیخ بلند ہوئی جو نو جوان تاجر کی بیوی تھی۔ وہ پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر کنویں کی طرف دیکھنے لگے۔

میں نے دیکھا جو نہی قید خانے کا دروازہ خود کار طریقے سے اوپر اٹھا، نو جوان تیزی سے باہر نکلا اور اچھل کر درخت کے اس تنے پر چڑھنے کی کوشش کی جو کنویں کے وسط میں گاڑا گیا تھا۔ خواص کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تنازندی اور موت کے اس کھیل میں محض دلچسپی کا عنصر پیدا کرنے کے لیے گاڑا گیا تھا۔ جس مجرم کو بھی بھوکے شیر کے سامنے ڈالا جاتا، وہ اس تنے پر چڑھ کر جان بچانے کی کوشش کرتا تھا، مگر چونکہ اس پر تیل ملا گیا تھا اس لئے چکناہٹ کے سبب وہ اوپر پہنچ کر بار بار پھسلتا اور نیچے کی طرف سفر کرتا، جہاں بھوکا شیر اسے پھاڑ کھانے کے لیے منتظر ہوتا تھا۔ اس کی خوف میں ڈوبی چیخوں اور بھوکے شیر کی غراہٹ سے ناظرین جو لطف اٹھاتے تھے وہی اس خوبی ڈرامے کا حاصل تھا۔ دس میں سے ایک مجرم ایسا ہوتا تھا جو کسی نہ کسی طرح دوشاخے تک پہنچ جاتا اور اوپر چڑھ کر بیٹھ جاتا۔ اس خوش بخت کی جان بخشی کر دی جاتی تھی، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اسے مردوک نے امان دی ہے!

نو جوان تاجر تنے کے اوپر والے حصے سے پہلی بار پھسلتا تو بھوکا شیر اس کی طرف لپکا اور اچھل کر اسے پکڑنے کی کوشش کی، مگر بھاری بھر کم شیر کے نیچے اس تک نہ پہنچ سکے۔ وہ اپنے ہی زور پر دھم سے زمین پر گرا تو ناظرین نے تالیاں اور سیٹیاں بجا کر شیر کی بھداڑائی۔ اب یہ عمل بار بار دہرایا جانے لگا۔ ایک دفعہ مجھے ایسے لگا جیسے نو جوان تنے پر اپنا توازن اور گرفت برقرار نہ رکھ سکے گا اور شیر





شیر خدا جانے کتنے دنوں کا بھوکا تھا کہ اس نے لمحہ بھر میں وزیر مال کو پھاڑ کھایا۔ یا ممکن ہے اس جیسا صحت مند اور مزیدار گوشت اسے کبھی کھانے کو نہ ملا ہو۔ وہ تو آج تک غریب غرباء کو ہی کھاتا آیا تھا۔ آشتیا اس منظر کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئی تھی اور میرے قدموں میں پڑی تھی مگر میں اسے اٹھا نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی اس سے زیادہ مجھے نوجوان تاجر کی فکر تھی جو اب بھی درخت کے تنے سے چپکا ہوا دوشانے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی مدد کرنے کے لیے کنویں میں اترنے کا فیصلہ کیا اور منڈیر سے لٹک کر کنویں میں کود گیا۔ اس کے بعد میں تنے کی طرف بڑھا اور نوجوان تاجر کے دونوں پاؤں کو اپنی ہتھیلیوں پر لٹکا کر اسے سہارا دیا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت کی پرچھائیں لہرائی۔ وہ دزدیدہ نگاہوں سے اپنے پاؤں دیکھ رہا تھا کہ وہ کس نادیدہ شے پر ٹکے ہوئے ہیں، مگر پھر اس نے اسے غیبی امداد سمجھ کر فائدہ اٹھانے کا سوچا اور تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ میں نے اپنے مضبوط بازو سے اسے اوپر بلند کر کے اسے دوشانے تک پہنچنے میں مدد دی۔ بالآخر وہ دوشانے پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

عام حالات میں اس کی اس کامیابی پر عوام الناس نعرہ زن ہو جاتے، مگر پورے پنڈال میں ایسی افراتفری مچی ہوئی تھی جیسے وہاں کسی نے سانپ چھوڑ دیئے ہوں۔ اب لوگوں کی کثیر تعداد کنویں کی منڈیر کے ساتھ آکھڑی ہوئی تھی۔ شور ایسا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سپاہی بھی چیخ چلا رہے تھے اور باہر سے شیر پر نیزے پھینک رہے تھے۔ ایک نیزہ شیر کے پیٹ میں لگا تو وہ خوفناک انداز میں دھاڑا۔ پھر وہ لاش گھیٹ کر اپنے پنجرے میں لے گیا تاکہ اطمینان سے کھا سکے اور اس شور شرابے اور نیزہ بازی کی مشق سے بچ سکے۔ جونہی وہ پنجرے میں داخل ہوا، سرکاری اہلکار نے لیور کھینچا اور پنجرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

نوجوان تاجر کی بیوی منڈیر سے قریب پہنچ گئی تھی۔ اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ وہ کبھی ہنستی، کبھی روتی تھی اور دور سے ہاتھ بڑھا کر اپنے خاوند کو باہر کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں مردوک و عشتار کی قسم بالکل ٹھیک ہوں!“ نوجوان تاجر اپنی بیوی کو تسلی دے رہا تھا ”دیکھو صبر کرو۔ کہیں بے تابی میں کنویں میں نہ گر جانا۔ لمحوں کی بات ہے۔ میں تمہارے پاس ہوں گا!“

ہے۔ انہوں نے تمہیں نئی زندگی بخشی ہے“ وہ رو رہی تھی، چلا رہی تھی اور خوشی سے تالیاں بجا رہی تھی۔ میرے دل نے دونوں کو خوش دیکھ کر قرار پکڑا۔ یہ کام کر کے مجھے کیسی روحانی خوشی ہوئی تھی میں اسے لفظوں کا لبادہ نہیں پہنا سکتا۔

آخر ہجوم جھٹکنے لگا۔ چند امراء اور اہلکار بے ہوش آشتیا کو رتھ میں ڈال کر لے گئے۔ وہ بادشاہ کی چہیتی محبوبہ تھی۔ اسے کچھ ہو جاتا تو وہ یقیناً سب کی کھالوں میں بھس بھر دیتا۔ کسی نے باہر سے بانس کی ایک سیڑھی کنویں میں اتاری۔ نوجوان تاجر تنے سے نیچے اتر اور سیڑھی کے ذریعے کنویں سے باہر آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی تھا۔ دونوں میاں بیوی و فور جذبات سے ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ گئے۔ میں نے انہیں پیار بھری نظروں سے دیکھا اور اس ہجوم کا حصہ بن گیا جو واپس شہر کی سمت جا رہا تھا۔



بابل میں وزیر مال کی موت پر تین روز کے سرکاری سوگ کا اعلان کیا گیا۔ بادشاہ تمام شاہی آداب کو بالائے طاق رکھ کر اپنی محبوبہ کی دلجوئی میں مصروف تھا جو شاہی طبیبوں کے زیرِ علاج تھی۔ اسے بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

بادشاہ نے اس ناگہانی حادثے کی تحقیقات کے لیے ایک انکوائری کمیٹی بٹھادی تھی جسے حکم دیا گیا تھا کہ تین روز کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرے تاکہ ذمہ داروں کو قرار واقعی سزا دی جاسکے! میں اس انکوائری پر ہنسنے کے سوا کیا کر سکتا تھا!

رات نے اپنے پر پھیلانے تو میں ایک بار پھر ملکہ صبور کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ جونہی میں ظاہر ہوا وہ بیتابی سے میرے سینے سے لگ گئی۔

”تم کہاں چلے گئے تھے میرے دیوتا! صبح آنکھ کھلی تو تمہیں اپنے پہلو میں نہ پا کر میرا جو حال ہوا وہ میں ہی جانتی ہوں۔ میں سمجھی مجھ سے کوئی تقصیر ہوگئی جس کے سبب دیوتا مجھ سے ناراض ہو گیا!“

”نہیں نہیں۔ تم بہت پیاری اور اچھی ہو۔ تمہارا دیوتا تم سے کبھی خفا نہیں ہو سکتا!“

”تو پھر تم کیوں اور کہاں چلے گئے تھے؟“ وہ مجھ سے الگ ہو کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں میرے لئے بیکراں عقیدت، محبت اور اپنائیت تھی۔

”میں ایک ظالم کو جہنم واصل کرنے گیا تھا جس نے بابل کے عوام کا استحصال شروع کر رکھا تھا اور انہیں بھیا نک سزائیں دے کر لطف اٹھاتا تھا!“

اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ متلاطم سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”کک..... کیا وزیر مال سیفون کو بھوکے شیر کے سامنے تم نے پھینکا تھا؟“



ہاں بھور..... اس کا ہاتھ روکے کی سب سے، ہر صورت میں ہو گی۔ یا میں سے روتے  
 قدم اٹھایا؟“  
 ”کسی آسانی دیوتا کا کوئی عمل غلط کیسے ہو سکتا ہے قابوس“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔  
 وہ کسی سوچ میں گم تھی۔ میں نے پیار سے اس کی دراز زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کیا  
 سوچ رہی ہو؟“

”کیا میرا دیوتا نہیں جانتا؟“ اس نے اُلٹا سوال کیا۔ میں لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا گیا۔ پھر سنبھل کر کہا۔  
 ”دیوتا سب جانتا ہے، مگر وہ اپنی داسی کے منہ سے سننا چاہتا ہے!“  
 ”میں سوچ رہی تھی کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم وزیر مال سیفون کی بجائے اس کی نک چڑھی بیٹی آشتیا کو  
 کنویں میں دھکیل دیتے۔ خس کم جہاں پاک والا معاملہ ہو جاتا.....“  
 ملکہ صبور کے سر پر رقابت کا بھوت سوار تھا۔ وہ حسد کی آگ میں اس حد تک جل رہی تھی کہ سوائے  
 آشتیا کو راستے سے ہٹانے کے اسے کچھ اور نہیں سوچ رہا تھا۔  
 ”تم خاموش کیوں ہو گئے دیوتا۔ کیا میری بات ناگوار گزری؟“  
 ”نہیں صبور۔ میں تمہارے جذبات و احساسات خوب سمجھتا ہوں، مگر فی الوقت ایسا کرنا مناسب  
 نہیں تھا۔“ میں اسے کیا بتاتا کہ میں تو خود اس قتالہ کے عاشقوں کی فہرست میں نام لکھوا چکا تھا!  
 ”چلو پھر سہی۔ لیکن تمہیں اس ناہنجار کو میرے راستے سے ہٹانا ہوگا۔ تم مجھے اس عورت سے نجات  
 دلانے کے لیے ہی آسمان سے آئے ہونا؟“ وہ بچوں کی طرح پوچھنے لگی۔  
 ”تمہیں صرف اس امر سے دلچسپی ہونی چاہیے کہ تمہارا سرتاج شہنشاہ ہمورابی صرف تمہارا بن کر  
 رہے۔ صرف تمہارے نام کی مالا چپے۔ سوچو۔ تم کس کس کی جان لوگی؟ یہاں تو ایک سے ایک حسینہ  
 موجود ہے۔ آشتیا لقمہء اجل بن گئی تو کوئی اور آشتیا جنم لے لے گی۔ کیا تم بادشاہوں کے مشاغل سے  
 آگاہ نہیں ہو؟“

میری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر مردہ آواز میں بولی۔  
 ”اصولی طور پر تمہاری بات درست ہے میرے دیوتا۔ مگر جب تک وہ حرافہ زندہ ہے بادشاہ میری  
 طرف ملتف نہیں ہوگا۔ کم از کم تم اسے تو راہ سے ہٹادو۔ ویسے بھی آج کل وہ بیمار اور اطباء کے زیر علاج  
 ہے۔ کوئی غلط دوا کوئی زود اثر زہر اس کا کام تمام کر سکتا ہے.....“

”میرے لئے یہ باتیں ہاتھ کا کھیل ہے صبور۔ لیکن سوچ لو باپ کی ناگہانی موت کے بعد اگر چند  
 ہی دنوں میں اس کی بیٹی بھی زہر خورانی سے ہلاک ہو گئی تو بہت سے سوال اٹھیں گے۔ سب سے زیادہ  
 شک تم پر کیا جائے گا، کیونکہ تفتیش کا بنیادی اصول یہی ہے کہ سب سے پہلے اس شخص پر شبہ کیا جاتا ہے

جسے مقتول کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہو.....“  
 ”میں نے اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا دیوتا.....“ وہ خفت سے بولی۔  
 ”غور کیا کرو۔ اس ننھی سی کھوپڑی میں جو دماغ ہے اس کو استعمال کیا کرو۔“ میں نے اس کے سر پر  
 چپت لگائی اور پھر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

☆.....☆.....☆

بابل میں مجھے پندرہ روز گزر چکے تھے۔ میری ہر شب، شبِ برات تھی اور ہر دن گویا عید کا دن۔ وزیر  
 مال کے تین روزہ سوگ کے بعد روزمرہ کے معمولات دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر آ گئے تھے۔ میں حالتِ غیب  
 میں امراء کی رقص و سرود کی محافل، عوام کی مجالس اور تجارت کی کتھا منڈیوں میں شریک ہوتا۔ رات کے وقت  
 میں ملکہ صبور کے محل میں چلا جایا کرتا جہاں کئی خوبصورت لونڈیوں کو میں نے اپنے دامِ الفت میں پھنسا لیا  
 تھا۔ سب مجھے آسانی دیوتا قابوس سمجھتی تھیں۔ میں نے انہیں جس طرح ”قابو“ کیا تھا اس لحاظ سے  
 ”قابوس“ سے زیادہ معنی خیز نام کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا!

آخر میں نے ایک روز آشتیا کو بھی اپنے جال میں پھانس لیا۔  
 شہر کے مغرب میں دریائے فرات کے کنارے ایک محل تھا جسے نئی آرائش و تزئین کے بعد ہمورابی  
 نے آشتیا کو عطا کر دیا تھا اور وہ درجن بھر لونڈیوں کے ساتھ وہاں اٹھ آئی تھی۔ اس کی طبیعت مملکت کے  
 بہترین اطباء کے علاج، مقوی و مفرغ غذاؤں اور بادشاہ کی دلجوئی کے سبب پوری طرح بحال ہو گئی تھی۔  
 اس روز میں اس کے محل میں تھا جب اس نے اپنی خاص لونڈی ندا سے کہا:

”ندامیرا دریا کے شفاف و نخبستہ پانی میں نہانے کو جی چاہ رہا ہے.....“  
 ”یہ تو بہت خوش آئند بات ہے آشتیا رانی۔ کیا میں آپ کے ساتھ چلوں؟“  
 ”نہیں..... میں تنہا پیرا کی کروں گی۔“ اس نے جواب دیا۔

”جو حکم آشتیا رانی..... مگر یہ بندی آپ کی سلامتی کے بارے میں فکر مند رہے گی۔ میرے منہ میں  
 خاک۔ اگر کوئی حادثہ پیش آ گیا تو میں ہرگز خود کو معاف نہ کروں گی!“  
 ”میں تمہاری محبت اور فکر مندی کی قدر کرتی ہوں، مگر میں کسی کا ساتھ گوارا نہیں کروں گی۔ رہا معاملہ  
 حادثے کا تو تجربے نے یہی سکھایا ہے کہ محافظوں کی پوری فوج بھی کسی حادثے کو روک نہیں سکتی۔ وہ  
 وقوع پذیر ہو کر رہتا ہے!“

”رانی درست کہتی ہیں!“ ندا نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”میں آپ کا پیرا کی کا لباس تیار کرتی ہوں۔“

محل کے ایک حصے سے سنگ مرمر کی سیڑھیاں دریا تک جا رہی تھی جہاں ایک چبوترہ تھا۔ دریا کے



ایک دھارے کا رخ منور کر اسے نہر کی شکل میں وہاں لایا گیا تھا۔ جس کی چوڑائی ڈیڑھ سو فٹ کے لگ بھگ ہوگی۔ دوسرے کنارے پر سنگ مرمر کی بارہ دری تھی اور اس میں سنگی بیچ ایستادہ تھے تاکہ کوئی تیرتا ہوا دوسرے کنارے چلا جائے تو گھڑی دو گھڑی ان بچوں پر بیٹھ کر سستالے۔ چبوترے پر ایک سمت چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ جنہیں لباس بدلنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ بندان کمروں میں سے ایک میں داخل ہوئی جو نسبتاً بڑا تھا اور غالباً صرف رانی کے استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے تجسس تھا کہ دیکھوں اس کمرے میں کیا ہے؟ آشتیا کسی کام سے اپنی خوابگاہ کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کی باندی اس کے لیے پیرا کی کالباس نکال رہی تھی۔ یہ باریک ریشمی کپڑے کا بلاؤز اور زیرجامہ تھا جسے بہت خوبصورت انداز میں تیار کیا گیا تھا۔ اس میں کسی کا نسوانی حسن پوشیدہ تو کیا رہتا پہلے سے بھی زیادہ ہیجان خیز انداز میں خود کو ظاہر کرتا۔ یعنی صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والا معاملہ پیش آ جاتا! میں جس کمرے میں تھا وہ بالکل چوکور تھا۔ ایک طرف آرام دہ کرسی اور مسہری کی درمیانی صورت کا کوچ بچھا ہوا تھا۔ اس پر ناریل کی چھال کا گدا تھا جس پر نفیس چمڑے کا کور تھا۔ نیچے سلیر رکھے تھے۔ ایک طرف لکڑی کی منقش الماری۔ اس جس میں تین دراز تھے۔ اس کے قریب سنگھار میز تھا جس پر انواع و اقسام کی خوشبوئیاں، تیل اور صابن رکھے ہوئے تھے۔ ایک دیوار گیر کھونٹی پر بدن خشک کرنے کے لیے تو لیے سے مشابہہ کپڑا لٹک رہا تھا۔ میں مسکرانے لگا۔ گویا قدیم زمانے سے خواتین کا پسندیدہ کلر پنک ہی تھا!

باہر قدموں کی چاپ سنائی دی تو بندا باہر لپکی۔ آشتیا آہنچی تھی۔ چند لمحوں کے بعد دونوں اندر داخل ہوئیں۔

”سب چیزیں تیار ہیں رانی۔ زیتون کا تیل، بصری صابون، عرق گلاب اور آپ کا پیرا کی کالباس۔“

نبدانے فہرست گنوائی۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تم اب جاؤ میں خود دیکھ لوں گی۔“ آشتیا نے جواب دیا۔

نبدان چلی گئی تو وہ اپنا معمول کا لباس اتار کر پیرا کی کالباس پہننے لگی۔ میں کوچ پر نیم دراز سے اس آفت انگیز مرحلے سے گزرتے دیکھتا رہا۔ اس کا نسوانی حسن اور جو بن قیامت خیز تھا۔ بادشاہ یونہی اس کا دیوانہ نہیں ہو گیا تھا۔ میرے رگ و پے میں اس ہیجان خیز نظارے نے خون کی گردش تیز کر دی تھی۔ میں خود کو کیسے تھامتا؟ آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ خود کو کسی نادیدہ وجود کی گرفت میں پا کر اس کی چیخ نکلنا ایک فطری بات تھی مگر میرے ہونٹوں نے اس کے منہ پر قفل لگا دیا۔

”کک..... کون.....“ چھوڑ دو مجھے..... اس کے حلق سے گھٹی گھٹی دہشت زدہ آواز نکلی۔

”میں..... آسمانی دیوتا قابوس۔ تمہارا چاہنے والا!“ میں نے اس کے ریلے ہونٹوں کا رس کشید کرتے

”مم..... میں بادشاہ کی امانت ہوں۔ ہمورابی کی ہونے والی ملکہ ہوں۔“ وہ ملتچی لہجے میں بولی۔

”مم..... مجھے چھوڑ دو۔“

”ہم خود آسمانی بادشاہ ہیں۔ ہماری نگاہ میں زمینی بادشاہ پر کاہ کے برابر حیثیت نہیں رکھتے۔ وقتی طور پر اسے بھول جاؤ۔ تمہیں اپنی قسمت پر نازاں ہونا چاہیے کہ آسمان کا بادشاہ..... ایک دیوتا تمہیں اپنے وصل سے سرفراز کرنے آیا ہے۔ لگتا ہے کاہنوں سے تم نے کچھ نہیں سیکھا اور مذہب کو تم کوئی حیثیت نہیں دیتیں۔ یہ تو دیوتاؤں کے غضب کو بھڑکانے والی باتیں ہیں! آج تک دیوتاؤں کو ناراض کرنے والا کوئی انسان ان کے عتاب سے نہیں بچا۔ دیکھو تمہارے باپ نے لوگوں پر ظلم ڈھا کر دیوتاؤں کو ناراض کیا تھا تو اس کا کیسا برا حشر ہوا۔ ہم نے اسے بھوکے شیر کا نوالہ بنا ڈالا۔ اگر تم اپنی جان بچانا چاہتی ہو تو تمہیں ایک آسمانی دیوتا کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔“

وہ سہم گئی۔ مردہ آواز میں بولی۔ ”ٹھیک ہے میں تمہاری خواہش پوری کروں گی مگر میرے اطمینان کے لیے پہلے خود کو انسانی شکل میں میرے سامنے ظاہر کرو۔“

میں نے اسے چھوڑ دیا اور منتر پڑھ کر اس کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”تم..... تم تو واقعی کوئی دیوتا لگتے ہو۔“ بالآخر اس نے لب کشائی کی۔

”لگتا نہیں ہوں.....“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”تمہارا عقیدہ مضبوط نہیں ہے۔“

”مجھے معاف کر دو دیوتا..... میں تمہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی۔“

”تو آؤ مجھے راضی کرو.....“ میں نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر کوچ کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔



اب ان حسیناؤں کی فہرست میں آشتیا کا بھی اضافہ ہو گیا جو میری خاطر دنیا کی ہر نعمت کو لالت مارنے پر آمادہ تھیں۔ آشتیا تو بر ملا ہمورابی کو بڈھا اور جوانی کے خزینے سے تہی دست فقیر گردانے لگی تھی اور میرے ساتھ دریا میں نہاتے ہوئے چہلیں کرتی تھی۔ میرے وصل نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ وہ اکثر کہتی۔ ”مجھے یہاں سے دور اپنی آسمانی دنیا میں لے جاؤ میرے دیوتا! میں اب اس فانی دنیا میں مزید ایک دن بھی نہیں رہنا چاہتی۔“

باپ کی ناگہانی موت کے بعد وہ یوں بھی تنہا ہو گئی تھی اور دنیا کی بے ثباتی کو آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ میں نے بھی اس کی خوب برین واشنگ کی۔ میں نے کہا:



”دیکھو ایسے بادشاہ کا پہلو گرمانے کا کیا فائدہ جو سینکڑوں لونڈیوں کا حرم رکھتا ہے اور عورت کو محض دل بہلانے کا سامان سمجھتا ہے۔ جو کسی ایک عورت سے محبت کرنے کا قائل ہی نہیں۔ اس نے پہلے صبوراً کو محبت کے دام میں پھنسا کر اپنی ملکہ بنایا۔ تب وہ خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت خاتون سمجھ رہی ہوگی اور اب اسے بچ منجھار میں چھوڑ کر تمہیں حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ کل تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔ میں تم پر انکشاف کروں؟ صبوراً تمہاری جان لینے کے درپے ہے کسی روز وہ تمہیں زہر کھلا کر مروادے گی۔ یہ رقابت اور حسد سے لتھڑا ہوا ماحول تمہارے لئے کس فائدے کا؟ اس سے تو کہیں بہتر ہوگا تم کسی ایسے جواں مرد کی بیوی بن جاؤ جو صرف اور صرف تمہارا ہو۔ جو تم سے بے لوث محبت کرے اور صرف تمہارے ناز اٹھائے۔ ٹھیک ہے وہ تمہیں اطلس و حریر کے لباس نہ پہنا سکے گا اور مرغن غذائیں نہ کھلا سکے گا مگر اپنی حیثیت کے مطابق تمہاری ضرورتوں کا خیال تو رکھے گا۔ تمہیں آسودہ ازدواجی زندگی کی راحتیں تو بہم پہنچائے گا!“

میری باتوں کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا اور میں نے صاف محسوس کیا کہ آہستہ آہستہ وہ شاہی محل کی زندگی سے بے زار ہونے لگی ہے۔ اس دوران جب بھی بادشاہ اس سے ملنے آیا اس نے ناسازی طبع کا بہانہ کر کے اسے ٹال دیا..... ہمورابی حیران تھا کہ وہ تو بھلی چنگی ہوگئی تھی پھر اچانک اسے کیا ہو گیا ہے۔ کسی کے مشورے پر اس نے جادو گروں کا ایک بہت بڑا مقابلہ رکھا تا کہ آشتیا کا دل بہلایا جاسکے۔ باہل جادو کا گڑھ تھا۔ وہاں جادو گروں کی کیا کمی تھی۔ کچھ ساحر قریبی شہروں سے بھی بلا لئے گئے اور یوں شاہی محل کے باہر ایک وسیع میدان میں جہاں سپاہ کی سالانہ پریڈ ہوتی تھی جادو گروں کا مقابلہ منعقد ہوا جس کا احوال میں بیان کرتا ہوں:

مذکورہ میدان میں کل تیس جادو گر اترے جو سب جادو گروں کے استاد تھے۔ ان میں زیادہ تر بوڑھے تھے اور ان کی شکلیں بے حد ڈراؤنی اور حلیے عجیب و غریب تھے۔ کسی نے لمبی لٹوں کے ساتھ ریش دراز کر رکھی تھی اور گردن میں منکوں کی ان گنت مالائیں تھیں۔ کسی نے مونچھیں داڑھی سر کے بال حتیٰ کے کھنویں تک منڈوا رکھی تھی اور دونوں بازوؤں میں طلائی کنگن اور انگلیوں میں زمرہ یا قوت، نیلم یا عقیق جڑی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ کسی نے لمبا چوغہ زیب تن کر رکھا تھا تو کسی کا لباس جوکروں سے مشابہہ تھا۔ ایک حبشی ساحر کے کندھے پر چھوٹا سا بندر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک نے ہاتھ پر صحرائی الو بٹھا رکھا تھا اور ایک نے بڑا سا سانپ گردن میں لٹکایا ہوا تھا۔

سب سے پہلے ایک گنجا جادو گر تماش بینوں پر اچھتی نگاہ ڈالتا آگے بڑھا اور بادشاہ کے سامنے رکوع کی شکل میں جھک کر اجازت طلب کی۔ بادشاہ نے سر کی جنبش سے اجازت مرحمت فرمائی اور پہلو میں بیٹھی ہوئی مغموں و اداس آشتیا سے کہا:

”دیکھنا یہ لیسا کمال کا سحر دکھائے گا۔ میرا پسندیدہ ترین ساحر ہے!“

آشتیا منہ سے کچھ نہ بولی، بیزاری سے جادو گر کی طرف دیکھتی رہی۔ جادو گر نے اپنی بوری سے ایک حنوط شدہ مرغ نکالا اور حاضرین کے سامنے ملاحظہ کے لیے پیش کیا۔ پھر اسے ایک میز پر ٹکا کر منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھا اور اس پر پھونک دیا۔ مرغ جادو کے اثر سے بالکل زندہ مرغ کی طرح بانگیں دینے لگا۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر جادو گر کو داد دی۔ اس کے بعد جادو گر نے بوری سے ایک رسی نکالی اور سب کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر بار بار دکھایا کہ وہ رسی ہی ہے اور کچھ نہیں۔ پھر اس نے رسی زمین پر پھینکی تو وہ سانپ بن کر دوڑنے لگی۔ اس طلسم کے بعد اس نے جیب سے شیشے کی گولیاں نکالیں اور انہیں میدان میں پھینکا تو وہ زہریلے پچھو بن کر حاضرین کی طرف لپکے۔

”رُک جاؤ.....!“ جادو گر نے انہیں ڈانٹا تو پچھو اچھے بچوں کی طرح اس کا کہا مان کر واپس لوٹ گئے اور اس نے انہیں دوبارہ کانچ کی گولیوں کی شکل دے کر جیب میں ڈال لیا۔

بادشاہ ہمورابی محظوظ ہوا اور آشتیا کی طرف دیکھتے ہوئے تالیاں بجانے لگا، مگر اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔

”اچھا اس جادو گر کے کرتب دیکھو۔“ وہ ایک بوڑھے جادو گر کی طرف اشارہ کرنے لگا جس نے ہاتھ پر صحرائی الو بٹھا رکھا تھا۔

وہ جادو گر آیا تو سب سے پہلے اس نے ایک چھری سے اپنے الو کو ذبح کیا اور اس کی گردن تن سے جدا کر دی۔ ناظرین نے الو کے خون کے قطرے زمین پر ٹپکتے دیکھے۔ جادو گر نے اس کے بعد گوند لگا کر الو کی گردن دوبارہ تن کے ساتھ جوڑی اور اسے ہوا میں اچھال دیا۔ حیرت انگیز طور پر الو فضا میں پرواز کرنے لگا اور جا کر شاہی محل کے برج پر بیٹھ گیا۔

”اب میرا سحر دیکھئے۔“ جادو گر نے با آواز بلند کہا۔ ”اس کے لئے مجھے کسی نو جوان کی رضا کارانہ خدمات درکار ہوں گی۔ میں آپ کے سامنے اپنا سحر پھونک کر اسے لڑکے سے لڑکی بناؤں گا!“

حاضرین کے مجمع میں ایک دم بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔ کوئی نو جوان بھی اس کام کے لیے تیار نہ تھا۔ آخر بادشاہ نے اپنے ایک نو جوان سپاہی کو حکم دیا اور وہ جھجکتا ہوا جادو گر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”گھبراؤ نہیں نو جوان۔ ایک بار لڑکی بنانے کے بعد میں تمہیں دوبارہ لڑکا بنا دوں گا۔ تمہیں اپنی جس ”متاع عزیز“ کے چھن جانے کا خوف ہے وہ تمہیں واپس مل جائے گی!“

جادو گر کی بذلہ سخی پر ایک بلند قہقہہ سنائی دیا۔ نو جوان سپاہی شرما گیا۔ آشتیا کے لبوں پر بھی پہلی بار مسکراہٹ پھیل گئی جسے دیکھ کر بادشاہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔

”اچھا تو نو جوان لڑکی بننے کے لیے تیار ہو؟“ جادو گر نے پوچھا۔



”جی بالکل!“ سپاہی نے نروس ہو کر سر ہلایا۔ جادوگر نے اسے بٹھا کر اس پر سفید کپڑا ڈال دیا جس کے نیچے وہ چھپ گیا۔

”عازیل۔ ازازیل۔ جمائیل۔ عاطرے باخ آشیر۔ زامدن زامدن!“ جادوگر زور سے چلایا اور سفید کپڑا اٹھا دیا۔ اس کے نیچے ایک خوبصورت جوان لڑکی بیٹھی تھی اور اپنی شوخ نگاہوں سے حاضرین کو دیکھ رہی تھی۔

تماش بینوں نے جن میں عوام اور خواص سبھی شامل تھے زوردار تالیاں بجا کر جادوگر کو داد دی۔ جب تالیاں رک گئیں تو اس نے لڑکی پر دوبارہ کپڑا ڈالا اور ایک مرتبہ پھر وہی منتر دہرایا۔ منتر کے اختتام پر اس نے کپڑا اٹھایا تو اس کے نیچے سے نو جوان سپاہی برآمد ہوا۔

پھر یکے بعد دیگرے کئی جادوگر آئے۔ کسی نے کپڑے کا ٹکڑا آگ میں جلا کر اسے دوبارہ صحیح سالم کر دیا۔ کسی نے شیشے کی بوتل میں پانی بھر کر بار بار اس کے رنگ بدل کر دکھائے۔ کسی نے کاغذ کے پرزے پرزے کر کے ایک ٹوکری میں ڈالے اور انہیں چمپا کے پھولوں میں بدل دیا۔ ایک جادوگر نے دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگے پاؤں چہل قدمی کی اور اسے آگ نے کوئی گزند نہ پہنچایا۔

آخر میں ایک بوڑھا جادوگر آیا جس کے ساتھ سات آٹھ برس کا ایک بچہ بھی تھا۔ بچہ بہت شریر معلوم ہوتا تھا۔ جب جادوگر طلسم کا سامان ترتیب دے رہا تھا تو اس بچے نے شرارتیں شروع کر دیں۔ کبھی وہ کسی شے کو چھیڑتا اور کبھی کسی کو۔ بوڑھا جادوگر اسے بار بار ڈانٹ رہا تھا اور خفگی کا اظہار کرتا تھا۔ بچے نے ہلکے بانس کی ایک سیڑھی اٹھا کر بغیر کسی سہارے کے کھڑی کی اور اوپر کی سمت چڑھنے لگا۔ بوڑھا جادوگر اسے منع کرتا رہا مگر وہ باز نہ آیا۔ آخر اس نے سیڑھی کے آخری پائیدان پر پاؤں رکھا اور فضا میں کہیں غائب ہو گیا۔ سیڑھی اسی طرح بغیر سہارے کے کھڑی رہی۔

”بہت بد ذات ہے یہ بچہ!“ جادوگر نے جھنجھلاہٹ سے کہا ”میں اسے بھی مزا چکھاتا ہوں“ یہ کہہ کر اس نے اپنے نیام میں سے ایک تیز چمکتی ہوئی تلوار نکالی اور بچے کے پیچھے سیڑھی پر چڑھ گیا۔ پھر وہ بھی فضا میں کہیں غائب ہو گیا۔ حاضرین دم سادھے دیکھ رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد بچے کی چیخیں اور بوڑھے جادوگر کی برا بھلا کہنے کی آوازیں آئیں۔ پھر یکے بعد دیگرے بچے کے کٹے ہوئے اعضاء زمین پر گرنے لگے۔ پہلے ایک بازو گرا۔ پھر دونوں ٹانگیں، سر اور آخر میں اس کا خون آلود دھڑ بھی نیچے آ رہا۔ ناظرین کی چیخیں نکل گئیں۔ آشتیا اس منظر کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئی۔ بادشاہ اس کی طرف لپکا۔ تھوڑی دیر کے لیے افراتفری مچی مگر پھر سب نارمل ہو گیا۔ کیونکہ بادشاہ آشتیا کو شاہی سواری میں ڈال کر بجلت محل کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

”اسے واپس جوڑو۔ اسے بچالو۔“ ناظرین کی کثیر تعداد جادوگر سے التجا کرنے لگی۔

اس بات سے جادوگر نے انہیں سر ہلایا اور بچے کے اعضاء بوز کر اس پر ایک چادر ڈال دی۔ پھر اس نے کوئی منتر پڑھا تو لڑکا خود بخود کھڑا ہو گیا۔ جادو کا ایسا مظاہرہ نہ میں نے اس سے پہلے دیکھا تھا نہ بعد میں دیکھنا نصیب ہوا۔



میں نے ادھر آشتیا کو بادشاہ سے برگشتہ کیا، ادھر ایک شب بادشاہ کی خواب گاہ میں اس وقت داخل ہو گیا جب اس نے خواب گاہ میں قدم ہی رکھا تھا۔ میں گھنٹہ بھر خاموش بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔ وہ خلاف معمول اس شب تنہا تھا اور کسی پری پیکر کی معطر زلفوں کی چھاؤں میں سے بتانے کے موڈ میں نہیں لگتا تھا۔ البتہ آب انگور سے بھری صراحی اور ایک بلوریں جام اس کے سر ہانے دھرا تھا جس میں سے شراب خانہ خراب کے جام پر جام لٹدھار ہا تھا۔ اس شب بادشاہ سلامت نے اتنے جام چڑھائے کہ مزید چند گھونٹ پینے کی بھی سکت نہیں رہی۔ ایسے میں جب میں اچانک ظاہر ہوا تو اس نے کسی فوری رد عمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”کون ہو تم؟“ بالآخر اس کی نشے میں ڈوبی ہوئی غصیلی آواز ابھری ”اور میری خواب گاہ میں کیا کر رہے ہو؟“

”میں آسمانی دیوتا قابوس ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”اور تمہیں یہ باور کرانے آیا ہوں کہ اپنی وفا شعار بیوی ملکہ صبور کو نظر انداز کر کے تم جس دوشیزہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو چکے ہو اس کی رفاقت تمہیں نقصان پہنچائے گی۔“

اس نے بھاری پپوٹے اٹھا کر بغور مجھے دیکھا۔ وہ مسہری سے اٹھ بیٹھا تھا اور کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا ”مم..... میں کیسے یقین کر لوں کہ تم دیوتا ہو..... عام انسان نہیں؟“ اس نے بہکی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”عام انسان مقفل خواب گاہ میں کیسے داخل ہو سکتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

وہ چونک گیا۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا تو اسے اندر سے بند پایا۔ اپنی سلامتی کے خیال سے وہ اسے اندر سے قفل لگاتا تھا۔

”ہاں یہ تو قابل غور بات ہے“ وہ پر خیال انداز میں سر ہلانے لگا۔ پھر میری طرف گھوما۔ اس دوران میں غائب ہو گیا تھا۔

اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ عالم حیرانی اور پریشانی میں ادھر ادھر دیکھنے اور مجھے ڈھونڈنے لگا۔ میں ایک دیوار کے قریب جا کھڑا ہوا تھا اور اس کی حرکتوں سے محفوظ ہو رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھنے سے قاصر تھا۔



”تم..... تم کہاں ہو؟“ وہ کسی قدر خوف کے عالم میں مجھے پکارنے لگا۔  
 ”میں تمہارے عقب میں ہوں۔“ میں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور خود کو ظاہر کرتے ہوئے کہا:  
 ”اوہ!“ وہ ایک سخت گھوما اور مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اسے مسہری پر دھکیل دیا۔  
 ”اب تو تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں انسان نہیں ہوں۔ کیا کوئی انسان دوسرے انسان کی نظروں  
 سے یوں اوجھل ہو سکتا ہے؟“  
 ”مم..... مجھے یقین آ گیا..... مجھے یقین آ گیا.....!“ وہ بڑی طرح خوفزدہ ہو کر گھٹکیا نے لگا۔  
 وہ اس وقت جابر بادشاہ کی بجائے کوئی گھسپارا لگ رہا تھا اور میرے سامنے کسی ادنیٰ غلام کی طرح جھک  
 گیا تھا۔  
 ”سنو۔ وزیر مال کی بیٹی آھینا کا خیال دل سے نکال دو۔ اگر تم نے اسے ملکہ بنایا تو مملکت بابلیہ کا  
 شیرازہ بکھر جائے گا۔“ میں نے اسے متنبہ کیا۔  
 ”اے آسمانی دیوتا۔ مم..... مجھے کاہن اعظم نے بشارت دی تھی کہ آھینا کو دلہن بنانے کی صورت  
 میں مردوک مجھے اولاد دینے سے نوازے گا!“ اس نے میرے قدم چھوتے ہوئے کہا ”وگرنہ میں اپنی جہیتی  
 ملکہ سے بے زنی برت کر کے اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔“  
 ”کاہن اعظم کا علم ناقص اور عطائی ہے جبکہ آسمانی دیوتا علم کا سرچشمہ ہیں، ہمورابی۔“ میں نے اپنے  
 لب و لہجے کو بڑے جلال بنانے کی کوشش کی ”تمہیں جو کہا جا رہا ہے وہی کرو ورنہ تاج و تخت تجھ سے چھین جائے  
 گا اور اس پر کوئی اور متمکن ہوگا۔ مت بھولو آھینا نو خیز ہے اور جوانی کی اُمنگوں سے سرشار۔ وہ کسی اور کو  
 پسند کرتی ہے مگر مصطفیٰ دم سادھے ہوئے ہیں۔ اس کا محبوب تمہارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے!“  
 میری بات سن کر وہ بڑی طرح چونک گیا۔ اسے آھینا کا بدلہ ہوا رویہ یاد آیا ہوگا کہنے لگا:  
 ”ہاں۔ چند دنوں سے میں اسے کھویا کھویا محسوس کر رہا تھا آسمانی دیوتا۔ میں اب سمجھا کہ اصل  
 معاملہ کیا ہے۔ ٹھیک ہے اگر وہ میرے تاج و تخت کے لیے ایسی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے تو میں اسے  
 ہرگز منہ نہ لگاؤں گا۔ مگر مگر وہ کون ہے جسے وہ مکار لڑکی دل سے چاہتی ہے؟“  
 ”یہ جانتا تمہارے لئے بالکل ضروری نہیں۔“ میں نے سرد مہری سے کہا۔ ”اگر کسی طرح اس کا نام  
 تمہارے علم میں آ بھی جائے تو اسے گزند پہنچانے کی کوشش نہ کرنا۔ آسمانی دیوتاؤں کی منشا یہی ہے کہ وہ  
 دونوں باہم مل جائیں۔“  
 ”تسلیم آسمانی دیوتا تسلیم!“ اس نے بے بسی سے سر جھکا دیا۔ ”اب کبھی میرے ہونٹوں پر اس کا نام نہ  
 آئے گا!“  
 ”سنو۔ کل شب اپنی خواب گاہ میں ملکہ صبور کو طلب کرنا اور آسمانی دیوتاؤں کی خوشنودی چاہتے ہوئے

ہمیشہ اس سے جنت و اہلت کا برتاؤ کرنا۔ میں نے اسے یحییٰ کی۔ چھ جگہ نہیں کہہ دی تھی اسی نا لکھ  
 سے جنم لے لے۔“  
 ”جو حکم دیوتا!“  
 میں نے آشیر باد دینے کے انداز میں اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور منتر پڑھ کر غائب ہو گیا مگر  
 تھا اندر ہی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس جگہ کو دیکھنے لگا جہاں میں کھڑا تھا۔  
 ”حیرت انگیز! حیران کن!“ وہ بڑبڑانے لگا ”آسمانی دیوتاؤں کے متعلق کاہنوں سے صرف سنا تھا۔  
 ان کا دیدار کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ آج یہ بھی حاصل ہو گیا! میں خوش قسمت ہوں۔ مردوک کی قسم یہ میری  
 خوش بختی ہے کہ آسمانی دیوتا خود بنفس نفیس میرے پاس آیا اور مجھے اس مکار لڑکی کے بارے میں مطلع کر  
 دیا!“ مردوک کی قسم دیوتا کا حکم نہ ہوتا تو میں اس فاحشہ اور اس کے عاشق کی کھال میں بھس بھر دیتا!  
 میں..... میں..... واقعی ملکہ صبور سے زیادتی کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے یہ معاملہ کل پر کیوں چھوڑا جائے  
 میں ابھی ملکہ صبور کے پاس جاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازے کا قفل کھولا اور باہر نکل گیا۔ میں بھی  
 ساتھ ساتھ تھا۔ ملکہ صبور کے محل کی طرف اندر ہی سے شارٹ کٹ راستہ جاتا تھا جس کا طول بمشکل چار  
 پانچ سو گز ہوگا۔ اس پر چلتے ہوئے ہم کچھ ہی دیر میں صبور کے محل میں پہنچ گئے۔ جب بادشاہ نے صبور کی  
 خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی تو میں نے میاں بیوی کے رنگ میں بھنگ ڈالنی مناسب نہیں سمجھی اور  
 عاطیہ کی کوٹھڑی کی طرف چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

نئے چاند کی دسویں تاریخ تھی۔ میں ایک کارواں سرائے میں تاجروں کے درمیان حالت غیب  
 میں بیٹھا ایک دلچسپ قصہ سن رہا تھا جو ملک چین کے کسی پرانے بادشاہ کے بارے میں تھا۔ ایک ایرانی  
 تاجر جس کا تعلق اصفہان سے تھا اور جسے سب آغا گل کہہ کر پکار رہے تھے مذکورہ قصہ سن رہا تھا۔ آسمان  
 پر تارے چمک رہے تھے اور دریائے فرات کی سمت سے خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جس میں مطلق  
 باغات کے گلابوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ ساواریوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور چینی قہوے کا دور چل  
 رہا تھا۔ اس باحول میں عشق و محبت کی گہرائیوں اور گیرائیوں سے مزین وہ سچی داستان سننے کا لطف ہی  
 کچھ اور تھا۔ آغا گل نے کچھ دیر کے لیے کسی ضرورت کے پیش نظر رخصت چاہی تو میں اس وقفے میں  
 سرائے سے نکل کر چند گز دور ٹہلنے لگا۔ اسی اثناء میں چپون وارد ہوئی۔ وہ کسی قدر مضحک اور تھکی تھکی نظر  
 آ رہی تھی۔

”کیسی گزر رہی ہے بوبی؟“ اس نے سوال کیا۔

”زبردست! بہت انجوائے کر رہا ہوں۔ میرے لیے یہ بالکل انوکھا تجربہ ہے۔ تم نے سچ کہا تھا کہ



اور لونی دوسرا بادشاہ کے خوف سے اس کے نزدیک نہ پھٹے گا۔ بیچاری کا کیا بنے گا؟“  
 ”تم اس کی فکر نہ کرو۔ آج شب اس کے وصال کے مزے لوٹو اور صبح اپنے دور میں واپس لوٹ جاؤ۔  
 میں اس کے لیے کوئی مناسب بندوبست کر دوں گی۔“  
 ”چلو ٹھیک ہے۔“

”اچھا بوائے۔ صبح ملاقات ہوگی۔“ اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور غائب ہو گئی۔ میں نے واپس تاجروں کی مجلس کا رخ کیا۔ آغا گل نے قصہ دوبارہ شروع کر دیا تھا۔

”ہاں تو شاہ تھا نگ چچی اب بوڑھا ہو چکا تھا مگر اس کے حرم میں بہت سی کنیزیں تھیں۔ وہ سب کی سب اسے چاہتی تھیں کیونکہ ابھی تک اس کے گراں ڈیل جسم میں جذبات کی آگ فروزاں تھی۔ عورتیں ہمیشہ بہادر اور شجاع مرد کو پسند کرتی ہیں خواہ اس کے جسم پر جھریاں ہی کیوں نہ پڑی ہوں۔ مردوں کا حسن ان کی بہادری اور فیاضی میں پوشیدہ ہے۔ اسے سفید چہرے اور ظاہری جمال میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ وہ سب کی سب اسے چاہتی تھیں مگر تھا نگ چچی کا دل حرم کی تمام کنیزوں کی نسبت جن کی تعداد ایک ہزار سے زائد تھی ایک آریائی کنیز کی طرف مائل تھا۔ ان کنیزوں میں سے ہر ایک پھول سے زیادہ خوبصورت اور تروتازہ تھی اور شاہانہ زندگی بسر کرتی تھی۔ شاہ کے حکم سے ان کے لیے ہمہ وقت لذیذ، مفرح پکوان اور سرور بخش مشروبات مہیا رہتے تھے۔ انہیں ہر جا اٹھکیاں کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن تھا نگ چچی اپنے دل کی پوری حرارت کے ساتھ صرف اس آریائی کنیز کو چاہتا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کو ایک سرسبز پہاڑی پر واقع سنگ مرمر کے محل میں رکھتا جس کے جھروکوں سے حد نظر تک پھیلی ہوئی نیلگوں جھیل دکھائی دیتی تھی۔ اس محل میں ہر وہ نعمت جمع کر دی گئی تھی جسے پاکر عورتیں اپنی زندگی کو خوشگوار اور رشک انگیز سمجھ سکتی ہیں۔ انگور کے پرکیف رس، لذیذ پکوان، زربفت اور کم خواب کے ملبوسات، سونے چاندی اور جواہرات سے مزین زیور، انواع و اقسام کے ساز، دور دراز ممالک کے خوش رنگ، بولنے والے پرندے اور سب سے بڑھ کر شہنشاہ کی گرم جوش محبت!“

”وہ کئی کئی دن سنگ مرمر کے محل میں قیام کرتا اور اپنی محبوبہ کی دلنواز باتیں سنتا اور اس کے حسین چہرے کو دیکھتا رہتا۔ اب وہ اپنی ہنگامہ خیز زندگی کی تھکن سے چور ہو کر سستار ہا تھا۔ اگر اس کے دل کو تسلی تھی تو اس بات سے کہ اس کے بعد اس کے بیٹے جیا نگ کا جواں سال فرزند چن توئی اس کی وسیع سلطنت کے اقتدار کو قائم رکھ سکے گا۔ وہ ایک قابل نڈر اور دہنگ شہزادہ تھا اور کئی سرکش ریاستوں کو اپنی تلوار سے زیر کر چکا تھا۔“

ایک بار چن توئی ایک ایسی ہی کامیاب مہم سے لوٹا تو اس کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جشن منایا گیا۔ عمر رسیدہ شہنشاہ اس روز بہت خوش تھا۔ اس اجل رسیدہ شاہ کے لیے یہ خیال نہایت خوش کن تھا کہ

یہ حسن کردہ مجھے واپسی کی راہ بھلا دے گا۔“  
 ”لیکن میں اس لیے واپس آئی ہوں کہ تمہیں واپسی کا کہوں۔“ وہ مسکرائی۔  
 ”نہیں نیلم..... ابھی میرا جی نہیں بھرا.....“ میں نے چل کر کہا۔

”کیا ساری عمر یہیں بیٹھے رہنا ہے؟ اپنے دور میں واپس لوٹنا ضروری ہے۔ پورن ماشی کی رات بھی تو آنے والی ہے۔“ اس نے یاد دلایا۔  
 ”اوہ! یہ بات تو مجھے بھول ہی گئی تھی۔“

”اپنے مطلب کی ساری باتیں تمہیں یاد رہتی ہیں، میرے فائدے کی بات بھول جاتے ہو۔“ وہ شکوہ کرنے لگی۔

”نہیں میری جان ایسی کوئی بات نہیں!“ میں نے اسے پیار سے گلے لگا لیا۔ ”مجھے پتہ ہے کہ پورن ماشی کی رات تمہیں ایک جوان دوشیزہ کا خون پلانا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ بتاؤ کب واپس چلنا ہے؟“  
 ”صبح عین اسی وقت جس وقت ہم نے ماضی کی طرف سفر کیا تھا۔“

”آئی سی.....“ میں نے سر ہلایا۔ ”غالبا ہم اپنے دور میں دوبارہ نمودار بھی اسی ہوٹل میں ہوں گے؟“

”ہاں..... مگر وقت اتنا نہیں بیت چکا ہوگا، جتنا تم نے یہاں گزارا ہے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں واپسی کے وقت آشتیا کے محل میں ملوں گا۔ یہ قصہ سن کر سیدھا وہاں جاؤں گا.....“

”جہاں تمہارا جی چاہتا ہے جاؤ.....“ وہ مسکرائی۔ ”البتہ ملکہ صبور کی طرف جانے کی کوشش نہ کرنا، وہ اس وقت ہمورابی کی ناز برداریوں سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ ویسے تم نے ہمورابی کی صحیح ہوائ نکالی ہے بیوی کے آگے کاٹھ کا آٹو بن گیا ہے!“ وہ ہنسی۔

”اس کا یہی علاج تھا!“  
 ”ویسے آشتیا اچھی لڑکی ہے اسے ضرور کسی شہزادے سے بیاہنا چاہیے۔“ چپون نے رائے دی۔  
 ”نہیں۔ میں نے اسے بادشاہوں اور شہزادوں سے ہمیشہ کے لیے متفر کر دیا ہے۔ اب وہ کسی عام آدمی سے شادی کرے گی مثلاً کسی تاجر یا فوجی دستے کے سالار سے۔“

”نہیں۔ تاجر گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہیں اور ان کی بیویاں اپنے وطن میں گلتی رہتی ہیں۔ رہے فوجی سالار تو ان کی حرکات بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ جس ملک پر حملہ آور ہوتے ہیں وہاں کی عورتوں کی عزتوں سے کھیلتے ہیں اور انہیں لونڈیاں بنا لیتے ہیں۔ ان کی بیویاں بھی روتی ہوئی دیکھی گئی ہیں۔“

”پھر اس کا کیا کرنا ہے؟ میں اسے یوں چھوڑ کر گیا تو بے چین رہوں گا۔ بادشاہ اسے بیاہے گا نہیں



اس نے بعد اس کا قابل پوتا سلطنت کی بابا دور سنبھالے گا۔

قصہ خوان نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اس کا یہ خیال بہت ہی درست تھا۔ اس نے دعوت پر سب سردار وزراء اور عہدے دار اکٹھے کئے تاکہ ان کے سامنے اپنے ہونہار پوتے کو جتلا دے کہ عظیم چینی سلطنت کا عظیم بادشاہ تھا نگ جی اسے کس قدر عزیز رکھتا ہے۔

اس نے شراب کا ایک بلوری جام اپنے ہاتھ میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

”جان پدر چن توئی! میری آنکھوں کی ٹھنڈک۔ زمین اور آسمان کے غیر فانی دیوتاؤں کی برکتیں تم پر نازل ہوں۔ بزرگوں کی پاک روہیں تم پر مہربان ہوں۔“

سب نے اپنی بھاری آواز کو ہم آہنگ کر کے آسمان کے غیر فانی دیوتاؤں اور بلاؤں کی حمد گائی۔ اس کے بعد تھا نگ جی بولا۔ ”زندگی دینے والا دیوتا عظیم الشان ہے۔ دیکھو اس نے میرے دلیر اور جری بیٹے کے جسم میں میری زندگی کو از سر نو جوان کر دیا ہے۔ میں اپنی کمزور نظر سے اس وقت کا نظارہ کر رہا ہوں جب آفتاب اپنی حرارت اور روشنی کو میری آنکھوں تک نہیں پہنچا سکے گا اور کیڑے میرے دل کے گوشت میں رخنہ ڈال دیں گے۔ لیکن میں اپنے بیٹے کے خاکی بدن میں پھر بھی زندہ موجود ہوں گا۔ ہاں اتنا ہی زندہ جتنا میں اس وقت ہوں۔ غیر فانی دیوتا ہر بات پر قادر ہیں۔ ان کی برکتیں ہم پر نازل ہوں۔ میرے بیٹے کے بازو مضبوط ہیں۔ اس کے دل میں خوف کا گزرتک نہیں۔ اس کا دماغ الجھنوں سے پاک ہے۔ میرا بیٹا کس قدر سعادت مند ہے۔ چن توئی میرے بیٹے مانگ! تو اپنے باپ سے کیا مانگتا ہے؟ کہہ دے اور تیری آرزو پوری کی جائے گی۔“

بوڑھے بادشاہ کی آواز ابھی گونج رہی تھی کہ چن توئی اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور چمکدار تھیں۔ اس سمندر کی طرح جس پر رات چھا گئی ہو۔ ان میں اک آگ تھی جیسے کوہستان کے کسی عقاب کی آنکھیں شعلہ فشاں ہوں۔ اس نے کہا۔

”دنیا کے تاجداروں کے شہنشاہ! میں تجھ سے وہ آریائی کنیز مانگتا ہوں!“

شہنشاہ تھا نگ جی دم بخود رہ گیا۔ لیکن صرف اتنی دیر کے لیے جس میں اس نے اپنے دل کی کپکپی پر قابو پایا تھا۔

”لے لے۔ تو اسے جشن کے خاتمے پر لے سکتا ہے۔“

شہزادے کا چہرہ خوشی سے متما اٹھا۔ عقابی آنکھیں مسرت سے ہیرے کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور اپنے دادا سے مخاطب ہو کر کہا۔

”فاتح عظیم۔ بلند مرتبہ شہنشاہ۔ میرے بابا! میں جانتا ہوں تو مجھے کیا دے رہا ہے۔ ہاں میں جانتا

ہوں۔ میرا بیٹا میرا علام ہے۔ میرے کون کا ایک ایک ٹھہرہ میرے سے وقف ہے۔ میری آرزو جاییں ہوں تو تجھ پر نثار۔“

شہنشاہ نے کہا۔ ”مجھے کوئی چیز درکار نہیں!“

اور وہ سفید سر جس میں دنیا کو اس سرے سے اس سرے تک تہ وبالا کر دینے کا سودا سما یا ہوا تھا اور جس پر ہمیشہ کامیابی کے سہرے بندھے تھے اس کے سینے پر جھک گیا۔ دعوت بہت جلد ختم ہو گئی۔ دونوں محل سے نکل کر حرم سرانے کی طرف چلے۔ وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر چپ تھے۔ رات اندھیری تھی۔ نہ چاند نظر آتا تھا نہ تارے۔ بادلوں نے آسمان کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ دیر تک یونہی خاموش چلتے رہے۔ آخر بادشاہ نے کہا۔

”میری زندگی کا پیمانہ روز بروز بھرتا جاتا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن ہر روز مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ کل کی نسبت میرے سینے کی گرمی آج کم ہے۔ سن۔ میری زندگی کی روشنی۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک اس آریائی کنیز کی محبت ہے۔ مجھے بتا۔ چن توئی مجھے بتا۔ کیا واقعی تو اس کے بغیر نہ رہ سکے گا۔ تو میری سو کنیزیں لے لے۔ نہیں! میں کہتا ہوں سب لے لے مگر اسے میرے پاس ہی رہنے دے!“

شہزادے چن توئی نے ایک آہ بھری اور کچھ نہ کہا۔

”زندگی کی کتنی شامیں میرے لئے باقی ہوں گی؟ میں کتنے دن اور جی لوں گا؟ اس دنیا میں میرا بسیرا اب چند روز سے زیادہ نہیں ہو سکتا اور یہ آریائی لڑکی میری زندگی کی آخری خوشی ہے۔ وہ مجھے سمجھتی ہے۔ مجھ سے کون محبت کرے گا؟ ہاں مجھ سے ایک بوڑھے سے..... کون محبت کرے گا؟ چن توئی۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں! ایک بھی نہیں۔“

شہزادے چن توئی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”مجھے بتا۔ میں کس طرح زندہ رہوں گا؟ جب مجھے یہ خیال آئے گا کہ تو نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر رکھا ہے چن توئی۔ ہم عورت کے معاملے میں ہرگز باپ بیٹے نہیں رہ سکتے! عورت کے لیے ہم سب مرد ہیں۔ ایک دوسرے کے رقیب اور بس۔ کاش میرے بدن کے تمام پرانے زخم جو میں نے جنگوں میں کھائے کھل جائیں اور میرا سارا خون بہہ جائے۔ چن توئی۔ میرے بیٹے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ میری زندگی کی شمع اس رات کے ختم ہونے سے پہلے بجھ جائے!“

لیکن اس کا جواں سال پوتا خاموش ہی رہا۔ حرم کے دروازے پر پہنچ کر دونوں رک گئے۔ ان کے سر ان کے سینوں پر جھک گئے اور وہ دیر تک یونہی کھڑے رہے۔ ان کے گرد و پیش تاریکی ہی تاریکی اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اور آسمان پر بادل ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑ رہے تھے۔ لرزتی ہوئی ہوا درختوں میں کوئی پراسرار گیت گاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ شہزادے نے دھیمی آواز میں کہا۔



”میں ایک مدت سے اپنا دل اس کے قدموں میں ہار چکا ہوں۔“

شہنشاہ نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تجھے نہیں چاہتی۔“

”جب اس کی یاد آتی ہے تو میرا دل حسرت و یاس سے بھر جاتا ہے۔“ شہزادے نے آہ بھری۔

”کیا میرے سینے میں دل نہیں؟“ شہنشاہ نے اسی لہجے میں کہا۔

شہزادہ آہ بھر کر بولا۔

”اب میں سمجھا۔ ایک کاہن نے سچ ہی کہا تھا کہ عورت مرد کے لیے ہمیشہ تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ وہ اگر حسین ہے تو دوسرے اس پر دستِ طمع دراز کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور اس کا مالک رقابتوں کی جلن میں مبتلا رہتا ہے۔ اگر وہ بد صورت ہے تو اس کا شوہر حسرت و یاس کی تصویر بنا رہتا ہے۔ وہ اپنی قسمت کو کوستا اور دوسرے مردوں کی خوش نصیبی پر رشک کرتا ہے جن کی بیویاں خوبصورت ہوں۔ اگر عورت کی صورت معمولی ہو تو مرد پہلے اسے خوبصورت تصور کر لیتا ہے۔ پھر جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو اس کا دکھ دوسروں سے بڑھ جاتا ہے۔ سچ ہے مرد کو عورت سے رنج کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا.....!“

شہنشاہ نے کہا۔

”دُکھے ہوئے دل کے لیے عقل کوئی دوا نہیں.....“

شہزادہ بولا ”بابا۔ ہم دونوں کی حالت قابلِ رحم ہے!“

شہنشاہ نے اپنا سر اٹھایا اور غور سے پوتے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے تاسف ظاہر ہوتا تھا۔

شہزادہ بولا ”آؤ بابا۔ ہم اسے ہلاک کر ڈالیں!“

شہنشاہ لمحہ بھر سوچتا رہا۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا۔ ”تو اپنے نفس کو اس سے اور مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے؟“

”ہاں..... اور کیا تو بھی ایسا نہیں کرتا۔ میرے معزز بابا؟“

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔

شہنشاہ درد بھرے لہجے میں بولا۔

”تو سچ کہتا ہے!“ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

”خوب! تو ہمیں اس کو ہلاک کر دینا چاہیے؟“

شہنشاہ بولا ”میں اپنی محبوبہ کو تجھے نہیں دے سکتا! اے آسمانی دیوتاؤ! میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟“

”میں اور صبر نہیں کر سکتا بابا۔ اس کو مجھے دے ڈال۔ یا میرا دل میرے سینے سے نکال پھینک!“

شہنشاہ کسی پتھر کی طرح خاموش رہا۔

”.....یا چلو بابا۔ ہم مل کر اسے چٹانوں سے دریا میں پھینک دیں!“

”ہم اسے دریا میں پھینک دیں؟“ شہنشاہ بڑبڑایا۔ اس کی آواز پوتے کی آواز کی بازگشت محسوس ہوتی تھی۔

دونوں حرم کے اندر داخل ہو گئے جہاں وہ ایک مسہری پر سو رہی تھی۔ دونوں اس کے پاس کھڑے ہو گئے اور اس کے حسن بے مثل کو دیکھتے رہے۔ بوڑھے بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس بادشاہ کی آنکھ سے جس کی آنکھیں مظلوم قوموں کی گریہ وزاری پر استہزا کیا کرتی تھیں۔ اس کے گرم آنسو سپید داڑھی پر آبدار موتیوں کے طرح دمک رہے تھے۔ اس کے پوتے کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور جب وہ آریائی حسینہ کو جگانے لگا تو اپنے تند جذبات کو چھپانے کے لیے اس نے دانتوں کو زور سے پیسا۔ وہ جاگ اٹھی۔ اس کے نازک گلابی چہرے پر اس کی کنول جیسی آنکھیں نیم وا ہوئیں۔ اس نے شہزادے کو نہیں دیکھا تھا صرف شہنشاہ کو دیکھا تھا۔ اس نے اپنے سرخ گلاب کی پٹھریوں جیسے ہونٹ بو سے کے لیے شہنشاہ کی طرف کھولے۔

”میرے عقاب!“ اس نے خود سپردگی کے عالم میں کہا۔

”اٹھ تو ہمارے ساتھ چلے گی۔“ شہنشاہ نے نرمی سے کہا۔

تب کنیر نے شہزادے اور اپنے عظیم بادشاہ کی آنکھوں میں لرزے والے آنسوؤں کو دیکھا تو آن کی آن میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اس نے کہا۔

”چلو میں تیار ہوں۔ میں نہ ایک کے لیے ہوں نہ دوسرے کے لیے۔ یہی بات ہے نا؟ مضبوط دل اسی طرح فیصلے کیا کرتے ہیں۔ چلو!“

تینوں خاموشی سے دریا کی سمت چل دیئے۔ لڑکی نازک تھی۔ جلد ہی تھک گئی مگر اس کا نسوانی غرور کسی قسم کی درخواست کرنے میں مانع تھا۔ شہزادے نے جب دیکھا کہ وہ پیچھے رہ جاتی ہے تو تنگ کر کہا۔

”کیا تو موت سے ڈر رہی ہے؟“

اس نے جوان شہزادے پر غصیلی نگاہ ڈالی اور پھر اپنے نازک پیروں کی طرف اشارہ کیا جن سے لہو بہہ رہا تھا۔ شہزادے نے اپنے کشادہ بازو وا کئے مگر لڑکی نے بوڑھے شہنشاہ کی گردن میں ہاتھیں ڈال دیں۔ اس نے فوراً اسے اٹھالیا۔ اس کا بوجھ تو نمند بادشاہ کے لیے پھول جیسا تھا۔ وہ اس کی گود میں لیٹی راستے میں حائل درختوں کی شاخیں ہٹا رہی تھی۔ وہ دیر تک چلتے رہے۔ آخر دریا کی شوریدہ سرموجوں کا ابتدائی شور سنائی دیا۔ شہزادہ جو پیچھے چل رہا تھا ایک ایک بولا۔

”بابا..... میری طبیعت مجھے اُکسار ہی ہے کہ اپنا تیز دھار خنجر تیری گردن میں پیوست کر دوں!“

”تو پھر آگے بڑھ چل۔ دیوتا تیری خواہش پوری کریں۔ یا تجھے معاف کر دیں۔ سب کچھ ان کی



مرضی کے مطابق ہوا! لیکن تیرا باپ تجھے معاف کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ عشق کیا بلا ہے!“

آخر طوفانی دریا سامنے آ گیا۔ وہ اب چٹانوں کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے بہت دور تک فضا تاریک اور دھند آلود تھی۔ چٹانوں کے قدموں میں اندھیرے ٹھنڈا اور خوف میں گھری ہوئی موجیں اپنے اپنے راگ گائے جارہی تھیں۔

”الوداع۔“ شہنشاہ نے حسینہ کو چومتے ہوئے کہا۔

”الوداع۔“ شہزادہ جھک کر بولا۔

لڑکی نے نیچے دیکھا۔ دریا نے خوفناک شور مچا رکھا تھا۔ وہ ڈری اور پیچھے ہٹ گئی اور اپنے سینے کو بانہوں میں زور سے دبا لیا۔

”مجھ سے اپنے آپ نہیں گرا جاتا۔ تم مجھے پکڑ کر نیچے پھینک دو۔“

شہزادے نے پھر اپنے بازو بڑھائے مگر وہ بادشاہ کے بازوؤں میں چلی گئی۔ اس نے اسے بہت سا پیار کیا۔ اس کی پیشانی چومی۔ پھر اسے پکڑ کر فضا میں بلند کیا اور چٹانوں سے نیچے پھینک دیا۔

لہروں کا شور اس قدر زیادہ تھا کہ دونوں کو اس کے گرنے کی آواز نہ آ سکی۔ کوئی صدا ابھری تھی نہ چیخ سنائی دی۔ بادشاہ چٹان پر لیٹ گیا اور اس تاریکی میں اپنی خاموش نگاہیں گاڑ دیں جہاں دریا سیاہ بادلوں سے ملا ہوا تھا۔

شہزادہ اس کے قریب دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے کسی سنگی مجسمے کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے گہرا سانس لیا اور کہا۔

”بابا..... چلو محل چلیں۔“

”ٹھہر!“ بادشاہ نے یوں کہا جیسے کچھ سن رہا ہو۔ موجیں بدستور شور کر رہی تھیں۔ ہوا کی سائیں سائیں اس پر مستزاد تھیں۔

”بابا اٹھ گھر چلیں۔“

”تھوڑی دیر اور ٹھہر!“

شہزادے نے کئی مرتبہ اسے لوٹ چلنے کو کہا مگر بادشاہ نے اس جگہ سے جنبش نہ کی جہاں وہ اپنی بقیہ زندگی کی مسرتوں کو دریا برد کر چکا تھا۔ لیکن تاکے۔ آخر وہ اٹھ بیٹھا اور ضبط و غرور کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

”ہاں چل.....“ اس نے کھوکھلی آواز میں کہا۔

وہ تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ بادشاہ رک گیا۔

”لیکن شہزادے۔ میں کہاں چلا ہوں؟ جب وہ جو میری جان تھی چلی گئی تو میں کیوں زندہ رہنے کی خواہش کروں۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اب مجھ سے کوئی محبت نہ کرے گا اور جب تو کسی شخص کا دامن

محبت سے خالی دیکھے تو سمجھ لے کہ اس کا جینا بے فائدہ ہے۔ میرے بیٹے الوداع۔ غیر فانی دیوتاؤں کی برکتیں تجھ پر نازل ہوں۔ تیرا بابا اپنی محبت کے پاس جا رہا ہے.....“

یہ کہہ کر اس نے اپنا رخ دریا کی طرف پھیر لیا۔ شہزادہ اسے بچانے دوڑا مگر بادشاہ نے بڑی سرعت سے چٹانوں سے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ آس پاس کی تاریکی اور دریا کی تندہی نے اسے کسی دیو کی طرح نگل لیا۔

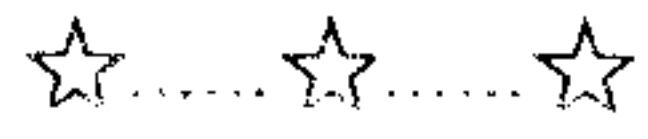
شہزادہ دیر تک چٹان کے نیچے اندھیروں میں گھورتا رہا پھر بلند آواز میں کہا۔

”اے غیر فانی دیوتاؤ! مجھے بھی ایسی ہمت اور ایسا قوی دل عطا کرنا!“

پھر وہ رات کی تاریکی میں واپس لوٹ آیا.....

تمام سامعین دم بخود تھے۔ آغا گل نے ایک آہ بھری اور کہا۔

”عشق بڑی ظالم شے ہے۔ عاشقوں کا انجام ہمیشہ ایسا ہی دردناک ہوتا ہے۔ مگر بوڑھا چینی بادشاہ اس واقعہ کے بعد امر ہو گیا.....“

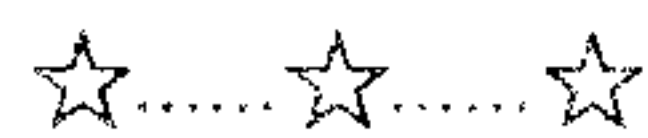


رات قصہ ختم ہونے کے بعد میں آشتیا کے محل میں گیا اور اس کی خواب گاہ میں شب ب سری کی۔ اس کی بیتابی عروج پر تھی۔ وہ شکوں کناں تھی کہ میں کہاں تھا۔ وہ ہر شب میرا انتظار کرتی تھی اور بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے رات گزارتی تھی۔ میں ادھر ادھر کے بہانے کر کے اسے بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے سمجھاتا رہا کہ دیوتاؤں کو اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ انہیں جگہ جگہ جانا پڑتا ہے۔ اس جیسے اور لوگوں کی بھی مدد کرنی ہوتی ہے..... مگر وہ کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بضد تھی کہ میں ہر شب بلاناغہ اسے درشن دوں تاکہ اس کا دل قرار پکڑے۔ اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہو۔ اس کی بے تابیاں دیکھ کر میں شب بھر سوچتا رہا کہ جب میں چلا جاؤں گا تو اس کا کیا حال ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو کچھ کر لے گی۔ مگر پھر دل کو یہ سوچ کر تسلی دیتا رہا کہ چمپون انسانی ذہن بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ سب سنبھال لے گی۔

آشتیا کے ساتھ آخری رات پلک جھپکتے میں گزر گئی۔ وقت سحر جب مجھ پر غنودگی طاری تھی چمپون نے مجھے آہستگی سے ہلایا:

”اٹھو بونی واپس جانے کا وقت آ پہنچا ہے۔“

میں کسلمندی سے اٹھ بیٹھا اور آشتیا کو سوتا چھوڑ کر چمپون کے ساتھ اس کی خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔







”واپس لوٹنے کو جی نہیں چاہ رہا؟“ اس نے میرے پہلو میں چلتے ہوئے پوچھا۔  
”نہیں.....“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”ایک دن تو واپس جانا ہی تھا۔“ اس نے کسی قدر سرد مہری سے کہا اور ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑے ہو کر واپسی کا منتر پڑھنے لگی اور پھر ہم اسی طریقے کو اختیار کر کے اپنے عہد میں واپس لوٹ آئے جواز منہ قدیم کے بابل کی طرف سفر کرتے ہوئے کام میں لائے تھے۔

ہوٹل کے لان میں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس لان کے کسی تنہا گوشے میں بیٹھے بیٹھے لمحہ بھر کے لئے اونگھ آئی تھی یا جاگتے میں کوئی سپنا دیکھا تھا۔ بابل میں گزرے ہوئے حسین و رنگین ایام خواب و خیال سے لگتے تھے۔ میں سوچوں کے بھنور میں غوطہ زن تھا کہ چمپوں کی آواز آئی۔

”محبوب تم کمرے کا رخ کرو۔ مجھے ابھی اور اسی وقت واپس لوٹنا ہے۔“  
”وہ کیوں؟“ میں نے سوال کیا۔

”اپنی ماورائی دنیا میں چند ضروری امور پنپانے ہیں۔ علاوہ ازیں اشتیاق کے لئے بھی کچھ کرنا ہے۔“  
”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تم اپنی مہم پر نکلو مجھے اپنے مشن پر نکلنا ہے۔“ میں نے ریٹا کا حسین سراپا ذہن میں لاتے ہوئے کہا۔

چمپوں نے میرا ذہن پڑھ لیا۔ ہنستے ہوئے بولی:

”ریٹا اس وقت اپنے ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ کیپ ٹاؤن کی طرف محو سفر ہے۔ ہوائی جہاز جنوبی افریقہ کی فضاؤں میں داخل ہوا ہی چاہتا ہے!“

اس کے انکشاف نے میرے دل پر چھریاں چلا دیں.....

”اگر یہ مذاق ہے تو نہایت بھونڈا ہے.....“ میں نے قدرے بے یقینی سے کہا۔

”میں مذاق نہیں کر رہی، بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ ویسے بانی داوے تمہیں یہ مذاق کیوں لگ رہا ہے؟ کیا تمہارے خیال میں ریٹا کوئی عفت مآب مشرقی لڑکی ہے؟ کیا تم اس سے وفا کے تمنائیں ہو۔ یعنی

ایک بار تمہارے ساتھ محبت کا ہیل ہیٹنے کے بعد اسے بانی مرنیک بی بی بن کر تمہارے انتظار میں بیٹھ رہا چاہئے۔ اس کا کسی اور مرد کی بانہوں میں جھولنا تمہارے لئے کس بنیاد پر سوہان روح ہے؟“  
”کوئی بنیاد نہیں..... بس ویسے ہی میں جیلس ہو گیا تھا.....“ میں نے خفیف ہو کر کہا ”دراصل مجھے وہ اچھی لگی تھی اور ابھی میں نے جی بھر کر اس کی رفاقت سے حظ نہیں اٹھایا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس سے ملنے قاہرہ جاؤں گا۔ مگر تم نے جو خبر سنائی ہے۔ اس کے بعد اس سے ملنے کی تمنا خاک میں مل گئی ہے۔“  
”دل چھوٹا نہ کرو۔ اب نہیں تو چند ماہ بعد اس سے ملنے کا موقع مل سکتا ہے۔“ وہ مجھے چمکارنے لگی.....

”اٹس اوکے۔“ میں نے کندھے اچکا دیئے۔

”تم کسی ساحل شہر کا رخ کرو۔ وہاں تمہیں کوئی مطلب کی لڑکی مل ہی جائے گی۔ اس سے میرا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔ پورن ماشی کی رات تو تمہارے ذہن میں ہے نا؟“  
”ہاں.....“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہوں مجھے تمہارے لئے خون کا بندوبست کرنا ہے۔“

”کہاں جانا چاہو گے؟“ اس نے استفسار کیا۔

”بنکاک۔“ میں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”ایک بار تھائی لینڈ کے بارے میں ایک کتاب پڑھی تھی جس میں دارالحکومت کے بارے میں کافی دلچسپ مواد تھا۔ اس روز سے اس پر اسرار اور رومان پرور مشرقی شہر کو دیکھنے کا اشتیاق دل میں ہے۔“

”یہ شہر مشرقی تو صرف اس لحاظ سے ہے کہ سیاحت کے فروغ کے سبب تھائی لینڈ کی حکومت ہوٹل اور ٹورازم انڈسٹری میں مشرقی تہذیب اور کلچر کے مظاہر بطور خاص شامل کئے ہوئے ہے، ورنہ اپنے باطن میں یہ شہر سراسر مغربی بلکہ دوہاتھ آگے ہے۔“

”پھر تو ایک ٹکٹ میں دو مزے ہوں گے!“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”میں وہاں بذریعہ ہوائی جہاز نہیں جانا چاہتا۔ مجھے اپنی ماورائی طاقت کے زور پر ابھی وہاں پہنچا دو۔ یہاں سے میرا دل بھر گیا ہے۔“ میں نے فرمائش کی۔

”چلو پھر آنکھیں بند کرو۔ مگر پہلے ایک وعدہ کرو۔“

”وہ کیا؟“

”بنکاک میں میرے لئے ایک صحت مند اور جوان لڑکی ڈھونڈو گے۔ میں اس بار سترہ اٹھارہ برس کی سرخ و شاداب لڑکی کا خون پینا چاہتی ہوں۔ جسے نوش جاں کر کے میرے رگ و پے میں بھر پور جوانی اور شباب کی ترنگ موجیں مارنے لگے.....“



”تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں تمہاری منشا کے مطابق شکار ڈھونڈ کر دوں گا۔“

”یو آر سو سوئیٹ بوبی۔“ اس نے لاڈ سے کہا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آنکھیں بند کرنے کی ہدایت کی۔ میں نے آنکھیں موندیں تو وہ ایک منتر پڑھنے لگی جسے میں اس کے ساتھ ساتھ دہراتا رہا۔ پھر جب اس نے آنکھیں کھولنے کو کہا تو میں نے خود کو سمندر کے کنارے ناریل کے ایک جھنڈ کے اندر پایا۔ وہ کوئی سچ تھی جس کے دائیں طرف کافی فاصلے پر بلند و بالا عمارات تھیں۔ درمیانی علاقہ خالی تھا۔ سامنے حدنگاہ تک نیلا اور صاف و شفاف سمندر تھا۔ جس میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ہمارے بائیں جانب پانچ سو گز دور ایک خوبصورت پگوڈا نما عمارت تھی جس کا درمیانی حصہ تو پگوڈا کی شکل کا تھا مگر اس کے دونوں طرف جدید طرز کی عمارت تھی۔ پگوڈا کی چھت کا رنگ سمندر کی طرح نیلا تھا۔ اس کی پیشانی پر انگریزی کے بہت بڑے روشن حروف میں ”بلیو لیگون ہوٹل“ لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے سامنے ساحل کی ریت پر رنگ برنگی چھتریاں آویزاں تھیں جن کے نیچے کرسیوں پر پیرا کی کے لباس میں جوان مرد اور عورتیں بیٹھی مشروبات سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ کچھ عورتیں اور مرد غسل آفتابی میں بھی مصروف تھے۔

”خوبصورت جگہ ہے۔“ میں نے تبصرہ کیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ تعریفی نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے بولی ”تم ادھر ادھر ٹہل کر انتظار کرو، میں تمہارے لئے ہوٹل میں کمرہ بک کرواتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کندھے اُچکائے۔ چمپون میری طرف ایک دلکش مسکراہٹ اچھال کر غائب ہو گئی۔

میں ساحل پر آہستہ چلتا ہوا ہوٹل کی طرف بڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں دائرے کی شکل میں بنے ہوئے طویل ڈرائیو وے پر پہنچ گیا جس کے سامنے بہت بڑا سرسبز لان اور سلیقے سے لگے ہوئے خوبصورت درختوں کی قطاریں تھیں۔ پورچ کے سامنے کافی چہل پہل تھی۔ سیاح بسوں سے سامان اتار رہے تھے۔ ایک طرف وسیع پارکنگ میں ان گنت کاریں قطار در قطار کھڑی ہوئی تھیں۔ میں ہوٹل کی وسیع لابی میں داخل ہوا تو چمپون سامنے سے آتی نظر آئی۔

”تمہارا کمرہ تیسری منزل پر بک ہو گیا ہے۔ یہ رہی اس کی چابی اور ہاں تم یہاں مسٹر ریاض ہو۔“

میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دو منٹ بعد ہم کمرے میں تھے۔ وہ ایک خوبصورت اور آرام دہ کمرہ تھا، جس کی سجاوٹ اعلیٰ ذوق کی عکاس تھی۔

”لو بوبی عیش کرو۔۔۔۔۔“ وہ چہکی۔ ”یہاں ایک نائٹ کلب، ایک کیسینو اور دو ریستوران ہیں۔ ایک میں یورپین کھانا ملتا ہے اور دوسرے میں تھائی، چینی اور انڈین کھانے پیش کئے جاتے ہیں۔ نائٹ کلب

میں بنکا کی تتلیاں تمہاری منتظر ہوں گی۔ کیسینو میں بھی تمہاری دلچسپی کا سارا سامان موجود ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر عیش کے لئے کیش بھی درکار ہوتا ہے محترمہ!“

”اس کا غم نہ کرو میں تھوڑی دیر میں بندوبست کر دوں گی۔ ایک بیرا تمہیں نوٹوں سے بھر ابریف کیس تمہا جائے گا!“

”او کے۔۔۔۔۔ پورن ماشی کی رات ملاقات ہوگی۔“ میں نے اس کے پگھڑی جیسے ہونٹوں کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

بنکا کیس میں چند روزہ قیام کا بہت لطف آیا۔ ہوٹل بلیو لیگون میں پہلے ہی روز پشاور کے ایک خان صاحب اور لاہور کے ایک بٹ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ میں انہیں اپنی مخصوص مصروفیات کے سبب اوائڈ کرنا چاہتا تھا مگر ان دونوں کی شخصیتیں ایسی دلچسپ، پُر خلوص اور گرفت میں لینے والی تھیں کہ میں ان کے دوستانہ حصار سے بچ نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ویسے بھی دیار غیر میں کسی ہم وطن کی صورت دیکھنے اور ان سے اپنی زبان میں ہم کلام ہونے کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ میں اس نشے کو ترسا ہوا تھا۔ لابی میں ہماری ملاقات ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں ہم آپس میں یوں بے تکلف ہو گئے جیسے برسوں کے یار ہوں۔ خان صاحب امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتے تھے۔ ان کا دفتر اسی ہوٹل کی چھٹی منزل پہ تھا جو ایک سویٹ میں قائم کیا گیا تھا۔ ایک کمرے میں دفتر تھا، دوسرے میں رہائش۔ پینتیس برس کے گورے چٹے اور صحت مند پٹھان تھے۔ وہ شادی شدہ تھے اور تین بچوں کے باپ۔ ان کی فیملی پشاور صدر کے علاقے میں ان کے والدین کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ خان صاحب نہایت دل پھینک آدمی تھے۔ پانچ وقت کے نمازی مگر ساتھ ہی حسن پرست۔ جہاں لڑکی دیکھی رال پڑکانے لگے۔ گھوڑ گھوڑ کر اسے دیکھتے جاتے اور ساتھ ہی استغفر اللہ بھی کہتے جاتے۔۔۔۔۔

بٹ صاحب بلا کے لطیفے باز اور بھانڈے تھے۔ عمر اٹھائیس برس کے لگ بھگ ہو گئی۔ اونچا قد۔ گوری رنگت، خوبصورت چہرہ، کلین شیو۔ خوش لباس اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ان کی بیوی دو برس پہلے کینسر کے سبب فوت ہو گئی تھی۔ ابھی تک انہوں نے دوبارہ شادی نہیں کی تھی۔ نئی بیوی کی تلاش جاری تھی۔ اسی بات کو جواز بنا کر ہر قسم کی لڑکیوں سے علیک سلیک اور میل ملاقات تو کھتے اور یاروں سے کہتے:

”میں جانتا ہوں، مشرقی حوالوں سے یہ سب غلط ہے مگر بھاجی کسی نے ایک کلو آم بھی خریدنے ہوں تو وہ چار ریڑھیاں پھرتا ہے، میرا تو زندگی بھر کا معاملہ ہے۔۔۔۔۔ پھر ٹھونک بجا کر ”مال“ کیوں نہ دیکھوں!“

موصوف ٹریول ایجنٹ تھے۔ انہوں نے بھی اپنا دفتر ”بلیو لیگون“ ہوٹل کے ایک کمرے میں قائم کر رکھا تھا۔



میلے پچھے لے دوسرے دن کا ذکر ہے۔ میں سام کو مرنے میں آرام کر رہا تھا کہ یون کی بی بی۔ میں نے فون اٹھایا:

”ہیلو!“

”ریاض صاحب۔ کیا حال ہے؟“ یہ بٹ صاحب تھے۔

”ٹھیک ہوں۔“ میں نے بوجھل آواز میں کہا تو فوراً بولے:

”جناب یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔ میلا میں آکر سوئے رہنا گناہ کبیرہ ہے۔ شیطان ناراض ہوتا ہے!“

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے کہا:

”بٹ صاحب کیا آپ نہیں سوتے؟“

”سوتا تو ہوں مگر صرف اس وقت جب مزید جاگنے کی سکت نہ رہے۔ ورنہ زندگی کا ہر لمحہ انجوائے کرتا ہوں۔ پتہ نہیں آپ ریلیکس کیسے ہوتے ہیں.....؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں نہیں جانتا کہ آپ اچھا وقت کیسے گزارتے ہیں۔ ہمارے انداز میں یا ہم وطنوں کے روایتی انداز میں.....“

”روایتی انداز سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”عام پاکستانی نہ شراب پیتے ہیں، نہ جوا کھیتے ہیں، نہ نائٹ کلب جا کر ناچتے ہیں۔ تفریح کے دوسرے مقامات جہاں حسین پریاں عشاق کا دل بہلاتی ہیں، مساج وغیرہ کرتی ہیں وہاں جانا بھی پسند نہیں کرتے۔ ایسی زندگی کا کیا لطف؟ بس کھالیا اور سولیا.....“

”ہر ملک کا اپنا ماحول ہے اور ہر قوم کا اپنا مزاج۔ وہ اسی میں پرسکون اور خوش رہتے ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟“

”کوئی اعتراض نہیں۔ میں آپ سے پوچھ رہا تھا کہ آپ کا تعلق کسی مکتبہ فکر سے ہے؟“

”میں جوانی دیوانی کا ہر لمحہ انجوائے کرنے والوں میں سے ہوں۔ جب بوڑھا ہو گیا تو میں بھی لہک لہک کر نعیتیں پڑھوں گا..... میرے مولا بلا لے دینے مجھے.....“

بٹ صاحب نے ایک جاندار قہقہہ لگایا:

”پھر تو آپ اپنی لائن کے بندے ہیں! میں نے خان صاحب سے شرط لگائی تھی کہ بندہ اپنی لائن کا نہ ہوا تو انہیں ”فیری ڈنر“ پر لے جاؤں گا۔ بصورت دیگر وہ ہم تینوں کو ”فیری ڈنر“ پر لے جائیں گے۔ میں انہیں مطلع کرتا ہوں کہ وہ یہ شرط ہار چکے ہیں۔ آپ ڈنر پر چلنے کی تیاری کریں.....“

میں نے آمادگی ظاہر کر دی اور غسل کے لئے واش روم میں گھس گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم بٹ صاحب کی گاڑی میں ڈنر کے لیے جا رہے تھے۔ بنکاک شہر رنگ ونور کے سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم کشادہ اور بارونق سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ ٹریفک بہت منظم اور باقاعدہ تھا۔ کسی نے ٹریفک کے اشاروں کی خلاف ورزی کی اور نہ ہارن بجایا۔ قاعدے قرینے سے چل رہے تھے۔ بٹ صاحب کہنے لگے:

”یار ریاض صاحب۔ خدا کی قسم ایسے موقعوں پر اپنا لاہور بڑا یاد آتا ہے۔ گواٹمنڈی اور رنگ محل میں دو چار ریڑھوں پانچ سات گڈوں درجن بھرتا نگوں اور گٹر سے بچ کر گاڑی نہ چلائی جائے ڈرائیونگ کا لطف ہی نہیں آتا۔ یہ کیسے بد ذوق لوگ ہیں بنکاک والے!“

”اویار ادھیان سے گاڑی چلاؤ.....“ خان صاحب بٹ صاحب کی گدی پر چپت مارتے ہوئے بولے۔ ”ادھر سامنے سے کوئی پشاور ٹرک ڈرائیور بھی آسکتا ہے، اچانک!“

”یعنی پشاور ٹرک ڈرائیور نے ابھی آنا ہے.....“ بٹ صاحب نے انہیں چھیڑا، مگر خان صاحب سڑک کے قریب سے گزرنے والی ایک نیم برہنہ تھائی لڑکی کے بھاری کولہوں پر نظریں گاڑے با آواز بلند استغفر اللہ کا ورد کر رہے تھے۔

”ویسے یار خان..... تم لوگوں کے نزدیک نسوانی حسن کا پیمانہ بڑا عجیب نہیں؟“ بٹ نے اسے کہنی ماری، پھر ایک لطیفہ سنانے لگا۔

”ایک دفعہ کسی محفل میں ایک خان صاحب بیٹھے تھے۔ وہاں پشتو فلموں کی ایک مشہور ہیروئن بھی موجود تھی۔ ایک آدمی نے خان صاحب سے پوچھا:

”کیا آپ انہیں پہچانتے ہیں؟“

”نہیں.....“ خان صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیوں کیا آپ پشتو فلمیں نہیں دیکھتے!“

”دیکھتا ہوں!“

”پھر تو آپ کو انہیں پہچان جانا چاہئے تھا۔ یہ پشتو فلموں کی مشہور ہیروئن ہیں۔“

”ہماری فلموں میں ہیروئن کا چہرہ کب دکھاتے ہیں!“ خان صاحب نے جواب دیا۔

”یار بٹ۔ تو میرے ہاتھ سے ضائع ہو جائے گا!“ خان صاحب ہنسنے لگے۔ پھر بولے:

”ویسے تم بٹ بھی بڑی کتی شے ہوتے ہو۔ تمہارے بارے میں بھی ایک لطیفہ مشہور ہے۔“

”سناؤ سناؤ.....“ بٹ نے زندہ دلی سے کہا۔

”مرنے کے بعد ایک بٹ صاحب غلطی سے جنت میں چلے گئے۔ اگلی صبح ناشتے کے وقت جب



سارے بچے ڈول اٹھا کر دودھ کی نہر پر دودھ لینے لگے تو سر پیٹ کر رہ گئے۔ پورا نہر دبی سے بھرا ہوا تھا۔  
بٹ صاحب نے رات کو جاگ لگا دیا تھا!"

"بٹ نے قہقہہ لگایا۔" واہ خان بڑا اچھا چٹکلہ سنایا ہے لیکن یار پلیز اپنے مذکر مونٹ ٹھیک کر لو  
بعض اوقات بڑی نازک صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ مجنوں نظر آتی ہے لیکن نظر آتا ہے والا معاملہ  
ہو جاتا ہے۔"

اسی طرح ہنستے کھیلتے ہم آدھے گھنٹے میں خلیج بیکاک پہنچ گئے۔ وہاں بڑے پیارے مناظر دیکھنے کو  
ملے۔ سارا ساحل رنگ برنگے ققموں، روشنیوں اور نیون سائن سے منور تھا اور رات کے وقت بھی دن کا  
سماں معلوم ہو رہا تھا۔ ریسٹوران، بار روم، کیسینو، ناچ گھر اور تماشا گاہیں دنیا بھر سے آئے ہوئے  
سیاحوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہر طرف سے موسیقی، نعرہ ہائے لطف و انبساط، قہقہوں اور چہچہوں کی  
آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ ہم سیدھے ایک گھاٹ پر گئے جہاں درجنوں موٹر بوٹ، بادبانی  
کشتیاں اور چھوٹے جہاز پانی میں کھڑے، کھلے سمندر میں جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ سمندر میں  
کچھ فاصلے پر روشنیوں سے جگمگاتی ایک فیری کھڑی تھی۔ وہی ہماری منزل تھی۔ ہم ایک کشتی میں سوار ہو  
کر اس کی طرف روانہ ہو گئے.....

یہ ایک اچھی خاصی بڑی فیری تھی جس پر دو منزلہ ریسٹوران بنا ہوا تھا۔ عرشے پر اسٹیل کے پائپوں پر  
چھتری نما، دیدہ زیب تنبوتان کر اوپن طعام گاہ بنائی گئی تھی۔ وہاں آئرن کے خوشنما میز اور کرسیاں بچھی  
تھیں۔ ایک طرف بونے اسٹائل میں کھانے کے اسٹینڈ تھے جہاں شیف ڈشوں میں انواع و اقسام کے  
کھانے رکھے گئے تھے۔ سلاد اور سویٹ ڈشوں کی درجنوں اقسام کو سجا کر پھولوں کے جلو میں آراستہ کیا گیا  
تھا۔ بیک گراؤنڈ میں دھیمامیوزک بج رہا تھا۔ ہم نے اپنے لئے ایک میز مخصوص کی اور اس کے بعد پلیٹیں  
اٹھا کر کھانا لینے کے لئے فوڈ کارز کی طرف بڑھ گئے۔ تھائی کھانے خصوصاً ٹوئش، سی فوڈ، پران و دونوڈلر،  
شرپ فنگر فٹ، کولڈ چکن، پمفرٹ بہت پسند آئے۔

ریسٹوران کا ماحول بہت خوشگوار تھا۔ وہاں اکثریت غیر ملکیوں کی تھی جو خوشگوار موڈ میں ہنستے بولتے  
خوش و خرم ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ صاف ستھری رنگین وردیوں میں ملبوس کم عمر لڑکیاں ویٹریں ادھر سے ادھر  
تتلیوں کی طرح پھر رہی تھیں۔ اگرچہ سیلف سروس تھی مگر برتن سمیٹنے اور شراب کافی وغیرہ لانے کی ذمہ  
داری انہی کی تھی۔ ریسٹوران والوں نے بچوں کے لئے ٹافیاں، چاکلیٹ اور کھلونوں کا بندوبست بھی کر  
رکھا تھا۔ اس کارز میں جہاں بچوں کی دلچسپی کا سامان تھا، خاصی رونق محسوس ہوتی تھی.....

کھانا کھاتے ہوئے بٹ صاحب اور خان صاحب کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ عرشے پر  
خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی۔ ان میں مغربی خواتین نمایاں تھیں۔ موسم چونکہ گرم تھا اس لئے ان کا

بٹ صاحب نے رات کو جاگ لگا دیا تھا۔ بٹ صاحب نے رات کو جاگ لگا دیا تھا۔ بٹ صاحب نے رات کو جاگ لگا دیا تھا۔  
کھانے کے بعد وہ ادھر ادھر ٹھہرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے خان صاحب کو غصے میں پاؤں پکڑتے  
واپس آتے دیکھا۔ وہ استغفر اللہ پڑھ رہے تھے۔

"کیا ہوا خان صاحب، بٹ صاحب کدھر ہیں؟"

"وہ دیکھئے، نامحرم عورتوں کا ہاتھ پکڑے کوئے میں بیٹھا ہے۔" انہوں نے اشارہ کیا۔ میں نے ان  
کی نگاہوں کے تعاقب میں اپنی نظریں دوڑائیں تو بٹ بہادر کو تین چار خوبصورت میموں کے جلو میں بیٹھے  
دیکھا۔ وہ حسینائیں بڑے انہماک اور عقیدت سے اس کا چہرہ تک رہی تھیں اور وہ کسی فلسفی کے انداز میں  
ان سے محو گفتگو تھا۔

"یہ بٹ کر کیا رہا ہے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاتھ کی لکیریں پڑھ رہا ہے۔" انہوں نے رشک و حسد کی ملی جلی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتے  
ہوئے کہا۔

"نیا واقعی بٹ پاسٹری جانتا ہے؟"

"کوئے (کھوتے) کا سر جانتا ہے۔ دو چار کتابیں پڑھ لیں اور صنف نازک کو انو بنانے لگا۔"  
انگریزوں ہی پر کیا موقوف دنیا کی ہر قوم کی عورتوں کی یہ کی کمزوری ہے کہ جہاں کوئی پامسٹ نظر آ  
جائے وہ فوراً اپنی قسمت کا حال جاننے کی خواہش کرنے لگتی ہیں۔

"یہ تو اس کی ذہانت ہے خان صاحب۔ آپ بھی ایسا ہی کوئی گریک لیں اور یوں کے جھرمٹ میں  
زندگی بسر کریں....." میں نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"استغفر اللہ۔ میں ایسی شریک چیزیں کیوں سیکھوں؟"

"یہاں سیاحوں کی کشش کے لئے اور کیا کیا ہے؟"

"حسن۔ ستاحسن۔ عیاشی کے اڈے۔ گناہ کا کاروبار!"

خان صاحب کی غیرت ایمانی یکا یک بیدار ہو گئی۔ افسوس میں سر ہلاتے ہوئے بولے:

"یہاں عورتوں میں حیانا نام کی کوئی شے نہیں۔ جسم فروشی یہاں عام ہے۔ اسی لئے مختلف ممالک کے  
عیاش مرد یہاں کا رخ کرتے ہیں! کسی نے سچ کہا ہے۔ تھائی لڑکی تھائی (ران) دکھائے بغیر نہیں رہ  
سکتی!"

"خان صاحب غم نہ کیا کریں۔ یہ آج کا مسئلہ نہیں۔ جسم فروشی دنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے۔"

ہم دونوں اٹھ کر بٹ صاحب کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے گرد بیٹھی میموں میں گدرائے ہوئے بدن  
والی ایک غیر ملکی حسینہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ رنگ روپ اور ناک نقشے سے وہ کسی تھائی عورت کی ایسی اولاد لگتی



کی۔ اس کا باپ امریز تھا۔ یہ ملاپ ایک خوبصورت عین کا باعث بنا تھا جو بیک وقت سری و سری کی اور مغربی بھی۔ وہ بڑی ادا سے بٹ صاحب کے قریب بیٹھی انہیں ایک انگریز عورت کا ہاتھ پڑھتے دیکھ رہی تھی۔ بٹ صاحب نے ابھی اس لڑکی پر توجہ نہیں دی تھی۔ مجھے وہ اتنی پسند آئی کہ میں نے اسے گھیرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کچھ عرصہ پہلے مجھے چیمون نے ایک منتر بتایا تھا جسے پڑھ کر اگر کسی انسان پر پھونکا جاتا تو اس کا ذہن پڑھا جاسکتا تھا۔ میں نے ابھی تک یہ منتر کسی پر آزمایا نہ تھا۔ جی چاہا اس حسینہ پر تجربہ کروں..... چنانچہ میں نے بٹ صاحب کے ساتھ رسمی علیک سلیک کے بعد اس لڑکی کے قریب بیٹھتے ہوئے دل ہی دل میں منتر پڑھنا شروع کیا:

”آک شوالا، ہترے ما کوشی مارے کوشی شالا۔ اوم انامنا شورے گالا۔ آترما۔ آترما۔ آترما۔“  
منتر تین بار پڑھ کر میں نے بہانے سے اس لڑکی طرف پھونک ماری تو اس کے ذہن اور میرے ذہن کے درمیان ایک عجیب ریڈیائی رابطہ قائم ہو گیا۔ میں اس کا ذہن صاف پڑھ سکتا تھا۔  
”کون ہوتی؟“ میں نے ذہن ہی ذہن میں سوال کیا۔

”ڈورا۔ ڈورا سیانچی“  
کہاں رہتی ہو؟“  
”بنکاک ڈاؤن ٹاؤن میں۔“  
”میں ایک ٹورسٹ گائیڈ ہوں۔ چند دن ایک انگریز سیاح کو بنکاک کی سیر کروائی ہے۔ اب کسی نئے سیاح کی تلاش میں ہوں۔“  
”انگریز سیاح نے تمہیں کیا معاوضہ دیا؟“  
”پچاس ڈالر۔“

میں نے اس نوع کے متعدد سوال اور اس کی نجی زندگی، خواہشات اور امیدوں کے بارے میں بیٹھے بیٹھے کافی معلومات حاصل کر لیں تو بٹ صاحب سے کہا۔  
”بٹ صاحب۔ آپ کے لئے یہ بات باعث حیرت ہوگی کہ میں ابھی ایک پامسٹ ہوں۔ اگر براہ منائیں تو میں اس ”رنگدار“ حسینہ کا ہاتھ دیکھ لوں؟“

”براہ منانے والی کیا بات ہے ریاض صاحب۔ شوق سے اس کا ہاتھ دیکھئے۔ بلکہ جی چاہے تو اسے ہاتھ دکھائیے.....“ بٹ صاحب نے آنکھ ماری۔ پھر خود ہی خواتین سے انگریزی میں مخاطب ہوئے:  
”قابل عزت خواتین۔ یہ ہیں میرے دوست مسٹر ریاض جو پاکستان کے مشہور دست شناس ہیں۔ آپ میں سے جو کوئی انہیں ہاتھ دکھانا چاہے۔ ان کی خدمات مفت حاضر ہیں۔“

میرا حیا ہے، میں یہاں سے چلنا ہوں یہاں تو ایک نہ سدا و سدا معاملہ ہو لیا ہے!  
خان صاحب نے منہ بسورا۔

”آپ فی الحال ویٹریس کو آتے جاتے، بلکہ صرف جاتے ہوئے دیکھیں۔“ بٹ نے ہنستے ہوئے کہا تو خان صاحب اسے کوسے ہوئے واقعی وہاں سے چلے گئے۔

”یار بٹ تمہارا دوست ناراض تو نہیں ہو گیا؟“ میں نے پوچھا۔  
”نہ نہ۔ بہت پیارا اور کھرا انسان ہے۔ سچا پختون۔ جگری یار ہے میرا۔ ہماری اس طرح کی نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔“

اب ڈورا میری طرف متوجہ تھی اور اپنی نیلگوں سیاہ آنکھوں سے میری طرف اُمید اور تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے ہاتھ دکھانا چاہتی ہے؟  
”بالکل۔ مگر یہ جگہ تنگ اور پُر شور ہے ہم ادھر چل کر بیٹھتے ہیں۔“ اس نے ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں تو خود اسے کسی تنہا گوشے میں لے جانا چاہتا تھا۔ سو اس کے ساتھ کونے میں لگے ایک میز پر چلا گیا۔ وہ لڑکی بے حد خوبصورت تھی۔ اس کا چہرہ اتنا پرکشش تھا جیسے وہ چہرہ نہ ہو کوئی بہت بڑا مقناطیس ہو جو مجھے اپنی طرف شدت سے کھینچ رہا ہو۔ اس کی آنکھوں سے کوئی نشہ سا ٹپک رہا تھا جو مجھے مدہوش کئے جا رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو میرے جسم پر جذبات کی شدت کے سبب کپکپی سی طاری ہو گئی۔ میں نے اس کی گوری ہتھیلی پر پہلے اپنا سخت ہاتھ پھیرا۔ پھر بغور اس کے ہاتھوں کی لکیروں کا جائزہ لینے لگا اور اس کی سوچ پڑھنے لگا۔ وہ مجھے ہاتھ دکھاتے ہوئے اضمطراب کا شکار تھی۔ اسے شبہ تھا کہ میں پامسٹ نہیں ہوں بلکہ عام نوجوانوں کی طرح اس سے فلرٹ کرنا چاہ رہا ہوں۔ چونکہ وہ فارغ تھی اس لئے اسے فلرٹ پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ ایک آزاد خیال لڑکی تھی۔ کبھی کبھی اس کے ذہن میں یہ لہر بھی اٹھتی کہ ممکن ہے میں پامسٹ ہی ہوں۔ میں نے اس کے خیال کو تقویت دینے کا فوری فیصلہ کیا:

”تم ایک مخلوط النسل لڑکی ہو۔ تمہاری ماں ایک تھائی عورت تھی جس کی کسی انگریز سے دوستی تھی تم اس دوستی کی نشانی ہو۔“

وہ آنکھیں پپٹانے لگی۔ ان میں حیرت تھی مگر اس کا ذہن کہہ رہا تھا کہ جو کچھ یہ شخص بتا رہا ہے اس کا تعلق پامسٹری سے زیادہ کامن سینس سے ہے۔ میری شکل و صورت دیکھ کر کوئی بھی ذہن شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ میں مخلوط النسل ہوں۔

”تمہاری زندگی میں ایک حادثہ گزر چکا ہے.....“ میں نے آہستہ آہستہ پُر سوچ لہجے میں کہا۔ آج



سے دو یا تین سال پہلے مہاراجہ سیرمدوں کے ہاؤسوں ہو چکا ہے۔ اس سمدے کے سبب ہم بیمار ہوئی تھیں اور مہینہ بھر ہسپتال میں داخل رہیں۔ نامساعد حالات کے سبب تم زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر سکیں۔ تم نے اولیول تک ایک کانٹ اسکول میں پڑھا تھا۔ تم عیسائی ہو اور رومن کیتھولک چرچ کے نظریات پر عمل پیرا ہو۔“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔“ وہ مرعوب ہو گئی۔

”تم ایک رومان پسند، خوش اخلاق اور ہمدرد لڑکی ہو۔ تم موسیقی اور آرٹ سے لگاؤ رکھتی ہو۔ دوسروں پر جلد اعتماد کر لیتی ہو جس کے سبب کئی مرتبہ لوگوں سے دھوکا کھا چکی ہو۔ تم اکیلی زندگی بسر کر رہی ہو اور کسی جیون ساتھی کی تلاش میں ہو۔“

”جیون ساتھی مجھے کب ملے گا؟“ اس نے قدرے شرمناک سوال کیا۔

”ایک دو ماہ میں تمہاری مراد برآئے گی۔ وہ ایک غیر ملکی ایشیائی باشندہ ہوگا۔ ممکن ہے برصغیر پاک و ہند سے اس کا تعلق ہو۔“

”میں انڈین سب کانٹینیٹ کے باشندوں کو پسند کرتی ہوں۔ تم بھی تو وہاں کے ہو؟“

”ہاں۔ میرا تعلق پاکستان سے ہے۔“

”تم واقعی بہت بڑے پاسٹ ہو۔ تم نے میرے بارے میں جو کچھ بتایا ہے سو فی صد درست ہے۔“

”عزت افزائی کا شکریہ۔“

پھر ہم بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ میں نے اسے اس کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں جس سے وہ سحرزدہ سی ہو گئی۔ اس کا برتاؤ میرے ساتھ اس طرح کا ہو گیا جیسے میں کوئی دیوتا ہوں اور وہ دیوتا ہی ہے۔ میں نے اسے شیریں پلائی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا اثر رنگ دکھانے لگا۔ وہ مجھ سے تقاضا کرنے لگی کہ میں اسے اپنے ساتھ بیولیگون ہوٹل میں لے چلوں مگر میں نے دودوستوں کے ساتھ کو مد نظر رکھتے ہوئے معذرت کرنی۔ البتہ اس سے یہ وعدہ کیا کہ آئندہ شام اس کے ساتھ گزاروں گا۔

☆.....☆.....☆

بٹ اور خان میری خوش قسمتی پر رشک کر رہے تھے۔ اب میرا زیادہ وقت ڈورا کے ساتھ گزرتا۔ وہ میری گائیڈ بن کر مجھے بنکاک کی سیر کروا رہی تھی اور رات میرے کمرے ہی میں ہوتی تھی۔ اس نے اپنے ہوٹل باقرب اور شباب آفریں اداؤں سے مجھے مدہوش کر ڈالا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کا منصوبہ اپنے ذہن میں ترتیب دے رہی تھی جو مجھے اس کے خیالات پڑھ کر معلوم ہو گیا تھا۔ میں گھاٹ گھاٹ کا

میں نہیں ڈالتے، ہمیشہ آزاد زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان آبی پرندوں کی مانند، جو ایک خاص موسم بسر کرنے کے لئے نئی منزلوں کی طرف پرواز کرتے ہیں اور جہاں پانی نظر آئے جا اترتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

آخر پورن ماشی کی رات آن پہنچی۔ اس شام میں ڈورا کو ایک دور دراز جزیرے کی سیر پر لے گیا۔ میں نے ایک موٹر بوٹ کرائے پر حاصل کی تھی جس کا ملاح ایک بوڑھا چینی تھا۔ اسے میں نے ڈھیر ساری بخشش دی تھی جسے پا کر وہ نہال ہو گیا تھا۔ وہ ہم دونوں سے بے نیاز ہو کر موٹر بوٹ چلاتا رہا اور ہم چھوٹی سی بٹ میں ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ جب شام کے دھندلکے میں موٹر بوٹ اس سنسان جزیرے پر آ کر رکی تو اس پاس کا منظر سحر انگیز بھی تھا اور پراسرار بھی۔ جزیرہ جو چھوٹی چھوٹی سیاہی مائل سرسبز پہاڑیوں پر مشتمل تھا خاموشی کی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ کبھی کبھار کسی پرندے کی آواز سنائی دے جاتی تھی یا سمندری لہروں کی شراب جو آ کر ساحلی چٹانوں سے ٹکراتی تھیں۔ میں ڈورا کو سہارا دے کر ساحل پر اتر تو اس نے میری گردن میں اپنی سرسری بانیں جمائیں کرتے ہوئے نشیلا آنکھوں سے میری طرف بہت پیار سے دیکھا اور پوچھا:

”مجھے کہاں لے آئے جان؟“

”یہ جنت ہے ڈورا۔ ہمارے سپنوں کی جنت۔“

”اوہ ڈیر۔ یو آر ریگی لولی۔ آئی لویو۔ آئی لویو۔“ وہ مجھ سے چمٹ کر سکنے لگی۔

میں نے موٹر بوٹ کے ملاح کو آنکھ ماری تو وہ موٹر بوٹ جزیرے کے دوسرے کونے میں لے گیا۔ ہم دونوں اب ساحل پہ تنہا رہ گئے تھے۔ اس روز میرے بدن میں شباب کی گرمی آتش فشاں کے لاوے کی طرح ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ ڈورا کا بھی یہی حال تھا۔ اس کا منطقی نتیجہ وہی نکلتا تھا جو ایسی کیفیات میں نکلا کرتا ہے۔ ادھر لب ساحل پانی میں بھیگی ریت پر جوانی کی منہ زور لہریں سرچٹکتی رہیں اور ادھر چٹانوں کے ساتھ سمندر کی شوریدہ لہریں اٹھکیلیاں کرتی رہیں۔

سمندری چٹانوں کے عقب سے چودھویں کا چاند اپنے تمام تر جو بن کے ساتھ طلوع ہوا تو پورا جزیرہ چاندنی میں نہا گیا۔ جزیرہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت اور دل فریب نظر آنے لگا تھا۔ میں نے مدہوش ڈورا پر ایک اچھتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اٹھ کر بوڑھے ملاح کو دیکھنے لگا۔ وہ مجھے نظر نہ آیا۔ شاید کسی چٹان کے عقب میں چلا گیا تھا۔ اس نے موٹر بوٹ کا انجن بھی بند کر دیا تھا۔ فیول بچانا چاہتا ہوگا۔

”جان کدھر جا رہے ہو؟“ ڈورا کی نشے میں ڈوبی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”موٹر بوٹ والے کو ڈھونڈ رہا ہوں“



”واپس نہیں لوٹنا؟“

”نہیں۔ میں یہیں تمہاری بانہوں میں جان دے دینا چاہتی ہوں۔“ اس نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”تمہاری یہ تمنا ضرور پوری ہوگی بے وقوف لڑکی۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا اور اپنی جیب ٹٹولنے لگا جس میں اعشاریہ سات کا چھوٹا پستول تھا۔ میں نے اسے نکال کر اطمینان کر لیا کہ میگنیزین میں گولیاں موجود ہیں۔ پھر اس کا سیفٹی کچج لگا کر اسے واپس پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ یہ پستول میں نے ایک خاص مقصد کے لئے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ میں نے موٹر بوٹ والے کو تھوڑا دور جا کر تلاشا تو اسے ایک چٹان کے عقب میں اونگھتا پایا۔ میں واپس لوٹا اور ڈورا کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ وہ شاید تھک کر سوچکی تھی۔ اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں چگا ڈر کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ محسوس ہوئی جو چمپون کی آمد کا اشارہ تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سفید میکسی میں ننگے پاؤں حواس باختہ سی میرے سامنے کھڑی تھی۔ خلاف معمول اسے اس حال میں دیکھ کر میں چونک گیا۔

”کیا ہوا چمپون۔ خیریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں ہے محبوب!“

”پہیلیاں کیوں بکھواری ہو۔ صاف بات کرونا۔“

”پنڈت تلسی داس نے ایک بار پھر مجھے تسخیر کرنے کے لئے اپنا جاپ شروع کرنے کی تیاری کر لی ہے۔ اس بار اس کے ارادے بے حد خطرناک ہیں۔ لگتا ہے اب کی بار وہ مجھے تسخیر کر کے ہی دم لے گا۔“

”پنڈت تلسی داس کی ایسی تیسی۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ میں پہلے کی طرح اس بار بھی اس کا وار ناکام بنا دوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

”کاش میں اپنی ماورائی دنیا اور ازمنہ قدیم کے بابل واپس نہ گئی ہوتی تو اسے شپالی تیار کرنے کا موقع نہ ملتا۔۔۔۔۔“ اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”وہ رنگون کے ایک مندر میں بیٹھ کر شپالی تیار کر رہا ہے۔“

”شپالی؟ یہ کیا بلا ہے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”شپالی برما کے جنگلوں میں پائی جانے والی خون آشام چگا ڈروں کی کھوپڑیوں سے تیار کردہ ہار کو کہتے ہیں۔ اس پر شیوجی اور کالی کے منتر پڑھے جاتے ہیں۔ ہندوستان بھر کے سادھو، جوگی، بیراگی اور پنڈت اس کے حصول کے لئے برما کے جنگلات میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ برسوں کی تپسیا کے بعد کوئی منش شپالی تیار کرنے میں کامیاب ہوتا ہے اور خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہے۔ منتر

”ایسی کیا خاص بات ہے شپالی میں؟“

”جو آدمی شپالی کا ہار یا مالا اپنے گلے میں پہن لے، کامیابی اس کے قدم چومنے لگتی ہے۔ اس کا ہر قدم کامرانی کی طرف اٹھتا ہے۔ ہر ارادہ شرمندہ تکمیل ہو جاتا ہے۔ اسے تم ایک طرح کا ”عمل انگیز“ سمجھ لو۔۔۔۔۔“

”ہونہ۔ تو گویا شپالی کی موجودگی میں پنڈت جو بھی جاپ کرے گا وہ ضرور کامیابی سے ہمکنار ہوگا؟“

”بالکل۔۔۔۔۔“

”پھر تو سب سے پہلے اس سے شپالی چھیننی چاہئے۔“

”میں یہی چاہتی ہوں۔“

”فکر نہ کرو۔ میں اس کی گردن سے شپالی اتارنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دوں گا۔۔۔۔۔“

”مجھے تم سے یہی امید ہے محبوب۔“ وہ پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”مگر اس سے شپالی چھیننے کے لئے تمہیں آج رات بارہ بجے کی فلائٹ سے رنگون جانا پڑے گا۔ پنڈت کل وہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے ضرور کچھ کریں گے مگر پہلے تمہارے لئے تازہ خون کا بندوبست کر دوں۔ ایک جوان اور صحت مند لڑکی تمہارے لئے گھیر کر لایا ہوں۔ یاد کرو میں نے تم سے ایسی ہی تروتازہ لڑکی کا خون بہم پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔۔۔۔۔“

”مجھے تمہاری یہی ادا تو پسند ہے۔ تم وعدے کے پکے اور قول کے سچے ہو۔“

”تم یہاں رُک جاؤ! میں اس کا کام تمام کرنے کی تیاری کرتا ہوں۔“ میں نے اسے ایک جھاڑی کے پیچھے روکتے ہوئے کہا۔

میں ڈورا کے قریب پہنچا تو وہ نیند کے مزے لے رہی تھی۔ حالت خواب میں وہ بہت پیاری اور دلکش لگ رہی تھی۔ چاند کی کرنیں اس کے چہرے اور نسوانی جو بن پر عجیب بہار دکھلا رہی تھیں۔ لمحہ بھر کے لئے اس کا حسن مجھے سحر زدہ کر گیا مگر پھر کام نپٹانے کا خیال ہر دوسرے خیال پر غالب آ گیا۔ میں نے پاؤں سے اس کی ران کو ٹھکرایا تو وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی اور قدرے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ اسی لمحے میں نے اپنے پیتل کی ٹو والے نوک دار بوٹ کی زوردار ٹھوک اس کی گردن اور دہانے کے جوڑ پر دے ماری۔ اس کی شاہ رگ سے خون فوارے کی طرح پھوٹا۔ میری دوسری ٹھوک اس کے سر پر لگی جس نے اسے بے ہوش کر دیا۔ اس دوران اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی تھی جو ویرانے میں کسی بدروح کے واویلے کی طرح



”اسے چھوڑ کر بھاگ جاؤ محبوب۔“ مجھے عقب میں چپوں کی غراہٹ سنائی دی۔“ میں اب رنگوں میں تم سے ملوں گی۔ باقی باتیں وہاں ہوں گی۔۔۔۔۔ تمہیں کنفرم ٹکٹ سائیڈ ٹیبل پر پڑا مل جائے گا۔۔۔۔۔“ میں اُلٹے قدموں واپس بھاگا۔ میرا رخ موٹر بوٹ کی طرف تھا۔ میں شتم پشتم ملال کے پاس پہنچا۔ وہ سخت حواس باختہ تھا۔ اس نے ذرا کی ہولناک چیخ سن لی تھی۔ اس کے سارے بدن پر کپکپی طاری تھی اور منہ سے آواز تک نہ نکل رہی تھی۔۔۔۔۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ چیخ کیسی تھی؟“ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا۔

”مم۔۔۔۔۔ میری ساتھی کو گوریلے نے پکڑ لیا ہے۔ میں مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ جلدی کرو۔ یہاں سے بھاگ چلیں ورنہ گوریلا ہم پر بھی حملہ کر دے گا۔“

میری بات سن کر وہ جلدی سے موٹر بوٹ میں جا گھسا۔ میں بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے انجن اسٹارٹ کیا اور موٹر بوٹ سمندر کے سینے پر دوڑا دی۔ موٹر بوٹ کی رفتار بے حد تیز تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم نے جزیرہ پیچھے چھوڑ دیا۔

”ویسے صاحب میں نے آج تک ان جزیروں میں گوریلوں کی موجودگی کے بارے میں نہیں سنا۔ یہاں بندر، لنگور اور چھوٹے موٹے جانور تو ہیں، بن مانس اور گوریلے بالکل نہیں پائے جاتے۔۔۔۔۔“ بوڑھے ملاج کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

”تمہارا مطلب ہے میں نے جھوٹ بولا ہے؟“ میں نے غصیلی آواز میں کہا تو وہ سہم گیا۔

”نہیں نہیں صاحب۔ میرا یہ مطلب تو نہیں۔“

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ پولیس وغیرہ کو یہ کہانی سنائیں گے تو اس پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔۔۔۔۔“ اس نے آنکھیں چرا تے ہوئے آہستگی سے کہا۔

بڑھا میرے اندازے سے زیادہ کائیاں تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ بڑھے کو کچھ رقم دے کر چپ کراؤں یا کیا کروں۔ مجھے رات بارہ بجے رنگون روانہ ہو جانا تھا۔ اس کے بعد کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، مگر اس سے پہلے اگر پولیس کو اس قتل اطلاع مل جاتی تو سخت گڑبڑ ہو سکتی تھی۔۔۔۔۔

”ویسے پولیس کو کیسے خبر ہو سکتی ہے؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔ ”تمہارے علاوہ کسی کو پتہ نہیں کہ کوئی لڑکی میرے ساتھ موٹر بوٹ پر سوار ہوئی تھی۔۔۔۔۔؟“

”یہاں کی پولیس بڑی تیز ہے صاحب۔ اسے پتہ چلا جاتا ہے۔ ہاں اگر انہیں پیشگی کچھ دے دلا دیں تو ان کا منہ بند ہو جاتا ہے۔“

”اچھا تمہارے ساتھ مل کر اس کا بھی بندوبست کر لیں گے۔ فی الحال تم موٹر بوٹ چلاؤ۔“ میں نے

اس کے منہ سے پرچی دی اور بخور دیئے گا۔۔۔۔۔ موٹر بوٹ اس طرح چلائی جاتی ہے۔ بظاہر یہ کام مشکل نہیں لگ رہا تھا۔

جب بنگاک شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں تو میں نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اگلے ہی لمحے پستول میرے ہاتھ میں تھا۔

”سن بڑھے۔ جو لوگ ضرورت سے زیادہ چالاک بنتے ہیں ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔“ میں نے پستول کا سیفٹی لاک ہٹاتے ہوئے کہا۔

بڑھا ملاج میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے ساکت ہوا۔ پھر اس نے چھپاک سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔۔۔۔۔ وہ پانی کی گہرائی میں اتر گیا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر متلاطم سطح سمندر کو دیکھنے لگا۔ مگر اس کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔

☆.....☆.....☆



”نور تھ ایونیو چلو.....“

ٹیکسی ڈرائیور نے مستعدی سے گیر بدلہ اور ٹیکسی خالی سڑک پر دوڑنے لگی۔ نور تھ ایونیو پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور تھوڑی دور جا کر ایک ڈرگ اسٹور کے سامنے کھڑی دوسری ٹیکسی پکڑ لی۔  
”بلیو لیگون.....“ میں نے دھیرے سے کہا اور ٹیکسی کی عقبی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆.....☆.....☆

میں اور چپون ”ہالیڈے ان“ کی لابی میں بیٹھے تھے۔ وہ بہت متفکر تھی۔ ”دیکھو پنڈت تلسی داس کے پاس جاتے ہوئے بے حد احتیاط کرنا۔“ اس نے مجھے تاکید کی۔ ”وہ شپالی کی وجہ سے حد سے زیادہ محتاط ہے اور اپنے تین چیلوں کے ساتھ دریائے ارادوی کے کنارے ایک قدیم مندر میں روپوش ہے۔ آج آدھی رات کے بعد وہ ایک جیپ پر اپنے چیلوں سمیت ہندوستان روانہ ہوگا۔ وہ جس زمینی راستے کو اختیار کرے گا وہ گھنے جنگل سے گزرتا ہے اور ایک پہاڑی گاؤں کے قریب ہندوستان میں داخل ہوتا ہے۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دیتی ہوں۔ گاؤں کے باہر ایک ویران ڈاک بنگلہ ہے تم اس میں جا چھو اور سڑک پر پتھر وغیرہ رکھ کر رکاوٹ بنا دو۔ جب جیپ وہاں پہنچے گی تو لامحالہ آہستہ ہوگی۔ اس وقت تم اندھیرے سے نکل کر ان پر حملہ کر دینا اور پنڈت کے گلے سے شپالی کھینچ کر اسے توڑ دینا۔ جونہی شپالی کا دھاگہ ٹوٹا اس کا سحر ختم ہو جائے گا۔ پنڈت بوڑھا آدمی ہے۔ اگر تم اسے مار ڈالو یا بڑی طرح گھائل کر دو تو وہ مجھے تسخیر کرنے کے قابل نہ رہے گا اور میں ہمیشہ تمہاری رہوں گی.....“

”تم فکر نہ کرو، میں نہ صرف اس کی شپالی توڑوں گا بلکہ اس کی ہڈیاں بھی توڑ ڈالوں گا۔ میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ کوئی مجھ سے میری نیلم..... میری چپون چھینے کی جسارت کرے!“ میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

”میں خود نہیں چاہتی بولی کہ میں تجھ سے لمحہ بھر کے لئے بھی جدا ہوں.....“ وہ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہاری کارکردگی شاندار ہے۔ مجھے خون بہم پہنچانے میں تم کسی تساہل کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ مجھے اُمید ہے تم بھی اپنے دادا جان کے دوست مہندر پرتاب کی طرح چالیس بلیوں کا ہدف پورا کر لو گے اور دانگی شباب پانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔“  
”دیکھو کیا ہوتا ہے!“ میں مسکرا دیا۔

☆.....☆.....☆

میں رام گڑھ نامی پہاڑی گاؤں کے ویران ڈاک بنگلے میں ایک ستون کے پاس چھپا کھڑا تھا۔



چینی ملاح جس کی عمر پینسٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی، سمندر کی گود میں پلا تھا۔ اس کے لئے میل دو میل کی زیر آب تیراکی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے بروقت فیصلہ کیا تھا اور سمندر کے اندر تیرتا ہوا کہیں دور نکل گیا تھا۔ اگرچہ پورے چاند کی رات تھی اور سمندر متلاطم تھا مگر اس جیسے ماہر تیراک کے لئے خود کو میری نگاہوں سے اوجھل رکھتے ہوئے ساحل پر جا پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ ویسے بھی لہروں کا بہاؤ ساحل کی جانب تھا جو اسے تیزی سے خشکی کی طرف سفر کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود جب وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا تو میں نے موٹر بوٹ کا رخ ساحل کی طرف کیا اور اسے تھرائل پر رکھ لیا۔ میں جلد از جلد ساحل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ بوڑھا مجھ سے پہلے کنارے پر پہنچ گیا تو چھوٹے ہی ساحل پر پھرنے والے پولیس کے سپاہیوں کو واردات کی اطلاع دے ڈالے گا اور وہ مجھے منٹوں میں گرفتار کر لیں گے۔ میں کسی نئی مصیبت کو گلے لگانے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھا۔ رات بارہ بجے کی فلائٹ سے مجھے رنگون روانہ ہونا تھا۔ میں نے رسٹ وایج پر نظر ڈالی۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ کمرے میں پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ مزید ضائع ہو جاتا۔ اس کے بعد نئے سفر کی تیاری، ہوٹل کے بل کی ادائیگی، ایئر پورٹ کی طرف روانگی اور وہاں گھنٹہ بھر پہلے پہنچنے کی پابندی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میرے پاس وقت بہت محدود تھا۔

ساحل پر پہنچتے ہی میں نے موٹر بوٹ کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑا اور ساحل کی ریت پر شتم چلتا ایک جھونپڑے کے عقب میں جا ٹھہرا۔ اتفاق کہیے، یا میری خوش قسمتی اس وقت دور و نزدیک کوئی دوسرا شخص نہیں تھا جو اس بات پر توجہ دیتا کہ موٹر بوٹ ملاح کے بغیر پہنچی ہے اور اب لہروں کے دوش پر بے یار و مددگار ہچکولے کھا رہی ہے۔ میں نے اسے ریلنگ کے ساتھ باندھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

سائنس اُستوار کر کے میں جھونپڑے کے عقب سے نکلا تو کچھ دور سڑک کے کنارے ایک ٹیکسی نظر آئی۔ میں لپک کر اس میں بیٹھا اور جلدی سے کہا:



چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا اور سارے گاؤں میں ہو کا عالم تھا۔ کبھی کبھی قریبی جنگل سے کسی درندے کی دھاڑ یا بندر کی چیخ و پکار سنائی دیتی تھی اور بس..... میرے سامنے چند گز کے فاصلے پر ایک شکستہ سڑک تھی جو ہندوستان کی طرف جاتی تھی۔ میں نے اس پر بھاری پتھر لڑھکا کر رکاوٹ پیدا کر دی تھی اور اب پنڈت تلسی داس کی جیب کا انتظار کر رہا تھا۔

سحری کا وقت ہو گا جب مجھے اپنے عقب میں خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی ایک عجیب سرسراہٹ تھی جسے سن کر میرے پورے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ مجھ سے صرف پانچ گز دور ایک نہایت خوفناک اور کریہہ مخلوق پیچھے دو پاؤں پر کھڑی ریچھ کی طرح جھوم رہی تھی۔ اس کا جسم بھاری تھا اور قدم از کم آٹھ فٹ۔ سارے جسم پر ریچھ کی طرح بال تھے تاہم چہرہ انسان سے کسی قدر مشابہہ تھا۔ اس کا ماتھا تنگ تھا۔ آنکھیں بھینس کی طرح موٹی اور خوفناک حد تک سرخ۔ ناک بھیڑیے کی تھو تھنی سے مشابہہ تھی لبے پیلے دانت تیز دھار خنجر کی طرح کسی کو کاٹ ڈالنے کے درپے معلوم ہوتے تھے۔

”کک..... کون ہو تم؟“

اس کے حلق سے بھرائی ہوئی انسانی آواز نکلی۔ ”کالی کا بیر..... شکر!“

”کک کیا چاہتے ہو.....؟“ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے سوال کیا۔

”تم جس ارادے سے یہاں چھپے بیٹھے ہو اسے ترک کر کے یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں تمہاری گردن کاٹ کر کالی کے چرنوں میں جا پھینکوں گا.....!“

”یہ..... یہ تو ممکن نہیں۔“ میں نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی چپوں کا داس ہوں۔ جانتے ہو اسے؟“

”جانتا ہوں!“ اس نے بھیا تک انداز میں قہقہہ لگایا۔ ”مگر کالی دیوی کے مقابل اس کی کیا اوقات؟“

”اگر وہ ایسی ہی گنی گذری چیز ہے تو پنڈت اسے حاصل کرنے کے لئے کیوں مراجارہا ہے؟“ میر نے سوال کیا۔ ”اس پر قابو پانے کے لئے شپالی کے لئے کیوں مارا مارا پھرتا رہا ہے؟“

”سالی جوان اور سدا بہار ہے نا..... کالی تو سب کی ماما ہے پر تو چپوں جو رو بن جاوے ہے۔ پتہ کون مرد اسے حاصل کرنا پسند نہ کرے گا!“ اس نے بے ہنگم انداز میں قہقہہ لگایا۔

”اچھا اچھا کواں نہ کرو.....“ میں نے غصے سے کہا اور زیر لب ایک منتر پڑھنے لگا جو بلاؤں کو جلا بھسم کرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ جونہی میں نے منتر شروع کیا۔ شکر جھکا اور زمین سے مٹی کی..... مٹی اٹھا کر پھینکتے ہوئے چیخا:

”کالی..... نکلتے والی۔ اتر ا بھاوے شیو کا چالی!“

جونہی اس کے منہ سے یہ منتر نکلا۔ مجھے یوں لگا جیسے یکا یک میرا وجود خوفناک گرد باد کی لپیٹ میں آ گیا ہو..... میں پھر کی کی طرح نہایت تیز رفتاری سے گھوما اور میرے ہوش و حواس جاتے رہے۔ پھر چند ہی لمحوں کے بعد مجھے کسی نے میرے بستر پر لا پٹکا..... میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے پسلیوں کا حصار توڑ کر باہر نکلنے والا ہو۔ مجھے صرف یہ احساس ہوا کہ میں ہوٹل کے کمرے میں ہوں۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆.....☆.....☆

صبح سات بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو چپوں میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ بے حد متفکر اور پریشان تھی۔ میں نے آج تک اسے اتنا مغموں نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر بولی:

”محبوب! پنڈت تلسی داس اس بار پوری تیاری میں ہے۔ میرا اس پر کوئی بس نہیں چل رہا۔ اس نے کالی کے بیر شکر کے ہاتھوں تمہارے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میری شکلیاں اس کی شکلیوں کا مقابلہ نہیں کر پار ہیں..... بہر کیف ہمیں اتنی جلدی ہار نہیں ماننی چاہئے۔ میں نے تمہارے لئے دہلی کی سیٹ بک کروائی ہے۔ دس بجے کی فلائٹ سے دہلی چلے جاؤ۔ وہاں ایک پرانے مندر کے تہہ خانے میں پنڈت مجھے تسخیر کرنے کے لئے جاپ شروع کرے گا۔ اسے اس امر سے باز رکھنا تمہارا کام ہے۔ بصورت دیگر تم مجھے کھو بیٹھو گے.....!“

”کیسے شبد منہ سے نکال رہی ہو.....!“ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ہر گز تم سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ اس بار میں اس خبیث پنڈت کو زکھ میں بھیج کر ہی واپس آؤں گا۔ نہ رہے گا بانس۔ نہ بجے گی بانسری!“

”اچھا..... وقت کم ہے، مجھ سے مل لو.....“ وہ رومانی ہو گئی اور مجھ سے چمٹ گئی۔ میں اس کی آنکھیں، ہونٹ، بال اور گردن چومنے لگا۔

”تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا..... کوئی نہیں!“ میری آنکھیں بھرا آئیں۔

”کاش تمہارا کہا ج ہو.....“ وہ سسکنے لگی۔

”تم تو عظیم شکلیوں کی مالک ہو.....“ میں نے امید و یاس کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔ ”ایسے چھوٹے موٹے پنڈت، عامل اور سنت تمہارا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ تم خود کہا کرتی تھیں کہ تم نے ایسے عامل بہت دیکھے ہیں۔ بنگالی بابے کا تم نے جو حشر کیا تھا، وہ بھی مجھے معلوم ہے.....؟“

”پنڈت تلسی داس کوئی چھوٹا موٹا پنڈت نہیں۔ وہ کالی دیوی کا چیلہ اور شیو دیوتا کا داس ہے۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس نے ان گنت جاپ کئے اور بڑی کٹھناؤں کا سامنا کیا ہے۔ سب



سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ شپالی حاصل کر چکا ہے جس کے بعد اس نے ارادوں کی نیس میں کوئی رکاوٹ حاصل نہ ہو سکے گی۔ ہاں اگر تم انجانے میں اسے موت کے گھاٹ اتارو تو یہ بلا سر سے ٹل سکتی ہے!“

”تم فکر نہ کرو، میں اب یہی کروں گا۔۔۔۔۔ میری اچھی چمپون، میں یہی کروں گا!“ میں نے جذباتی لہجے میں کہا تو وہ مجھ سے لپٹ گئی اور بار بار مجھے چومنے لگی۔۔۔۔۔ میری رگوں میں خون جوش مارنے لگا۔ انتہائی ہجانی کیفیت میں میں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔۔۔۔۔

جب ہم ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو رنگوں سے دہلی کی جانب فلائٹ کی روانگی میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔۔۔۔۔ میں بجلت تیار ہوا اور چمپون سے رخصت لے کر ایئر پورٹ روانہ ہو گیا۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

میں ایئر پورٹ کے لاؤنج میں الگ تھلگ صوفے پر بیٹھا تھا۔ جہاز کی روانگی میں تھوڑی دیر ہو گئی تھی۔ کوئی فنی خرابی تھی جسے دور کیا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ میں نے سوچا چائے پی لوں۔ اس ارادے سے اٹھا ہوا تھا کہ ایک جٹادھاری سادھو جس نے گیروے رنگ کا لباس اور لاتعداد منگے گردن میں مالاؤں کی صورت میں پہن رکھے تھے میرے قریب آیا اور دھیرے سے بولا:

”بالک! میں تمہارے لئے پنڈت تلسی داس کا پیغام لایا ہوں۔۔۔۔۔“

میں ٹپٹا گیا۔

”کیا پیغام ہے سادھو مہاراج؟“

”ان کا کہنا ہے کہ سیدھے سبھاؤ واپس لوٹ جاؤ۔۔۔۔۔ ہندوستان میں داخل ہونے کی کوشش مہنگی پڑے گی۔۔۔۔۔“

”اور بھی کچھ کہا انہوں نے؟“ میں نے تنگ آ کر پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ بس یہی پیغام تھا۔“ سادھو نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے پیغام مجھے مل گیا ہے۔ اب آپ سدھاریے۔“ میں نے رکھائی سے کہا اور چائے کے اسٹال کی طرف بڑھ گیا۔

سادھو ششدر اور دمخو دوہیں کھڑا ہا گیا۔ پھر اس نے کندھے اُچکائے اور یہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا:

”رام نام ست ہے!“

جہاز میں پچاس کے لگ بھگ ملکی اور غیر ملکی مسافر سوار تھے جن میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔

تھوڑی تعداد بزرگوں اور بچوں کی بھی تھی۔ طیارے کا عملہ خوش اخلاق اور اسماٹ تھا۔ خاص طور پر ایک

ایئر ہوسٹس جس کے اُبھرے سینے پر ”انیتا“ کی نیم پلیٹ آویزاں تھی، مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کا

رنگ سا لولا مگر بینکس ٹیکسلا سے براہِ مد ہونے والے نے سسوں جیسے تھے۔ وہ چغتائی آرٹ کا نادر نمونہ نظر آتی تھی۔ ترشا ہوا بدن، بڑی بڑی کاہل بھری آنکھیں، دراز زلفیں، ستواں ناک، روایتی انڈین ساڑھی میں سولہ سنگھار کئے وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ وہ مسکرا کر سب مسافروں سے کھانے پینے کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ میرے پاس آئی تو دھیرے سے پوچھا:

”آپ کیا کھانا پینا پسند کریں گے؟“

میں نے بے ساختہ کہا۔ ”آپ کو دیکھتے ہی اپنی بھوک مٹ گئی ہے، البتہ پیاس سے حلق میں کانٹے چبھنے لگے ہیں۔ کوئی تازہ مشروب پلا دیں۔“

”آپ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔“ اس نے ایک ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پہلے تو نہیں تھا، اب ہو گیا ہوں!“

”میں آپ کے لئے انناس کا جوس لاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کافرانہ چال چلتی کیبن کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک دیدہ زیب گلاس میں انناس کا جوس لے آئی اور گلاس مجھے تھما کر چلی گئی، مگر آتے جاتے وہ مجھ پر اور میں اس پر ایک شوخ نگاہ ڈالنا لازم سمجھتے۔۔۔۔۔

طیارہ غالباً مشرقی پاکستان اور بھارت کی سرحدوں پر تھا جب اچانک مجھے دائیں جانب کھڑکی کے شیشے پر پنڈت تلسی داس کی شبیہ نظر آئی۔ وہ دانت پیستے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا:

”تجھے کہا تھا مورکھ بھارت کا رخ نہ کرنا پرنتو تم نہیں مانے۔ اب دیکھنا میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔۔۔۔۔“

میرے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ طیارے میں یوں بھی مسافر گنجائش سے کم تھے۔ اس لئے کسی کو خبر نہ تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

”تم میرا کیا کر لو گے تلسی داس۔ چمپون کی کرپا سے میں بھی بے حساب شکلیوں سے مالا مال ہوں۔ میں تمہیں نرکھ میں بھیج دوں گا۔ تم کبھی اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔“

”کلکتہ میں دس پندرہ منٹ کا اسٹاپ اور ہے۔ بہتر ہوگا کہ یہاں اپنا سفر ختم کر دو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“ وہ مجھے دھمکانے لگا۔

”تم میرا کیا بگاڑ لو گے؟ طیارے کا رخ موڑنے سے تو رہے۔۔۔۔۔“

”مجھے چیخ نہ کرو بالک۔ میں کیول دھمکاتا نہیں، جو چاہوں کر گذرتا ہوں۔“ اس نے پھنکارتے ہوئے کہا اور پھر غائب ہو گیا۔

اس کا ہزاروں فٹ بلندی پر محو پرواز طیارے کی کھڑکی پر ظاہر ہونا اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ بہت شکستی مان پنڈت ہے۔ اس سے ٹکر لینا خالہ جی کا گھر نہیں تھا مگر چمپون نے مجھے بھی بہت سی شکستیاں



عطائی میں بن لے بن بوئے پر میں اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مجھے بہت سے سزا برکے۔ میں نے اس کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لانے کا فیصلہ کیا۔

طیارہ کلکتہ کی فضاؤں میں داخل ہوا اور دو پتھر کاٹنے کے بعد رن وے پر اتر گیا۔ جن مسافروں کو کلکتہ اترنا تھا، اتر گئے۔ چند نئے مسافر جنہیں دہلی جانا تھا کلکتہ سے عازم سفر ہوئے۔ اس دوران میں طیارے ہی میں بیٹھا رہا۔ بس ایک بار واش روم تک گیا۔ واش روم سے نکلا تو راہداری میں انیتا سے مل بھٹھیر ہوئی۔

”آپ تو دہلی جا رہے ہیں نا؟“ اس نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔ میری خوش بختی ہے کہ آپ کا ساتھ دہلی تک حاصل رہے گا۔“

”آپ باتیں بہت اچھی کرتے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”باتوں کا“ کھٹیا“ ہی تو کھاتا ہوں!“ میں نے اردو میں پنجابی کا ترکا لگایا۔

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔ مذاق کر رہا تھا۔“

”میں دہلی میں کنٹ پبلش میں رہتی ہوں اور آپ؟“

”میں سیلانی ہوں۔ ساری دنیا میں گھومتا پھرتا رہتا ہوں۔ کبھی دہلی، کبھی نیویارک، کبھی بنکاک، کبھی ٹوکیو، مستقل قیام کہیں نہیں۔“

”اچھا! پھر آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟“

”ٹورازم۔۔۔ ایک فرم کا منیجر ہوں۔ جس کا دفتر نیویارک میں ہے۔“

”گریٹ!“ وہ متاثر نظر آنے لگی۔ کچھ دیر بعد بولی:

”کیا آپ شادی شدہ ہیں؟“ یہ عورتوں کا مخصوص سوال ہوتا ہے۔ اچھا کماؤ مرد دیکھتے ہی ان کی رال پٹکنے لگتی ہے اور مرد جو ہری چک ہوتے ہیں، عورتوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

”نہیں۔۔۔۔۔“

”کیوں؟“ اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

”کوئی اچھی لڑکی نہیں ملی۔ ملی تو سوچیں گے۔۔۔۔۔“ اس دوران پائلٹ نے انیتا کو کسی کام کے لئے طلب کیا اور وہ معذرت کر کے چلی گئی۔ میں اپنی سیٹ پر واپس جا کر بیٹھ گیا۔

طیارہ دوبارہ پرواز کے لئے تیار ہوا تو ایک بار پھر پنڈت تلسی داس کا مکروہ چہرہ کھڑکی کے شیشے

نمودار ہوا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

”تو تم اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”تو تم اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

میں نے جواب میں لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

میں اب بھی کہہ رہا ہوں کہ ومان (طیارے) سے نیچے اتر جاؤ۔ یہ سے بیت گیا تو پچھتاوے کے سوا

تمہارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔“

”چمپون کے ہوتے ہوئے میں تمہاری گیدڑ بھکیوں سے ڈرنے والا نہیں۔ جب تک اس کی سہانیا

حاصل ہے، میں تمہارا مقابلہ کرتا رہوں گا۔“

”ہم کالی کے داس ہیں اور تیرے گرد اس کا حصار کھینچ چکے ہیں۔ چمپون اب تمہاری مدد کو نہیں پہنچ

سکے گی۔ تمہاری بہتری اس میں ہے کہ فوراً ومان سے اتر جاؤ ورنہ تمام عمر پچھتاؤ گے۔۔۔۔۔“

”اچھا اچھا جو کرنا ہے کرلو، میں اس طیارے سے اترنے والا نہیں۔ میں دہلی ضرور جاؤں گا اور اس

کے بعد تمہارے جاپ کو خاک میں ضرور ملاؤں گا۔ میرے جیتے جی تم چمپون کو تسخیر نہیں کر سکو گے۔ وہ

میری دولت ہے، میری عزت ہے، میرا سب کچھ ہے۔ اسے تمہارے شر سے بچانے کے لئے میں اپنی

جان کی بازی لگا دوں گا۔“

”خواتین و حضرات! انڈین ایئر لائن کی پرواز IN 305 کلکتہ سے دہلی کی طرف پرواز کے لئے تیار

ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لیں، کرسی کی پشت سیدھی کر لیں اور۔۔۔۔۔“

”یہاں سے دفعان ہو جاؤ“ میں نے غصے سے کہا۔ ”میں مزید تمہاری مکروہ شکل مہیکھنے کی کوئی

خواہش نہیں رکھتا۔“

”اچھا بالک جیسی تمہاری اچھا!“ اس نے گرم لہجے میں کہا۔ ”ہم تو چاہتے تھے کہ تمہاری وجہ سے

ومان کے دوسرے بے گناہ مسافر نہ مارے جائیں۔ پرنتو تمہاری ہٹ دھرمی قائم ہے تو ہم کیا کر سکتے

ہیں۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔ کتنی ہی دیر اس کے آخری الفاظ کی سنسنہٹ میرے کانوں میں گونجتی

اور مجھے بے چین کرتی رہی۔ طیارہ رن وے پر دوڑ رہا تھا اور کسی لمحے فضا میں بلند ہو سکتا تھا۔ اب کچھ نہیں

ہو سکتا تھا۔ میری چھٹی حس نے بہت دیر سے مجھے یہ احساس دلایا کہ پنڈت جو منتقم مزاج بھی ہے اور بے

رحم بھی، مجھے دہلی پہنچنے سے روکنے کے لئے کوئی بے حد خطرناک کارروائی کرے گا۔

ایک گھنٹہ بالکل خیریت سے گزر گیا تو مجھے اطمینان ہونے لگا کہ پنڈت دھمکیاں محض گیدڑ بھکیاں

تھیں۔ وہ مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح کلکتہ اتر جاؤں اور اس کے جاپ میں نخل نہ ہوں۔ وہ

چاہتا ہوگا کہ چپ چاپ خاموشی سے ایک ویران مندر کے اندھیرے گوشے میں بیٹھ کر اپنا جاپ مکمل کر

لے۔ اس کے لئے اسے یکسوئی درکار تھی۔ اگر میں اسے تنگ کرنے پہنچ جاتا تو اس کے لئے اپنا جاپ مکمل

کرنا محال تھا۔

انیتا میرے پاس سے گزری تو میری درخواست پر وہ چند منٹوں کے لئے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گئی



اور مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ اس دوران پائلٹ نے اسپیکر پر مطلع کیا کہ طیارہ لکھنؤ کے قریب پہنچنے والا ہے لیکن چونکہ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور کوہ ہمالیہ کی سمت سے تیز ہوائیں چل رہی ہیں اس لئے طیارہ لکھنؤ اترنے کی بجائے سیدھا دہلی جائے گا۔

یہ اعلان سن کر طیارے میں ہلکی سی بھنبھناہٹ ہوئی۔ چند مسافر جو لکھنؤ اترنے والے تھے موسم کی خرابی کو کوسنے لگے اور بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگے کہ موسم کسی طرح ٹھیک ہو جائے تاکہ وہ خواری اور پریشانی سے بچ سکیں۔

”ویسے حیرت ہے جب ہم کلکتہ سے چلے تھے تو کنٹرول ٹاور نے لکھنؤ کے علاقے میں خراب موسم کا ذکر بالکل نہیں کیا تھا؟“ انیتا نے مجھ سے کہا۔

”بسا اوقات موسم اچانک بھی خراب ہو جاتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لکھنؤ کے شمال میں نیپال کے بلند و بالا برف پوش پہاڑ اور کوہ ہمالیہ کا طویل سلسلہ ہے جہاں ہر موسم میں طوفانی بارشیں اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر برف باری ہوتی رہتی ہے۔ ایسے میں قریبی علاقوں پر موسم کے تغیر و تبدل کا اثر پڑنا ایک فطری بات ہے۔“

ابھی میں نے اپنا فقرہ مکمل بھی نہ کیا تھا کہ جہاز کے کیبن سے معاون پائلٹ گھبراتا ہوا باہر نکلا:

”بھگوان جانے کیا ہو رہا ہے۔ ہم بادلوں کے سمندر میں پھنس گئے ہیں اور جہاز کے قطب نما لٹو کی طرح گھوم رہے ہیں کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ طیارہ کس سمت جا رہا ہے؟“

معاون پائلٹ کی بات سن کر طیارے کے مسافروں میں سراسیمگی پھیل گئی۔

”راہول بھیا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ انیتا گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ طیارے کے مسافروں کو ہنگامی حالت سے آگاہ کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم دہلی کی بجائے شاید نیپال کی سمت محور پرواز ہیں۔ روٹی کی مانند اڑنے والے برف کے گالے تیزی سے فضا میں پھیل رہے ہیں جو میرے اس شبے کو تقویت پہنچانے کا سبب بن رہے ہیں۔“

”ہائے رام! اگر طیارہ پہاڑوں سے ٹکرا گیا تو ہمارا کیا بنے گا؟“ انیتا رندھی ہوئی آواز میں بولی اور کیبن کی طرف دوڑ لگا دی۔

معاون پائلٹ کی بات سن کر مسافروں میں کہرام مچ گیا۔ وہ رونے پٹینے لگے۔ کچھ اونچا اونچا رام رام کرنے لگے اور مختلف دیوی دیوتاؤں کو مدد کے لئے پکارنے لگے۔ طیارے میں چند مسلمان مسافر بھی تھے جن کے منہ سے لا الہ الا اللہ کا ورد جاری تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ میں بھی سخت حواس باختہ ہو گیا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے اپنی گناہ آلود زندگی کی

ساری فلم چشم زدن میں چلی اور میں عرق ندامت میں غرق ہو گیا۔ اب مجھے بھی خدا یاد آ رہا تھا۔

”یا اللہ مجھے معاف کر دے۔ مجھ گناہگار کو معاف کر دے!“ میں گڑ گڑایا۔

برف کا طوفان ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہونے لگا۔ سورج کی کرنیں جب برف کے گالوں پر رقص کرتیں تو یوں معلوم ہوتا جیسے چھوٹے چھوٹے ہزاروں بلکہ لاکھوں آئینے فضا میں جڑ دیئے گئے ہوں۔ یہ صورت حال ہموار پرواز کے لئے نہایت خطرناک تھی کیونکہ ایسی صورت میں افق نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور طیارے حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں.....

طیارے کے اندر پائلٹ کی مرتعش آواز گونج رہی تھی:

”خواتین حضرات۔ آپ سب اپنی حفاظتی بیلٹ باندھ لیں۔ ممکن ہے ہم کسی جگہ ہنگامی لینڈنگ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہم بھٹک کر نیپال کے بلند و بالا برف پوش پہاڑوں اور وادیوں میں پہنچ گئے ہیں۔ یہاں وسیع برف پوش میدان، منجمد جھیلیں اور گلیشیر ہیں جہاں ہم ہنگامی لینڈنگ کر سکتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کیونکہ طیارے کا فیول بھی ختم ہونے والا ہے۔ براہ مہربانی عملے سے تعاون کریں اور ان کی ہدایات پر سختی سے عمل کریں۔ شکریہ!“

پھر ایئر ہوسٹس اور اسٹیورڈ مسافروں کو ہنگامی لینڈنگ کے وقت مختلف دروازوں سے باہر نکلنے کے طریقے سمجھانے لگے۔ انہوں نے ایئر بیگ، ابتدائی طبی امداد کے سامان اور حفاظتی گدوں کے بارے میں بھی بتایا۔

اسی دوران پائلٹ نے طیارہ دائیں سمت موڑنے کی کوشش کی اور اسے غوطہ دیا تو طیارہ کسی بہت سخت اور ٹھوس چیز سے رگڑ کھاتا ہو گزر گیا۔ طیارے کو بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچا اور اس نے پرواز جاری رکھی مگر مسافروں کی چیخیں نکل گئیں اور طیارے کے اندر آہ و بکا میں اضافہ ہو گیا۔

طیارے کا عملہ تن دہی سے مشینوں اور آلات کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ انجنوں کی رفتار ہلکی کر دی گئی تھی اور طیارے کی بلندی بھی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ دفعتاً طیارہ ڈگمگانے لگا اور اگلے ہی لمحے ایک زوردار دھماکے کے ساتھ کسی شے سے ٹکرا گیا اور اس کے پر خچے اڑ گئے۔

☆.....☆.....☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو برف کے اندر دھنسا ہوئے پایا۔ میرے اعضا شل ہو چکے تھے اور سر گھوم رہا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ جہاز ایک دھماکے کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور کسی نادیدہ طاقت نے مجھے فضا میں اُچھال دیا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ میں زمین تک صحیح وسالم کس طرح پہنچ گیا میں دیر تک آنکھیں بند کئے سوچتا رہا۔ آخر میں یہی تو جیہہ ذہن میں آئی کہ حادثے کے بعد زمین کی طرف گرتے وقت برف کے نرم نرم گالوں نے مجھے سہارا دیا ہوگا۔



پھر بھٹے طیارے کے دیر مسافروں کا خیال آیا۔ لیکن ان میں سے کسی کوئی سس بچا ہوگا؟ خوف اور تنہائی کے احساس سے میرے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی اور بے یار و مددگار ہونے کا غم اور شدید احساس میرے ذہن پر چھا گیا:

”چمپون! چمپون!“ میں پکارتا رہا مگر وہ ماورائی ہستی جو ہر لمحہ میرے ساتھ رہتی تھی میری مدد کو نہ پہنچی۔ ”کیا پنڈت ٹھیک کہہ رہا تھا؟“ میں نے بے چارگی اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں خود سے سوال کیا۔ ”کیا واقعی اس نے میرے اور چمپون کے درمیان ایک غیر مرئی دائرہ کھینچ دیا ہے؟ میں اس سرد جہنم سے کیسے نکلوں گا.....؟“

میں نے ارد گرد نگاہ ڈالی مگر میری نظریں ناکام لوٹیں کیونکہ حدنگاہ تک برف زار پھیلا ہوا تھا۔ تنگ بستہ، سرد اور ویران۔ کیا میں اکیلا ہی زندہ بچا تھا؟

کچھ دیر بعد اوسان بحال ہوئے تو میں نے پُر امید نظروں سے ڈھلوان کے بالائی حصے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں سے دھوئیں کے ہولناک مرغولے اُٹھ رہے تھے۔ مجھے امید بندھی کہ ممکن ہے کہ وہاں میری طرح کوئی مسافر زندہ پڑا ہو۔ اس احساس نے میرے جسم میں زندگی کی نئی حرارت پھونک دی۔ میں اُٹھا مگر پھر گر پڑا۔

”شاید میں وہاں نہ پہنچ پاؤں.....“ میں زیر لب بڑبڑایا اور ایک بار پھر اُٹھ کر گرتا پڑتا اس سمت روانہ ہو گیا۔ جائے حادثہ کی طرف بڑھنے والا میرا ہر قدم پہلے سے زیادہ بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ جوں جوں حادثے کا منظر واضح ہوتا گیا میں اپنے زندہ بچ جانے اور اس سرد جہنم میں بے یار و مددگار ہونے کے تصور سے لرزتا گیا۔ کبھی مجھے احساس ہوتا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، لیکن میرا متحرک اور درد سے ٹوٹتا ہوا جسم اس احساس کی نفی کر رہا تھا۔

میں طیارے کے آتش زدہ بلبے کے قریب پہنچا تو ہر طرف کٹے اور جلے ہوئے انسانی اعضا، کپڑے، جوتے اور بیگ بکھرے ہوئے نظر آئے۔ فضا میں جلے ہوئے انسانی جسموں کی چراند پھیلی ہوئی تھی۔ میرا دماغ پھٹنے لگا۔ میں تباہی و بربادی کے اس منظر کی تاب نہ لا کر گر پڑا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کے آبشار بہنے لگے۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ خوب رونے کے بعد دل کی بھڑاس نکلی تو سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کانوں سے ایک آواز نکلا۔

”کوئی ہے..... اُف! ہائے رام!“

یہ نسوانی آواز تھی۔ کوئی عورت قریب ہی درد کی شدت سے کراہ رہی تھی۔ وہ انیتا تھی! میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو میرا دل مسرت سے اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں ایک دم اُٹھ کر اس کی طرف لپکا۔ میں بلند آواز میں اسے پکار رہا تھا:

”انیتا! انیتا! تم ٹھیک تو ہو؟“

جب میں اس کے قریب پہنچا تو میرا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا اور میرے منہ سے الفاظ ٹھیک طرح ادا نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے اس کے جسم اور کپڑوں کو ہاتھوں سے جھاڑا۔ اس کی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹ اور جل چکی تھی مگر اسے کوئی گزند نہ پہنچا تھا۔ وہ خوش قسمت تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا جائزہ لینے کے بعد دیگر زندہ بچ جانے والے مسافروں کی تلاش شروع کر دی۔ ہم بیس قدم دور گئے تو ایک نشیب سے معاون پائلٹ راہول برف جھاڑ کر اُٹھتا دکھائی دیا۔ انیتا فوراً اس کی طرف لپکی جیسے اس کی تمام امیدیں معاون پائلٹ ہی سے وابستہ ہوں۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ راہول کا گھٹنا زخمی ہے۔ شدت تکلیف سے اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ سردی سے بدن تھر تھرا کانپ رہا تھا۔ تاہم اس نے ہم دونوں کو، خصوصاً انیتا کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور پھر برف پر گر پڑا۔ ہم دونوں نے اسے اٹھنے میں مدد دی اور چند ثانیے کے لئے درد و کرب اور حادثے کا تکلیف دہ احساس ہمارے ذہنوں سے غائب ہو گیا۔ انیتا اپنے ساتھی سے کچھ پوچھ رہی تھی کہ میری نگاہ کچھ دور برف پر اپنا سر تھا مے اکڑوں بیٹھے ایک آدمی پر پڑی۔ میں فوراً اس کی طرف لپکا۔ وہ ایک باریش آدمی تھا۔ عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔

”آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟“ میں نے اس کے گلے میں بازو ڈال کر کہا۔

اس آدمی نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔ اس کا سر خون میں لت پت تھا۔ میں یہ دیکھ کر ٹپ اٹھا:

”آہ! آپ تو زخمی ہیں۔ آپ کے سر میں چوٹ آئی ہے۔“

اتنے میں انیتا اور راہول بھی وہاں آ گئے۔ ہم سب نے مل کر اس آدمی کو سہارا دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام محمد حنیف ہے اور وہ لکھنؤ کا رہنے والا ہے۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے کلکتہ گیا ہوا تھا جو وہاں بیاہی ہوئی تھی۔ واپسی پر اس بد قسمت طیارے میں سوار ہو گیا اور لکھنؤ پہنچنے کی بجائے اس سرد جہنم کدے میں پہنچ گیا۔

برف تیزی سے گر رہی تھی مگر ہم سب اب اس طوفان اور ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکے تھے۔ ایک دوسرے کے قرب کا احساس ہمارا حوصلہ بلند کر رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے چار ہم سفر کا یوں مل جانا بڑا حوصلہ افزا تھا۔ ہم سے چند قدم دور انڈین ایئر لائن کا مسافر بردار طیارہ مسلسل جل رہا تھا۔ اس کے ڈھانچے سے بلند ہونے والے شعلے شدید برف باری میں یوں نظر آ رہے تھے جیسے کوسوں دور درجنوں چراغ ٹمٹما رہے ہوں، لیکن ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ان شعلوں کے جلو میں تقدیر ایک زندہ انسان کے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ اچانک اس سمت سے ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی اور ہم سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔



لوی مسل مدد کے لئے پکار رہا تھا۔

”یہ..... یہ آواز تو راجیش کی ہے!“ راہول چلایا اور جہاز کے جلتے ہوئے ڈھانچے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہم بھی اس کے پیچھے بھاگے۔ راجیش طیارے کا پائلٹ تھا۔ بھاگتے ہوئے برف ہماری راہ میں حائل ہو رہی تھی مگر طیارے کے پائلٹ کو نظر انداز کرنا کسی کے لئے ممکن نہ تھا۔ ہم گرتے پڑتے جہاز کے اگلے حصے کی طرف بڑھے۔ آگ کے شعلوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور راجیش اپنی نشست میں اس طرح پھنسا ہوا تھا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے اتنی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہو۔ ہر لمحہ بلند ہوتے شعلے سیفٹی بیلٹ میں جکڑے ہوئے پائلٹ سے کھیل رہے تھے۔ آگ کی شدت اور تمازت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں آگے بڑھا اور ہاتھ بڑھا کر اس کی سیفٹی بیلٹ کھولی۔ بیلٹ کھلتے ہی وہ آزاد ہو گیا۔ راہول نے میری مدد کی اور ہم اسے جلتے ہوئے کیبن سے باہر لے آئے۔ اس کی یونیفارم آگ میں جل چکی تھی۔ بازو، ٹانگیں اور چہرہ بری طرح جھلس چکا تھا۔ ہاتھوں سے مسل مسل کر ہم نے اس کے کپڑوں کو لگی ہوئی آگ بجھائی مگر اس کا جلا ہوا جسم بری طرح سوچ رہا تھا جس کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ بے ہوش ہو گیا۔

میں نے اسے ایک ادھ جلتے کپڑے میں لپیٹ کر اپنے کندھے پر ڈالا اور کسی پناہ گاہ کی تلاش میں چل پڑا۔ دوسرے ساتھی میرے عقب میں چل رہے تھے۔ کچھ دور ایک بہت بڑی چٹان تھی جو رکوع کی حالت میں جھکی ہوئی تھی اور اس کے نیچے زمین صاف تھی میں نے اسے وہاں لٹا دیا اور حنیف صاحب اور انیتا کو اس کی دیکھ بھال پر مامور کر کے راہول کے ساتھ واپس پلٹا۔

راستے میں ہم دونوں آپس میں متعارف ہوئے۔ میں نے خود کو کشمیری ظاہر کیا اور اسے بتایا کہ نیویارک میں مقیم ہوں۔ میں نے رنگون سے دہلی کا سفر اختیار کرتے ہوئے اپنا نام اقبال بٹ ظاہر کیا تھا۔ ”اقبال بھیا..... میرا خیال ہے ہم پانچوں کے سوا طیارے میں سوار کوئی انسان زندہ نہیں بچا..... ہماری حالت بھی مردوں سے بدتر ہے۔ مجھے اپنا انجام صاف نظر آ رہا ہے۔ ہم اس دور دراز علاقے میں شدید سردی اور بھوک پیاس سے مرجائیں گے اور کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔“

”مایوسی کی باتیں نہ کرو راہول۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”خدا کوئی نہ راستہ نکال دے گا۔“

”میں حقیقت پسند آدمی ہوں اقبال صاحب۔ ذرا سوچئے ہمارے پاس نہ کھانے کے لئے کچھ ہے اور نہ سردی سے محفوظ رہنے کے لئے مناسب کپڑے اور دوسرا سامان۔ شام ہوتے ہی یہاں کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی نیچے گر جائے گا۔ صبح کا سورج جب طلوع ہوگا تو ہماری اکڑی ہوئی لاشوں کو پہاڑی کوئے اور چیلپس نوچ رہی ہوں گی.....“

”میں پھر کہوں گا کہ مایوسی کی باتیں چھوڑ دو۔ ہوائی جہاز کا ڈھانچہ کافی حد تک سرد پڑ چکا ہے۔ ہمیں

چاہئے کہ ہم اس کا تفصیلی جائزہ لیں۔ ممکن ہے ہمیں بچا کچھا کھانا۔ کپڑے اور ضرورت کی چند ایسی چیزیں مل جائیں جن سے ہم اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔“

میری تحریک پر راہول میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا اور ہم نے جہاز کے ڈھانچے کا معائنہ شروع کر دیا۔ طیارہ کئی حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور اس کے مختلف ٹکڑے ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر بکھرے پڑے تھے۔ بازوؤں کا درمیانی حصہ جس کی لمبائی تیس چالیس فٹ تھی۔ الگ ہو چکا تھا۔ ڈھانچے کا بڑا حصہ اور دم مشرق اور مغرب کی جانب برف میں دھنسے ہوئے تھے۔ تباہ شدہ ڈھانچے میں ہمیں چند مضبوط تھیلے مل گئے جن کے اندر کوہ پیماؤں کے بستر بندھے ہوئے تھے۔ ان گرم بستروں کو پا کر ہماری ڈھارس بندھی اور چند دن مزید زندہ رہنے کا سہارا نظر آنے لگا۔

طیارے کی شکستہ کمر کے اندر ہم نے اپنی پناہ گاہ بنائی۔ اس سے پہلے ہم نے اسے ادھ جلی لاشوں سے پاک کیا اور انہیں ایک کھائی میں پھینک دیا۔ برف باری کے سبب جلد ہی وہ کھائی ان کی اجتماعی قبر میں تبدیل ہو گئی۔ ہماری پناہ گاہ برف باری اور تند و تیز ہواؤں سے محفوظ تھی۔ ہم نے سب سے پہلے طیارے کے پائلٹ راجیش کے لئے بستر تیار کیا اور اسے آرام سے لٹا دیا۔ پھر ہم جلتے ہوئے گدوں کے اندر ایک دوسرے سے لپٹ کر سو گئے۔ انیتا کو الگ سلایا گیا تھا۔

اٹھارہ گھنٹے کی طویل نیند کے بعد ہم نے آنکھیں کھولیں اور اپنے اعصاب کو چاق و چوبند اور کسی قدر آسودہ محسوس کیا۔ میں انیتا اور کسی حد تک راہول خوش قسمتی سے بالکل ٹھیک تھے۔ اس لئے ہم تینوں اٹھے اور طیارے کے ڈھانچے کی تماشائی لینے چل پڑے کیونکہ ہمیں امید تھی کہ کچھ خوراک اور دوسری چیزیں دستیاب ہو جائیں گی۔ اس روز بھی مسلسل برف باری ہو رہی تھی لیکن ہم دیوانوں کی طرح جہاز کے ڈھانچے کو کریدتے اور برف ادھر ادھر ہٹاتے رہے۔ اس کوشش کا قدرت کی طرف سے یہ انعام ملا کہ دو خیمے۔ ہنگامی ضروریات کی چیزوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا، چند ڈبوں میں بند سوکھا گوشت، جوس کے ڈبے، اچار، چٹنی کے دو ڈبے اور سینڈویچز کے تین درجن پیکٹ دستیاب ہو گئے۔ چند پیٹیاں بھی مل گئیں جنہیں زخموں پر باندھا جاسکتا تھا۔

ایک راہول ایک نئی دریافت کے زیر اثر بھرائی ہوئی آواز میں چلایا:

”دوستو..... یہ دیکھو۔ یہ کیا ہے!“

میں اور انیتا اس کی طرف دوڑے اور دیکھا کہ وہ ایک ٹینکی کے پاس کھڑا ہے جس میں تقریباً پانچ سو لیٹر گیسولین محفوظ تھی۔ اس گیس سے ہم اپنی ضرورتیں مہینہ بھر تک آسانی سے پوری کر سکتے تھے۔

پائلٹ راجیش کی حالت نہایت غیر نسلی بخش تھی مگر اپنی حد درجہ قوت برداشت کے باعث وہ یہ اذیت خاموشی سے جھیل رہا تھا۔ تاہم انیتا، راہول اور خود میں اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ آگ کے



شعلوں نے اس کا حلیہ ہی بگاڑ دیا تھا۔ اس کا چہرہ بری طرح جھلسا ہوا تھا اور کھال جگہ جگہ سے اُدھڑ چکی تھی۔ وہ اپنی آنکھیں کھولنے پر بھی قادر نہ تھا۔ ہمارا خیال تھا وہ اندھا ہو چکا ہے۔ چہرے کے علاوہ اس کے دونوں ہاتھ بھی بیکار ہو گئے تھے۔ کمر اور رانوں پر بھی آبلے اور رستے ہوئے زخم بن گئے تھے۔ اس مایوس کن کیفیت کے باوجود جب وہ ہوش میں آتا تو اپنے ساتھیوں کے حوصلے بڑھانے کی کوشش کرتا۔

”تم چننا نہ کرو۔ امدادی جماعتیں ہمیں جلد ہی تلاش کر لیں گی اور ہم ایک بار پھر خوشیوں بھرے سنسار میں واپس لوٹ جائیں گے۔“

ایسے ہی چند جملے ادا کرنے کے بعد اس پر غشی کے دورے پڑنے لگتے اور ہڈیاں کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ بار بار بڑبڑاتا:

”میں ڈاکٹر سے ملنے جا رہا ہوں..... وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“

انیتا، راہول اور خود میں اس کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ جاتے مگر ہم کچھ نہ کر سکتے تھے۔ ہمارے پاس صرف پٹیاں تھیں، کوئی دوا نہ تھی۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہر صبح ہمارے لئے پیام حیات اور سندیسہء امید لاتی۔ ہم سارا دن مدد کی امید میں آسمان کی طرف دیکھتے رہتے جہاں بادلوں نے مستقل ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جب سورج مغربی پہاڑوں کے عقب میں اتر جاتا تو ہمارے چہرے بھی اتر جاتے تھے۔

اس دوران میں نے چپوں کو کوئی سومرتیہ پکارا ہوگا مگر وہ میری مدد کو نہ پہنچی۔ شکشی مان پنڈت کا کھینچا ہوا حصار بہت موثر تھا۔ وہ واقعی کوئی بہت طاقتور پنڈت تھا۔ میں نے اس کی ماورائی اور روحانی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا اور اسے مشتعل کر کے نہ صرف اپنے لئے مصیبت مول لی تھی بلکہ پچاس کے لگ بھگ بے گناہ مسافروں کی موت کا سبب بھی بن گیا تھا۔ اس کا مجھے بے حد ملال تھا۔ میرے دل پر بے حد بوجھ تھا۔ اس بوجھ اور احساسِ جرم نے مجھے خدا تعالیٰ کی ذات پاک کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایک دن میں ایک تنہا گوشے میں بیٹھ کر بہت رویا اور پھر وضو کر کے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ ندامت کے آنسوؤں نے گناہوں کی آلودگی دھو ڈالی۔ میرا سیاہ دل نور سے منور ہو گیا اور میں نے خدا تعالیٰ سے وعدہ کیا کہ اگر اس نے مجھے اس جہنم زار سے نجات دی تو میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح پاک صاف زندگی بسر کروں گا۔ اب میری دلی تمنا یہی تھی کہ پنڈت کا جاپ مکمل ہو جائے اور وہ چپوں کو تسخیر کرے تاکہ میری جان اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے۔

ایک روز ہماری حالت بہت ناگفتہ تھی۔ بھوک سے برا حال تھا۔ ہم اپنا راشن بہت احتیاط سے استعمال کرتے تھے اس لئے کم خوراک کی سبب فاقہ زدہ نظر آتے تھے۔ ہم نے کیا دیکھا کہ آسمان پر چیلیں منڈلا رہی ہیں۔ ہم سخت سر اسیمہ اور خوفزدہ ہو گئے۔ وہ منحوس چیلیں کبھی کبھی کافی نیچے آ جاتیں اور

افیت ناک شور مچا میں۔ وہ ہمیں اپنی حوراک جھڑہی میں۔ اپنا ایسا ہولناک انجام سونچ کر ہمارے دل کاٹنے لگے۔ انیتا نیم پاگل ہو گئی اور اپنے بال نوچنے لگی۔ میں نے اور راہول نے پتھر اٹھا اٹھا کر چیلوں کو مارنے شروع کئے۔ ایک چیل پتھر لگنے سے نیچے آ گری تو ہم نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ باقی چیلیں اس کا انجام دیکھ کر وہاں سے رفو چکر ہو گئیں۔ ہم نے اس چیل کو برف میں دبایا تاکہ بوقت ضرورت اس کے گوشت سے اپنے پیٹ کا جہنم بھر سکیں!

ہمیں بدترین موسمی حالات کا سامنا تھا۔ برف باری مسلسل ہو رہی تھی اور سردی اتنی شدید تھی کہ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا کہ ہاتھ پاؤں کا گوشت عنقریب گل کر الگ ہو جائے گا۔ سورج گھنٹہ بھر کے لئے اپنا مدہم چہرہ دکھا کر غائب ہو جاتا۔ راہول نے جہاز کے بلے سے ایک سفری نقشہ بھی برآمد کر لیا تھا۔ سورج کی سمت طلوع وغروب سے شمال کے رخ کا اندازہ تو ہمیں ہو ہی گیا تھا۔ وہ نقشے کو شمال رخ کر کے اندازہ لگاتا تاکہ اگر ہم سو سے ڈیڑھ سو میل جنوب کی سمت سفر کریں تو ہندوستانی سرحد تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم تھا کہ اس برفانی علاقے میں ہم دس پندرہ میل کا سفر بھی نہ کر سکیں گے۔ مسلسل بھوک اور پریشانی کے سبب ہماری جسمانی قوت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ ہمارا سر ہر وقت چکر اتار رہا تھا۔

میں اور راہول روزانہ ایک اونچے برفانی تودے پر چڑھ جاتے اور چاروں طرف دیکھتے رہتے کہ شاید کوئی ہیلی کاپٹر ہماری تلاش میں اس طرف آنکے مگر مایوسی کے سوا کچھ نہ ملتا۔ ہم نے جہاز کے بلے سے مختلف رنگدار چیزیں نکال کر انہیں برف کے میدان میں پھیلا کر انگریزی کا حرف H بنادیا تھا جسے برف کے گالے حرف غلط کی طرح مٹا ڈالتے اور ہم دوبارہ H بنانے کی مشقت میں مصروف ہو جاتے۔

ایک روز دوپہر کے وقت ہم کھانا کھا رہے تھے جسے انیتا نے تیار کیا تھا۔ اور جو فی کس ایک پیالہ شوربہ اور آدھا سلاکس پر مشتمل تھا۔ اسی وقت ہمیں ایک ایسی گڑگڑاہٹ سنائی دی جس کو سننے کے لئے ہمارے کان تر سے ہوئے تھے۔ راہول پوری قوت سے چلایا:

”ہیلی کاپٹر!“

ہم سب باہر کی سمت دوڑے۔ افراتفری میں ہمارے شوربے کے پیالے بھی گر گئے۔ ہم خوشی سے چلا رہے تھے:

”مدد آگئی..... مدد آگئی..... بھگوان تیرا شکر ہے۔ مولا تیرا کرم ہے!“

باہر نکل کر ہم نے دیکھا کہ مشرق کی سمت کوئی دو میل دو تین چار ہزار فٹ کی بلندی پر ایک ہیلی کاپٹر دائرے میں چکر لگا رہا تھا۔ راہول جلدی سے نارنجی رنگ کا ایک ریشمی کیڑا اٹھالایا اور اسے زور زور سے فضا



میں لہرائے لگا۔ انیتا، اور حنیف صاحب زور زور سے دعا میں مانگنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم سب حلق پھاڑ کر چیخ رہے تھے مگر یہ تمام حرکتیں بے کار ثابت ہوئیں۔ پائلٹ ہمیں نہ دیکھ سکا اور ہیلی کاپٹر مشرق کی سمت دُور جا کر گرم ہو گیا۔ ہمارے دلوں میں اُٹھنے والا جوش و مسرت کا طوفان یک لخت تھم گیا اور ہم اپنی قسمت کو کوستے ہوئے وہیں برف پر بیٹھ گئے۔

”میرے دوستو مایوسی گناہ ہے۔“ میں نے اپنے جذبہ ایمانی کو بروئے کار لاتے ہوئے انہیں دلاسا دیا۔ ”یہ ہیلی کاپٹر ہماری تلاش میں آیا تھا اور دوبارہ ضرور آئے گا۔ اس بار ہم اسے نظر نہیں آئے۔ انشاء اللہ اگلی بار وہ ہمیں ضرور دیکھ لے گا۔“

”مجھے تو لگتا ہے وہ ہمارے عین اوپر سے گزر کر اس طرف گیا تھا۔“ راہول نے رائے دی۔ ”بھگوان جانے پائلٹ نے ہمارا بنایا ہوا H کیوں نہیں دیکھا۔ سالا فلنگ سمجھ کر یہ ڈیوٹی کر رہا ہوگا۔“

”میرا خیال ہے اگر پائلٹ کوشش کے باوجود ہمیں نہیں دیکھ پایا تو اس میں غلطی ہماری ہے۔“ حنیف صاحب بولے۔ ”دراصل ہم نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کا کوئی خاطر خواہ انتظام کیا ہی نہیں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ایسی چیز جلانی ہوگی جس کا گاڑھا اور سیاہ دھواں کافی بلندی تک پہنچ سکے۔“

حنیف صاحب کا مشورہ ہمیں معقول لگا اور ہم فوراً ہی اپنے کام میں جت گئے۔ ہم نے جہاز کے بلے میں سے ہر وہ شے نکال کر برف سے ڈھکے میدان میں ڈھیر کرنا شروع کر دی جسے نذر آتش کیا جاسکتا تھا۔ اس میں کپڑوں کی دھجیاں، پلاسٹک اور کاغذ کے ٹکڑے، گتے، روئی کی گدیاں، ٹائر اور کیبل کے ٹکڑے وغیرہ شامل تھے۔ اس کے بعد ہم نے اس ڈھیر پر اچھی طرح گیسولین کا چھڑکاؤ کیا اور بے چینی سے ہیلی کاپٹر کی دوبارہ آمد کا انتظار کرنے لگے۔ دو گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد ہم نے شمالی پہاڑوں کے اوپر سے ہیلی کاپٹر کی گڑ گڑاہٹ سنی اور ہم بے قرار ہو کر اس طرف دیکھنے لگے۔

ہیلی کاپٹر بہت دور تھا اور ایک سیاہ دھبے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ ہماری آنکھوں میں امید کے دیئے ٹٹمٹما رہے تھے اور ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ بے قراری سے اس ہیلی کاپٹر کو دیکھ رہے تھے۔ لبوں پر دعائیں تھیں، التجائیں تھیں اور دل میں انجانا خوف اور یہ خدشات کہ اگر اس بار بھی پائلٹ ہمیں نہ دیکھ سکا تو تلاش کرنے پھر کوئی نہ آئے گا اور ہم یہیں بھوکے پیاسے ایڑیاں رگڑ کر مرجائیں گے۔

بڑا پہاڑ کر اس کرنے کے بعد ہیلی کاپٹر کچھ نیچے آیا اور وادی میں پرواز شروع کر دی۔ میں نے آگے بڑھ کر بلے کو آگ لگا دی۔ گیسولین سے تر ہونے کی بنا پر بلے نے فوراً آگ پکڑ لی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں سے سیاہ دھوئیں کا ایک بڑا مرغولہ فضا میں بلند ہونے لگا۔ میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا کہ اگر

اس دھوئیں سے کام نہ بنا تو پائلٹ کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے لئے گیسولین کی پوری ٹینکی آگ میں جھونک دوں گا۔ اس سے جو دھماکہ ہوگا وہ پائلٹ کو خبردار کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

دھواں اب ایک بڑی چھتری کے مانند تین سو فٹ کی بلندی پر پہنچ چکا تھا اور ہم سب سانس روکے ہیلی کاپٹر کو دیکھ رہے تھے۔ یکا یک اس نے نے بلندی مزید کم کی اور ایک چکر کاٹ کر ہماری طرف بڑھنے لگا، ہم سب کے منہ سے خوشی کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور فرط جوش سے ناچنے لگے۔ پائلٹ نے آخر کار ہمیں دیکھ لیا تھا۔

ہیلی کاپٹر اب عین ہمارے سروں پر آ گیا تھا۔ اتنا نیچے کہ ہم اس میں بیٹھے ہوئے پائلٹ کو با آسانی دیکھ سکتے تھے۔ پھر اس کی کھڑکی سے پیکٹوں کی شکل میں سامان نیچے پھینکا گیا۔ گرم کمبل، کپڑے، پھل، تازہ گوشت، سبزی ترکاری کے ڈبے، جوس کے ڈبے، چینی، پتی اور بسکٹ۔

وہ چند منٹ تک چکر کاٹتا رہا پھر مغرب کی جانب چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آتا دکھائی دیا۔ پائلٹ نے اس مرتبہ رول کی ہوئی ایک ڈرائنگ شیٹ نیچے پھینکی۔ راہول نے اسے اٹھایا۔ اس پر لکھا تھا: مغرب کی سمت پانچ میل تک کسی نہ کسی طرح پہنچ جاؤ۔ یہاں برف نرم ہے اس لیے میں اس جگہ ہیلی کاپٹر نہیں اتار سکتا۔ ادھر ایک منجمد جھیل ہے۔ حوصلے سے کام لو اور مایوسی کو قریب نہ آنے دو۔ میں تمہیں بچا لوں گا۔

(اسکو اڈرن لیڈر رورما)

کہنے کو تو یہ سفر پانچ میل کا تھا لیکن بدترین موسم، بخ بستہ ہواؤں، مسلسل برف باری، بھوک نکاہت اور ایک شدید زخمی ساتھی کے سنگ یہ سفر بھی کسی عذاب سے کم نہ تھا۔

سب سے پہلے ہم نے تازہ خوراک سے اپنا پیٹ بھرا۔ گرم گرم چائے جی بھر کر پی بسکٹ اور پھل کھائے۔ انیتا اور راہول نے سبزی کھائی جبکہ حنیف صاحب اور میں گوشت پر پل پڑے۔ جب جسم میں کچھ جان آئی تو ہم نے ایک تختے پر بستر بچھایا اور راجیش کو اس پر لٹا دیا۔ تختے میں سوراخ کر کے رسی باندھی تاکہ اس ”کشتی“ کو برف پر گھسیٹا جاسکے۔ اسی طرح ایک اور کشتی پر ضروری سامان، دو خیمے، کمبل، سلیپنگ بیگ لادے۔ اس کے بعد ہم خدا کا نام لے کر مغرب کی طرف چل پڑے۔ برف پر پانچ میل کا یہ سفر خاصا دشوار تھا۔ سب سے بڑی مشقت اس ”اسٹریچر“ کو گھسیٹنا تھا جس پر راجیش کو لٹایا گیا تھا۔ جھٹکے لگنے سے اس کے زخم دُکھنے لگتے اور وہ آہ و بکا کرتا تو کلیجہ منہ کو آتا۔ راجیش کا وزن دو سو پونڈ تھا جسے کھینچنا بذات خود ایک ہمت والا کام تھا۔ اس کے مقابلے میں دوسری کشتی پر کم وزن تھا اور اسے جھٹکے لگنے کی بھی ہمیں، کوئی پروا نہ تھی، ابتداء میں ہمیں یہ سفر اتنا مشکل نہیں لگا تھا۔ ہم کسی رُکاوٹ کے بغیر ایک میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے لیکن دوسرے میل کا تھوڑا سا فاصلہ طے کرتے ہی ایک عجیب مصیبت سے پالا پڑا۔ یہاں



پڑی ہوئی برف اتنی نرم اور کھری تھی کہ جو بھی اس پر وزن پڑتا ہم اس کے اندر دھسنے لگتے۔ دو گھنٹے تک ہم آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے اور صرف دو فرلانگ کا فاصلہ ہی طے پر پائے۔ یہ صورت حال نہایت صبر آزا اور مایوس کن تھی تاہم ہماری ہمتیں اور حوصلے بلند تھے۔ ہمیں امید اور یقین تھا کہ پائلٹ آگے چل کر کسی نہ کسی مقام پر ہیلی کاپٹر کو اتار لینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ہم نے ایک بار پھر اسے اپنے سروں پر چکر لگاتے دیکھا تو ہمارے رگ و پے میں نیا جوش اور ولولہ جنم لینے لگا۔ پائلٹ نے ایک بار رول کی ہوئی ڈرائنگ شیٹ پھینکی۔ اس پر یہ پیغام لکھا ہوا تھا:

”دوستو! آگے بڑھتے جاؤ، لیکن احتیاط سے۔ ایک دوسرے کی کمر سے رسیاں باندھ لو کیونکہ اس علاقے میں گہرے کھڈ اور کھائیاں ہیں جو نرم برف سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی غلط قدم تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کھائیوں کے اندر پہنچا دے!“

اس پیغام کو پڑھنے کے بعد ہم نے رسیوں کی مدد سے ایک دوسرے کو ”چین“ کیا۔ اب ہماری رفتار مزید کم ہو گئی۔ میں اور راہول اس اسٹریچر کو گھسیٹ رہے تھے جس پر راہیش لیٹا ہوا تھا۔ جبکہ انیتا اور حنیف صاحب اس کشتی کو کھینچ رہے تھے جس پر دو خیمے، کمبل سلپنگ بیگ اور کھانے کا سامان لدا ہوا تھا۔ ہم چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ سورج مغربی پہاڑ کی طرف جھک گیا تھا اور فضا میں کبر بڑھ رہا تھا۔ راہول نے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا:

”اقبال بھیا..... لگتا ہے اندھیرے اور کھر کے سبب امدادی ہیلی کاپٹر برف کے میدان میں اتر نہ سکے گا اور ہمیں رات اس برف زار میں خیمہ زن ہو کر گزارنی پڑے گی.....“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو.....“ میں نے تائید میں سر ہلایا۔

ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ مشرق کی سمت سے ہوا کا ایک ناقابل برداشت طوفان اُٹا اور برف کے ننھے ننھے گالے فضا میں اڑنے لگے۔ آنا فانا برف نے ہم بد نصیبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہمارے لئے اس طوفان کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ ہم وہیں زمین پر لیٹ گئے۔ طوفان کی شدت صرف آدھ گھنٹے تک رہی لیکن اس قلیل وقت میں ہم سینے تک برف میں دھنس چکے تھے۔ ہم نے صرف یہ عقل مندی کی کہ راہیش کے اسٹریچر کو ایک پتھر کے سہارے تقریباً سیدھا کھڑا کر دیا ورنہ وہ تو طوفان کی تاب نہ لا کر مر جاتا۔

طوفان گزرا تو ہماری جان میں جان آئی۔ برف روئی کی مانند نرم تھی اس لئے ہم جلد ہی اس سے نکل آئے اور آگے چل پڑے تاہم سردی سے ہمارے جسم ٹھٹھہر رہے تھے اور ہاتھ پاؤں حرکت کرنے سے انکاری تھے۔ اتنے میں سورج غروب ہو گیا اور پائلٹ ہمارے لئے یہ پیغام گرا کر چلا گیا:

”دوستو..... نامساعد موسمی حالات اور کم روشنی کے سبب میرے لئے ہیلی کاپٹر اتارنا ممکن نہیں۔“

ہمت کر کے ایک رات انتظار کر لو۔ کل صبح نو دس بجے یہیں کوئی ہیلی کاپٹر تم سب کو اس سرد جہنم سے نکال لے جائے گا۔ گڈ لک!“

☆.....☆.....☆

سردی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ ہر سواندھیرا پھیل گیا تھا جس میں برف کی سفیدی میلے کفن کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ ہمارے تھکے ماندے جسم پسینے میں شرابور تھے جس کے سبب ہم بری طرح کپکپا رہے تھے۔

جوں توں کر کے ہم نے کشتی پر باندھے ہوئے دو خیمے کھولے اور انہیں ایک چٹان کے پہلو میں سطح زمین پر میخیں ٹھونک کر ایستادہ کیا۔ اس کے بعد سلپنگ بیگ کھولے اور کمبل بچھا کر بستر تیار کئے۔ بڑے خیمے میں راہیش راہول اور حنیف صاحب کے بستر تھے جبکہ چھوٹے خیمے میں انیتا اور میں شب بھری کے لئے جا گھسے۔ ہمارے پاس ایک بڑا سلپنگ بیگ اور ایک کمبل تھا۔ میں نے سلپنگ بیگ انیتا کو دے دیا اور خود کمبل لپیٹ کر پڑ گیا۔ اس نے سلپنگ بیگ کا زپ بند کر لیا تھا جس سے وہ گرم اور آرام دہ بستر کے مزے لوٹ رہی تھی کیونکہ سلپنگ بیگ اس طرح ایئر ٹائٹ ہو جاتا ہے۔ میں کمبل میں کپکپا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہم نے کھانا بھی کھایا تھا مگر اس نے جسم کو وقتی گرمی بہم پہنچائی۔ اب وہ حرارت بھی زائل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے کانپتے دیکھ کر انیتا نے کہا:

”اقبال! میرے سلپنگ بیگ میں دو آدمیوں کے سونے کی گنجائش ہے۔ تم بھی اندر آ جاؤ۔ کمبل اس کے اوپر لے لیں گے۔“

نہیں..... میں باہر ہی ٹھیک ہوں۔“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”شرم آ رہی ہے؟“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہی سمجھ لو.....“

”کمال ہے..... ہم جس مصیبت میں مبتلا ہیں اس میں عورت مرد کا امتیاز کہاں باقی رہتا ہے۔ یہاں مقصد ایک دوسرے کو شدید اور جان لیوا سردی سے بچانا ہے۔ کیوں اپنی جان کے دشمن بن رہے ہو اندر آ جاؤ۔“

میں قدرے ہچکچاتا اس کی بات ماننے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے زپ کھولی تو میں سلپنگ بیگ کے اندر گھس گیا اور اپنا کمبل اس کے اوپر ڈال لیا۔ پھر ہم نے زپ بند کر لی۔ سلپنگ بیگ خاصا آرام دہ نرم اور گرم تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”کیسا شکریہ اقبال..... تم اس حال میں بھی تکلفات میں پڑے ہوئے ہو۔“

”جوں جوں زندگی کی طرف لوٹنے کی امید بڑھ رہی ہے توں توں زندگی کے عام طور طریقے



لاشعوری طور پر اظہار کی راہیں پانے لگے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اقبال..... مصیبت کے ان ایام میں تم نے جو ہمت، جواں مردی اور استقامت دکھائی ہے اس نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ ایک آئیڈیل مرد کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔“

”یہ تمہارا حسن نظر ہے ورنہ میں کس قابل ہوں۔“

”نہیں..... یہ صرف حسن نظر کا معاملہ نہیں۔ تم واقعی ایک باہمت، نڈر اور بے خوف انسان ہو۔ بھگوان نے تمہیں بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر اس نے مہر سکوت توڑی۔

”ایک بات پوچھوں اقبال؟“

”ہاں ہاں۔“

”پہلے وعدہ کرو مجھ سے سچ بولو گے۔“

”جھوٹ بولنے کی کوئی وجہ نہیں۔ تم بلا تکلف پوچھو۔“

”کیا تم واقعی وہ ہو جو نظر آتے ہو یا جو بتاتے ہو؟“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میرا مطلب ہے کیا واقعی تمہارا نام اقبال بٹ ہے اور تم کشمیری ہو؟“

میں لمحہ بھر کے لئے سٹپٹا گیا ”تمہیں کیا شک ہے؟“

”میں نے تمہیں خواب میں بڑبڑاتے سنا تھا کہ میں نت نئے بہر و پ بھرتے بھرتے تنگ آ گیا ہوں..... میں گمراہی سے عاجز آ گیا ہوں.....“

میں نے قدرے توقف کیا۔ ایک کمزور سی لڑکی کے سامنے جھوٹ بولنا مجھے اپنی مردانگی کے خلاف

لگا۔ میں نے کہا:

”تمہارا اندازہ درست ہے۔ یہ فرضی نام ہے۔ میں کشمیری نہیں پاکستانی ہوں۔ میرا اصل نام محبوب احمد خان ہے اور میں کراچی کا رہنے والا ہوں۔“

”تم نے سچ بولا مجھے اس کی خوشی ہے۔“ وہ متمنائی آواز میں بولی۔ اس سے میری نظر میں تمہاری

وقع اور عزت پہلے سے بھی بڑھ گئی ہے۔ لیکن خاطر جمع رکھو۔ تمہارا یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔

کیونکہ تم نے مجھ پر اعتماد کیا۔ میں اس اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچاؤں گی۔ اگر ممکن ہو تو مجھے اپنی کہانی سناؤ۔“

”لمبی کہانی ہے!“ میں نے آہ بھر کر کہا۔ ”اسے سننے کے لئے فرصت اور بہت وقت درکار ہوگا۔ پھر

کبھی سہی۔“

”ویسے تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

”میں نے اپنے بارے میں بتایا تو تھا کہ کناٹ پیلس کے قریب رہتی ہوں۔“

”ہاں لیکن کچھ اور بھی بتاؤ۔“

”میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرے پتاجی آرمی آفیسر تھے اور ماتاجی ایک اسکول میں

پڑھاتی تھیں۔ میں چھٹی میں تھی کہ ان دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ پتاجی نے مجھے میری ماتاجی کے پاس ہی

رہنے دیا۔ انہوں نے ہی مجھے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ پتاجی کبھی کبھار خرچہ بھیج دیتے تھے۔ اس طرح میں

نے گریجویشن کر لی اور انڈین ایئر لائن کو بطور ایئر ہوسٹس جوائن کر لیا۔ پانچ سال سے میں یہ جاب کر رہی

ہوں۔ پچھلے برس ماتاجی کا دھیانت ہو گیا تھا۔ اب اکیلی ہوں۔“

”اور تمہارے پتاجی؟“

”وہ ریٹائرمنٹ کے بعد امریکہ سٹیٹل ہو گئے تھے اور کسی امریکی خاتون سے شادی کر لی تھی۔ اس

کے بعد ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ یہ دس سال پہلے کی بات ہے۔“

”ہونہہ..... تو تم بالکل تنہا ہو۔“

”ہاں.....“ اس نے ہولے سے سر ہلایا۔

”شادی کیوں نہیں کی؟“ قدرے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

”کوئی نگاہ میں چچا ہی نہیں..... پھر ماتا پتا کی ناکام ازدواجی زندگی نے بھی ذہن پر اثر ڈالا۔ دل ڈرتا

تھا کہ رام جانے جو مرد جیون سا تھی بنے وہ کیسا سلوک کرے۔“

”میرے خیال میں تم بہت اچھی لڑکی ہو..... تم جس شخص کی پتی بنو گی وہ ضرور تمہاری قدر کرے گا۔

یاد رکھنا مرد سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں عورت کی سرکشی برداشت نہیں کرتے۔ جو عورتیں خاوند کی مطیع

رہتی ہیں اس کی بات مانتی ہیں مردان کی قدر کرتے ہیں۔ تمہاری طبیعت میں نرمی اور اطاعت گزاری

ہے۔ تم کامیاب ازدواجی زندگی گزارو گی۔“

”بھگوان کرے ایسا ہی ہو.....“

”تم نے بتایا تھا کہ تم غیر شادی شدہ ہو.....؟“ اس نے کسمسا کر میری طرف کروٹ بدلی تو اس کے

پُر شباب سینے کا زیرو بم میرے جذبات کو برا بیچنے کرنے لگا۔ اس کا خوبصورت چہرہ میرے چہرے کے

مقابل آ گیا تھا اور اس کی گرم سانسیں میری سانسوں سے الجھ رہی تھیں..... اندھیرے کے سبب میں

اسے ٹھیک طرح دیکھ نہیں سکتا تھا مگر پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔

”ہاں“ میں اکیلا ہوں..... میں نے مختصر جواب دیا اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑا کڑا

وقت تھا وہ! کچھ دیر خاموش رہ کر وہ جذبات میں لرزتی آواز میں گویا ہوئی۔



”مم..... میں تمہیں بے حد پسند کرتی ہوں۔ اگر یہ کہوں کہ تم سے پریم ہو گیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ کیا کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم دونوں ایک ہو جائیں.....؟“

مجھے اس کی بات کا جواب دینے میں تامل ہوا۔ اس نے بلا تکلف اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا اور مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ میں اسے ہاں کہہ سکتا تھا اور نہ ہی نفی میں جواب دے سکتا تھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟ جواب دو.....“ وہ بے تابی سے بولی۔ اس کا پُر شباب قرب میرے ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔ میں نے خدا کے حضور ہمیشہ کے لئے پاکیزہ زندگی گزارنے کا عہد نہ کیا ہوتا تو اب تک نفسانی خواہشات اور جذبات کے تند و تیز ریلے میں بہہ گیا ہوتا۔

”بات یہ ہے انیتا.....“ میں نے اس سے الگ ہونے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تم بلاشبہ بہت اچھی لڑکی ہو اور میرے دل میں تمہارے لئے پسندیدگی کے جذبات بھی ہیں مگر ہمارا ملاپ خاصی حد تک ناممکن ہے۔ تم ہندوستانی ہو، میں پاکستانی۔ علاوہ ازیں ہمارے درمیان دھرم کی ایک ناقابل عبور فاصلہ حائل ہے۔ ہم اس دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک اکٹھے چل سکتے ہیں مگر دیوار ہٹا کر ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے.....!“

”میرے خیال میں جذبے سچے ہوں تو وطنیت اور مذہب دو دلوں کے درمیان کسی طرح کی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ میں تمہاری خاطر ہندو دھرم چھوڑ سکتی ہوں۔ مجھے اسلام سے اچھی خاصی واقفیت ہے اور میں اسے پسند بھی کرتی ہوں۔ رہا مسئلہ وطنیت کا تو ہم دونوں امریکہ جا کر رہ سکتے ہیں۔!“

”میں تمہارے جذبات و احساسات کی قدر کرتا ہوں اور اس قدر قربانی دینے کے لئے آمادگی پر بھی شکر گزار ہوں، مگر مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت درکار ہے۔ ہم ایک بار اس سرد جہنم سے نکل کر مہذب دنیا میں پہنچ جائیں، پھر اس موضوع پر کھل کر بات کریں گے۔ فی الحال سونے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ میں نے اسے ٹالنا چاہا۔

”آہ! تمہارا قرب مجھ پر دیوانگی طاری کئے دے رہا ہے.....“ اس نے سسکتے ہوئے کہا اور میرے قریب کھسک آئی۔ اس پر خود سپردگی کی کیفیت طاری تھی اور وہ جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ ”خود کو سنبھالو انیتا.....“ میں نے اسے ڈپٹ کر کہا ”ورنہ میں سلپنگ بیگ سے باہر نکل جاؤں گا.....“ میری اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ قدرے پیچھے کھسک گئی۔

”اچھا میں کروٹ بدل لیتی ہوں.....“ اس نے کسمسا کر نقاہت بھری آواز میں کہا اور پہلو بدل کر دوسری طرف رخ پھیر لیا۔ میں نے بھی کروٹ بدلنے ہی میں عافیت سمجھی۔ پھر خاموشی کے طویل وقفے کے بعد آہستہ آہستہ ہمیں نیند کی دیوی نے اپنی مہربان آغوش میں لے لیا۔

صبح شور سے میری آنکھ کھلی۔ راہول آہ و بکا اور واویلا کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے زپ کھولی اور

سلیپنگ بیگ سے باہر نکل کر بدحوالی کے عام میں دوسرے بیڈ روم آیا۔ حنیف صاحب سے آنکھیں چار ہوئیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ راہول راجیش لے بیٹا، نہ پر ہکا ہوا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔

”کیا ہوا راہول..... حنیف صاحب کیا ہوا؟“ میں نے دونوں سے سوال کیا۔ ”راجیش انتقال کر گیا اقبال صاحب!“ حنیف صاحب کی آنسوؤں میں جھپکی ہوئی آواز میرے پردہ سماعت سے ٹکرائی۔ ”اوہ! ویری سیڈ.....“ میرا آنکھوں میں دکھ سے آنسو اُمڈ آئے۔

انیتا بھی میرے عقب میں آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کی سسکیاں اور آہ و بکا سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ وہ مجھ سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

راہول سے معلوم ہوا کہ راجیش رات بھر اپنی بیوی اور بچوں کو یاد کر کے بلکتا رہا تھا۔ اس کے زخم خراب ہو کر ناسور بن چکے تھے۔ ان کی سوزش اور ان میں اٹھنے والی درد کی ٹیسیں اب اس کے لئے ناقابل برداشت ہو چکی تھیں۔ اسے اپنے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ یہ اس کی مضبوط قوت ارادی تھی جس کے بل بوتے پر وہ موت سے لڑ رہا تھا۔ اسے کوئی تمنا تھی تو بس یہی کہ آخری بار اپنے بچوں کو دیکھ لے اور اپنی پیاری بیوی پاروتی کی گود میں سر رکھ کر ابدی نیند سو جائے۔ پاروتی سے اس نے محبت کی شادی کی تھی۔ وہ اس پر جان چھڑکتی تھی۔

”جیسی محبت ان میاں بیوی میں تھی، ویسی کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے.....“ راہول بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”میں ان کی محبت کا گواہ ہوں۔ میری فیملی کے ان کے ساتھ گھرے مراسم تھے۔ جب پاروتی اپنے پتی کی لاش دیکھے گی تو جانے اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ میں اپنے دوست کی لاش لے کر اس کے گھر ہر گز نہ جاؤں گا۔ مجھ سے وہ المناک منظر دیکھنا نہ جائے گا۔“

میں نے آگے بڑھ کر راجیش کا چہرہ دیکھا۔ اس کا جلا ہوا چہرہ اتنا بھیاں لگ رہا تھا کہ میری نظریں اس کی تاب نہ لاسکیں۔ میں آنسو پونچھتا پیچھے ہٹ گیا۔ میرے بعد انیتا نے اس کے چہرے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اسے لاش کے قریب ہونے کا موقع دے کر خیمے سے باہر نکل گیا..... ذہن پر انگنہ اور الجھا ہوا تھا۔ امید و یاس کی ملی جلی کیفیت تھی۔ میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ مطلع قدرے صاف ہو گیا تھا۔ مشرقی پہاڑ کے اوپر بادلوں کی چھتری تنی ہوئی تھی مگر سورج کو اتنی جگہ مل گئی تھی جہاں سے وہ جھانک کر دھرتی کا چہرہ دیکھ سکے۔ موسم میں یہ ڈرامائی تبدیلی بڑی حوصلہ افزا تھی۔ اگر موسم اسی طرح رہتا تو امدادی ہیلی کاپٹر کے لئے ہمیں وہاں سے نکال لے جانا آسان ہو جاتا..... میں دعا کرنے لگا کہ آج اس سرد جہنم سے گلو خلاصی ہو جائے۔ میں بلند ہوتے سورج کا جائزہ لے رہا تھا کہ راہول باہر آیا اور مجھ سے کہا۔



”اقبال بھیا..... راجیش کی لاش کو یہیں چھوڑ کر ہمیں اپنا سفر فوری طور پر دوبارہ شروع کر دینا چاہیے..... یہ جگہ ہیلی کاپٹر کے اترنے کے لئے غیر مناسب ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر کیا راجیش کی لاش یہاں پڑی رہے گی۔ اس کا کچھ بندوبست تو کرنا ہوگا؟“ میں نے استفسار کیا۔

”اسے ہم ابک خیمے میں لپیٹ کر رسی سے اچھی طرح پیک کر دیتے ہیں۔ اگر ہمیں لینے فوجی ہیلی کاپٹر آیا تو اسے ہم اس طرف لے آئیں گے۔ وہ فضا سے اپنی مضبوط رسی اور آئرن ہک لٹکائے گا اور اسے سلینگ (Sling) کر کے لے جائے۔ فوجی جوان اس کام میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔“

حنیف صاحب اور انیتا بھی ہمارے قریب پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے بھی راہول کی تجویز سے اتفاق کیا۔ چنانچہ ہم سب نے مل کر راجیش کی لاش کو پیراشوٹ کے چھوٹے خیمے میں اچھی طرح پیک کیا اور رسیوں سے باندھ کر اس قابل کر دیا کہ اسے ہیلی کاپٹر کی مدد سے با آسانی اٹھایا جاسکے۔ اس کے بعد ہم دوبارہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔

اگلے ایک میل کا فاصلہ ہم نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا۔ اس بار راجیش کی کشتی گھسیٹنے کی مشقت تھی اور نہ سامان کھینچنے کی مجبوری، مگر راستہ ایسا تھا کہ ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا پڑتا تھا۔ ہمارے پاس جوری تھی اس کا بڑا حصہ راجیش کی لاش پیک کرنے میں صرف ہو گیا تھا۔ صرف ایک ٹکڑا بچا تھا جسے حنیف صاحب اور راہول نے ایک دوسرے کو سہارا دینے کے لئے اپنی کمروں کے گرد باندھ رکھا تھا۔ وہ ہمارے آگے آگے چلتے تھے جبکہ میں اور انیتا ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فاصلہ طے کرتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہم سطح زمین سے کافی بلند پہاڑی درے پر پہنچے۔ ہم جب اس تنگ درے کو عبور کر رہے تھے تو ہمارے لئے بائیں جانب سینکڑوں ہزاروں فٹ گہری کھائیوں کی طرف دیکھنا ایک خوف زدہ کر دینے والا عمل تھا۔ ہم نیچے جھانکتے تو دہشت سے ہمارے جسم کا پٹنہ لگتے۔ ذرا سی لغزش ہمیں تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی تھی۔ پھر جس بات کا خطرہ تھا وہی یکا یک ہمارے سامنے آ گئی.....!

حنیف صاحب کا پاؤں پھسلا تو راہول بھی ان کے ساتھ ہی گرا اور اس سے پیشتر کہ میں اور انیتا ان کی مدد کو پہنچتے وہ کئی سو فٹ گہری کھائی میں گر چکے تھے اور ان پر کئی سو ٹن برف کھائی کی دیواروں سے ٹوٹ کر گر چکی تھی!

ہم اپنے دوستا ہیوں کی مہیب برفانی قبر کے کنارے دم بخود کھڑے رہ گئے۔ بے بسی لاچارگی اور دکھ کی انتہا کیا ہوتی ہے اس کا تجربہ مجھے اس بار ہوا۔

”آؤ.....“ میں نے انیتا کا ہاتھ پکڑ کر گلوگیر آواز میں کہا۔ ”خدا کا نام لے کر ہم دوسری سمت سے آگے بڑھتے ہیں۔“

”نہیں!“ وہ بے جان ہو کر برف پر گر گئی۔ ”مجھ میں چلنے کی ہمت نہیں۔ ہم بھی کھائی میں گر جائیں گے مگر جانیں گے..... ہائے رام!“ وہ بلکنے لگی۔

”ہمت سے کام لو انیتا.....“ میں نے اسے حوصلہ دیا۔ ”یاد رکھو زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جورات زمین کے اندر لکھی ہے وہ انسان زمین کے اوپر نہیں گزار سکتا۔ اسی طرح جورات اس کے نصیب میں زمین کے اوپر لکھی ہے وہ قبر میں ہرگز بسر نہ ہوگی..... آؤ ایک کوشش کریں۔ خدا کو منظور ہوا تو ہم موت کی اس وادی سے زندہ سلامت اپنی دنیا میں لوٹ جائیں گے.....“

میری باتوں سے اس کی ہمت بندھی ضرور مگر اس کی ٹانگوں میں بالکل جان نہ تھی۔ میں نے بادل نحواستہ اسے اپنی کمر پر لاد لیا اور خدا کا نام لے کر آگے بڑھنے لگا۔ اس بار مولا کریم نے مدد کی اور ڈھائی گھنٹے کے بعد میں ایک ایسے میدان میں پہنچ گیا جہاں برف باری کم ہوئی تھی اور کہیں کہیں کچی زمین بھی دکھائی دے رہی تھی۔ قریب ایک نالہ بھی بہہ رہا تھا جس میں پانی برائے نام تھا وہ نالہ کسی گلیشئر سے پکھلنے والی برف سے نکل رہا تھا۔

”لو یہاں بیٹھ جاؤ.....“ میں نے اسے ایک پتھر پر اتارتے ہوئے کہا اور خود دوسرے پتھر سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگا۔

”محبوب.....“ اس نے مجھے میرے اصل نام سے پہلی بار پکارا۔ ”تم نہ ہوتے تو شاید میں بھی کسی کھائی میں مری پڑی ہوتی.....“ اس نے احسان و تشکر کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ”تم بہت عظیم انسان ہو۔ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر تم مجھے یہاں تک لائے ہو۔“

”بار بار اس کا تذکرہ کر کے مجھے شرمندہ نہ کرو انیتا.....“ میں نے آسمان پر نظریں لگائے ہوئے کہا۔ ”میں نے جو کچھ کیا وہ میرا اخلاقی فرض تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا تعالیٰ کی مدد شامل حال تھی۔ ہم مسلمان اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی اجازت اور مدد کے بغیر درخت کا پتہ بھی نہیں مل سکتا۔“

”تم مسلمان خدا پر اس قدر اعتقاد رکھتے ہو؟“ اس نے تعجب سے کہا۔

”ہاں..... اور یہ اعتقاد بھی اسی کا احسان ہے۔ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔“

”محبوب..... میرا جی چاہ رہا ہے میں خدا کے اس احسان عظیم کی شکر گزاری میں میں تمہارے ہاتھ پر کلمہ پڑھ لوں..... مجھے فوراً مسلمان کر لو، محبوب فوراً مسلمان کر لو.....“ وہ رونے لگی۔

اس کی بات سن کر میرے منہ سے بے اختیار نعرہ تکبیر نکلا۔ میری آواز اتنی بلند تھی کہ آس پاس کے پہاڑ اور برفانی وادی گونج اٹھی۔ پھر میں بے اختیار سجدے میں گر گیا۔ خدائے عظیم نے مجھ گناہ گار کی ایسی توبہ قبول کی تھی کہ مجھے یہ سعادت بھی بخش ڈالی تھی کہ میں ایک کافر کو مسلمان کروں۔ میں نے اس سعادت کا ثمر سمیٹنے میں ایک لمحے کی دیر لگانا بھی نامناسب سمجھا۔ پہلے میں نے اس سے کفر سے پاکی



حاصل کرنے کی نیت کروا کر یتیم کروایا اور خود بھی کیا۔ اس کے بعد کلمہ شہادت پڑھوا کر اسے دائرہ اسلام میں داخل کر لیا۔

”آج سے تمہارا نام مومنہ ہے۔۔۔۔۔ میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ ایسی زندگی بسر کرو جو ایک مسلمان اور مومن عورت کا شیوہ ہے۔“ میں نے پرسوز لہجے میں کہا۔

”میں خدا کو حاضر ناظر جان کر عہد کرتی ہوں کہ آئندہ دین اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کروں گی۔“ اس نے خلوص نیت سے عہد کیا۔ سچے وعدے کی روشنی اس کے خوبصورت چہرے پر اپنا عکس دکھا رہی تھی۔

اسی لمحے مغرب کی سمت سے ہیلی کاپٹر کی آمد کی گڑ گڑاہٹ سنائی دی۔ وہ ہماری ہی طرف آرہا تھا۔ ہم دونوں اٹھ کر اسے ہاتھ ہلانے لگے۔ پائلٹ نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ اس نے ہمارے سروں پر ایک لمبا چکر لگایا اور پھر ہم سے پچاس ساٹھ گز دور ایک صاف قطعہ زمین پر اتر گیا۔

ہم دونوں ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑ پڑے۔ ہمارے اندر دیوانگی تھی۔ جب ہم ہیلی کاپٹر میں سوار ہوئے تو ہمارے دل غم اور خوشی کے جذبات سے معمور تھے۔ غم اپنے ساتھیوں کی موت کا تھا اور خوشی نئی زندگی پانے کی۔

☆.....☆.....☆

دلی پہنچنے پر ہمارا جو استقبال ہوا وہ دیدنی تھا۔ ہمیں ٹی وی ریڈیو اخبارات اور رسائل کے نمائندوں نے گھیر لیا۔ ہماری اتنی تصویریں بنیں اتنے انٹرویو ہوئے کہ بیان سے باہر ہے۔ جگہ جگہ ہماری دعوتیں ہوئیں۔ ہمیں پارٹیوں اور فنکشنوں میں بلایا گیا اور ہمیں ہمت و استقامت کے پیکر قرار دے کر پوری ہندوستانی قوم کے ہیر و قرار دیا گیا۔ ہندو پولیس نے انیتا کے قبول اسلام کے واقعہ کو البتہ بہت منفی رنگ دیا اور اسے وقتی اُبال اور جذباتی حرکت گردانتے رہے۔ تاہم مومنہ اپنے ایمان پر ایک عزم اور پختگی سے قائم رہی اور بار بار اس بات کا اظہار کیا کہ وہ دل و جان سے اور بہت سوچ سمجھ کر مسلمان ہوئی ہے۔

میری اصل وطنیت کا معاملہ ایسا تھا جس کا پردہ چاک ہو جاتا تو بڑی گڑ بڑ ہو جاتی، مگر خدا نے اس پر بھی پردہ ڈال دیا اور میں ایک ایسے کشمیری نوجوان کے طور پر سامنے آیا جس کے خاندان کے سبھی افراد امریکہ میں مقیم تھے۔ چند روز بعد فضائی حادثے کی خبروں کی اہمیت اور ہمارے انٹرویو وغیرہ کے معاملات سرد پڑے تو میں نے نیویارک میں مسٹر براؤن سے رابطہ کیا۔

”میں آپ سے بہت سخت ناراض ہوں۔ اتنے دن کہاں رہے اور مجھ سے رابطہ کیوں قائم نہیں کیا۔ جولیا بھی آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔“ انہوں نے گلوں شکوؤں کے انبار لگا دیئے۔

”بس کچھ عجیب و غریب مصروفیات تھیں مسٹر براؤن، جس کی وجہ سے رابطہ نہیں کر سکا۔ میں اس کی

معافی چاہتا ہوں۔ اللہ جلد ہی آپ سے ملوں گا تو آپ کے سارے گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔“ میں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

”اس وقت آپ کہاں ہیں۔۔۔۔۔ اوپر میٹر کہہ رہا تھا کہ ہندوستان سے کال ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں نئی دلی سے بول رہا ہوں۔“

”وہاں راحیلہ کی ماں سے ملنے گئے ہوں گے؟ کیسی ہیں وہ؟“

”میں ابھی ان سے ملا نہیں۔ ممکن ہے کل صبح ملنے جاؤں۔“

”اوکے جب ان سے ملاقات ہو تو انہیں میرا سلام کہنا۔“

”ضرور۔۔۔۔۔“

”اور کوئی خدمت میرے لئے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ایک کام ہے مسٹر براؤن۔“ میں نے جلدی سے کہا ”میرے لئے انڈیا سے امریکہ کے ویزے اور ٹکٹ کا فوری بندوبست کیجئے۔ ویزے اور ٹکٹ پر میرا نام محبوب احمد خان درج ہو۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے بندوبست ہو جائے گا“ انہوں نے تفصیل میں جائے بغیر کہا۔

”کب آنا چاہتے ہیں؟“

”زیادہ سے زیادہ چار پانچ روز بعد یہاں سے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔“

”فکر نہ کریں۔۔۔۔۔ اپنا رہائشی پتہ بتادیں۔۔۔۔۔ میرا آدمی کاغذات اور ٹکٹ لیکر وہاں پہنچ جائے گا۔“

میں نے مسٹر براؤن کو کنٹ پیلس میں واقع اس فلیٹ کا پتہ لکھا دیا جہاں میں اور مومنہ رہائش پذیر تھے۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح قریبی مسجد میں فجر کی نماز باجماعت ادا کر کے میں سیر کے لئے ایک سڑک پر جا نکلا۔ اس کے دنوں کناروں پر سرسبز گھاس کے قطعات تھے اور ان میں سدا بہار پیڑ مثلاً ایروکیریا، لسٹونیا، پاپلز اشوکا ٹری اور ملتا سسراٹھائے کھڑے تھے۔ نیچے رنگ برنگی باڑیں، گلاب کی روشیں، چنبیلی، موتیا، بوگن ویلیا اور چھوٹے گلاب کی بلیں تھیں۔ قطعات کے پار بڑے بڑے شاندار بنگلے اور کوٹھیاں تھیں جن کی بناوٹ اور سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان گھروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے کراچی میں واقع اپنی کوٹھی یاد آئی اور پوری فیملی کے چہرے یکبارگی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ اپنے مرحوم فیملی ممبرز کے علاوہ تایا جان اور ان کے بچے بھی یاد آئے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ چمپون کی میری زندگی میں آمد ایک ایسی نحوست تھی جس کی لپیٹ میں آ کر میرا چین سکون لٹ گیا اور پورا گھرانہ تباہی سے دوچار ہو گیا تھا۔ سود و ضیاع کا تخمینہ لگایا جائے تو چند روزہ عیش و عشرت اور ترنگ و مستی کے سوا



میری جھولی میں کیا پڑا تھا؟ میں نے اس دوران بے کناہ انسانوں کے ہاتھ خون سے رلے تھے اور خدا کی قائم کردہ اخلاقی حدود توڑ کر بدکاری کا ارتکاب کرتا رہا تھا۔ میں نے اپنی دنیا اور عاقبت دونوں کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اگر میرے ساتھ فضائی حادثہ پیش نہ آتا تو شاید مجھے کبھی ہوش نہ آتا اور توبہ کی توفیق بھی حاصل نہ ہوتی اور میں یونہی گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا اور کسی روز اپنے مد مقابل عامل سادھو یا پنڈت کے ہاتھوں جنم واصل ہو جاتا۔ ایسے بہت تھے جو اسے تسخیر کرنے کے لئے جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے یا پورے چاند کی راتوں میں سمندری ساحلوں پر اپنے ننھے بچوں پوتوں یا بھتیجیوں کو اس آس میں لے کر گھوما کرتے کہ شاید چپوں کی نگاہ انتخاب ان پر پڑ جائے اور جب وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھیں تو چپوں ان پر مہربان ہو جائے اور اس طرح اپنے بچے کے طفیل انہیں بھی دھن دولت اور بے پناہ امارت کی زندگی تک رسائی حاصل ہو جائے۔ میرے دادا جان بھی انسانوں کی اسی قبیل سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے جانتے بوجھتے مجھے اس آگ میں دھکیلا تھا۔

انسانوں پر دولت اور پیسے سے بڑی آزمائش آج تک نہیں اُتری۔ اس کی خاطر انسان رشتوں ناطوں کو پامال کرتے دین دھرم داؤ پر لگاتے اور بری شہرت و بدنامی کے داغ قبول کرتے ہیں۔ پیسے کے حصول کے لئے وہ اپنے جیسے انسانوں کا گلا کاٹنے اور ان کی زندگیوں سے کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ذرا نظر دوڑائیے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی رشتوں کی ناقدری، فتویٰ فروشی، کرپشن، بدکاری، بد امنی، جنگ و جدل اور لوٹ مار پر..... انسان کے ہر ایسے عمل کا محرک پیسہ، دھن اور دولت ہی ہے۔ وہ پیسے جسے ہر کوئی ہاتھوں کا میل کہتا ہے۔ جو مرتے ہوئے انسان یہیں اس زمین پر چھوڑ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جب ابدی سفر پر روانہ ہوتا ہے تو ایسا سفید لباس زیب تن کرتا ہے جس کی کوئی جیب نہیں ہوتی.....!

میں انہی خیالات کی یلغار میں چلتا چلتا کافی دور نکل گیا۔ آگے مغلیہ دور کا ایک اجڑا ہوا باغ تھا جس میں شکستہ بارہ دریاں تھیں۔ باغ کی بیرونی دیوار جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے ساتھ کارپوریشن کا کچرا گھر تھا جسے جمعداروں نے صبح صبح آگ دکھائی تھی۔ کوڑا کرکٹ فضا میں تعفن اور سڑاند پھیلاتے ہوئے سلگ رہا تھا اور اس کے قریب تین چار خارش زدہ کتے اور دو موٹی بلیاں کوڑے سے خوراک تلاش کرتے ہوئے لڑبھڑ رہی تھیں۔ ایک بارہ سالہ لڑکا کمر پر بورا لٹکائے کچرے کے ڈھیر سے کاغذ چن رہا تھا۔ میں ناک پر رومال رکھ کر وہاں سے واپس پلٹا تو ٹھٹھک کر رک گیا۔ تین کالے بھنگ لوفر سے آدمی پرانے ماڈل کی فوجی جیب میں جو اوپر سے کھلی تھی میرے تعاقب میں آرہے تھے۔ جیب کے بریک سین میرے قدموں میں آکر زور سے چرچرائے تو میں اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔

ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ باقی دونوں آدمی جیب سے کود کر میرے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں خنجر اور دوسرے کے ہاتھ میں ریوا لور تھا۔

”سیدھے سبھاؤ جیب میں بیٹھ جاؤ۔“ پستول بردار آدمی کرخت آواز میں بولا ”چوں چراں کی تو سالا کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔“

میں نے ہاتھ اوپر اٹھائے اور مشتعل ہوئے بغیر نرمی سے کہا ”میں دلی میں کسی کو نہیں جانتا۔ نہ ہی کسی سے میری دشمنی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے تم لوگ کہاں اور کیوں لے جانا چاہتے ہو؟“

”ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمیں بھورے دادا نے تمہیں اٹھالانے کا حکم دیا ہے۔ یاد رکھو جو پاؤں پر چل کر نہ جائے اسے ہم اسٹریچر پر لے جاتے ہیں۔“

”بھورے دادا کون ہے؟“ میں نے ذہن پر زور دیا۔ ”اس کی مجھ سے کیا دشمنی ہے؟“

”ارے جیب میں بیٹھ سالا!“ خنجر بردار نے خنجر کی نوک میری گردن میں چبھوتے ہوئے کہا۔

”کوئی سوال کرنا ہو تو ڈائریکٹ بھورے دادا سے کرنا!“

میراجی چاہا پلٹ کر ایک گھونسا اس کے جبرٹوں پر رسید کروں مگر پہلو میں کھڑا دوسرا آدمی ریوا لور سے مسلح تھا۔ اس کی موجودگی میں یہ خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔ اس لئے بادل خواستہ میں ان کی جیب میں بیٹھ گیا۔ ان دونوں نے مجھے اپنے درمیان بٹھایا اور اپنے اپنے ہتھیار میرے پہلو سے لگا دیئے۔ کچرے سے کاغذ چننے والے لڑکے نے یہ منظر دیکھا تو وہاں سے بھاگ اٹھا۔ ڈرائیور اُجڑے ہوئے باغ کی دیوار کے ساتھ ساتھ کچے ٹریک پر جیب دوڑانے لگا۔ جب باغ کی دیوار ختم ہوئی تو پہلے ایک کچی بستی آئی، پھر جھگیوں اور جھونپڑیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ آگے ایک گندانا لہ تھا جس کے تیسرے پل کے پاس ایک دو منزلہ حویلی نما عمارت تھی اور اس کے پہلو میں پرانا سامندر تھا جس کے باہر پتھر کا ایک بورڈ نظر آ رہا تھا۔

”شیو جی مندر۔“

پتھر کے بورڈ پر ہندی اور انگریزی میں کھدائی کر کے مندر کا نام لکھا گیا تھا۔ مندر کا بورڈ دیکھتے ہی میرے ذہن میں جھماکا ہوا اور یہ خیال ذہن میں کسی سنیو لیے کی طرح سرسرا نے لگا کہ میرے اغواء سے ضرور پنڈت تلسی داس کا کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔ میں فضائی حادثے میں بچ نکلا تھا جس کی خبر اسے اخبارات سے ہو گئی ہوگی۔ اسے خطرہ ہوگا کہ میں اس کے جاپ کو ناکام بنانے کی سعی کروں گا۔ اسی خوف سے اس نے مجھے اغواء کروایا ہوگا۔ یہ خیال آیا تو میں پنڈت تلسی داس کے اس اقدام پر دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔

”نیچے اترو.....“ جیب حویلی کے اندر داخل ہو کر رک کی تو پستول بردار شخص نے مجھے ٹھوکا دیا۔

میں نے بلاچوں و چراں اس کے حکم کی تعمیل کی۔

وہ دونوں مجھے اپنے نرغے میں لے کر ایک تاریک سے تہہ خانے میں لے گئے اور وہاں بند کر کے



”رکو.....!“ میں نے باواز بلند کہا۔

وہ ٹھٹھک کر رک گئے اور پلٹ کر تعجب سے میری طرف دیکھا۔

”دیکھو میں کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں کہ مجھے کیوں اغواء کیا گیا ہے۔ پلیز بھورے دادا سے فوری طور پر

میری ملاقات کرواؤ.....“

”ہاہاہا!“ میری بات ابھی ادھوری تھی کہ دونوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔

”ارے چھنگا استاد!“ پستول بردار نے دوسرے آدمی سے کہا۔ ”یہ تہہ خانہ سالابڑا کرشمے باز ہے۔

اس میں قدم رکھتے ہی کھوپڑی سالی کام کرنے لگتی ہے!!“

”دیکھو..... مجھے یقین ہے کہ پنڈت تلسی داس نے بھورے دادا سے کہہ کر مجھے اغواء کروایا ہے۔ وہ

ایک ایسی دیوی کو تسخیر کرنے کے لئے جاپ میں مصروف ہے جو اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ پہلے

میں اسے اس جاپ سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جس کی وجہ سے ہمارے درمیان ٹھن گئی تھی اور ایک

طرح کی دشمنی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر یقین کرو اب ایسا کوئی سلسلہ نہیں۔ میں تو اب خود اس دیوی سے جان

چھڑانا چاہتا ہوں۔ پنڈت تلسی داس بھلے اپنا جاپ جاری رکھے میں اس کی راہ میں کسی طرح کی رکاوٹ

نہیں ڈالوں گا۔ میں ہر طرح کا چین دینے کو تیار ہوں.....!“

میں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

”کیا واقعی تمہارے قبضے میں کوئی دیوی ہے؟“ وہ آدمی جس کا نام چھنگا تھا حیرت بھرے انداز میں

گویا ہوا۔

”ہاں..... یہ سچ ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو پھر اس دیوی نے تمہیں اغواء ہونے سے کیوں نہ بچایا؟“ وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔

”پنڈت تلسی داس نے اس کے اور میرے درمیان ایک حصار کھینچ ڈالا ہے۔ ایک ایسا پردہ جس کے

آر پار دیکھنے سے وہ دیوی قاصر ہے۔“ میں نے سر جھکا کر کہا۔

”چپ بے..... نوٹسکی کے مسخرے!“ اس نے مجھے ڈانٹا ”خاموشی سے اس تہہ خانے میں پڑا رہ اور

بھوجن کھا۔ تین دن بعد ہم تمہیں خود ہی نکال دیں گے۔ ہمیں یہی حکم ملا ہے۔ اس دوران سالابندت اپنا

جاپ مکمل کر لے گا۔ تین دن بعد جہاں من چاہے چلے جانا۔ اور ہاں کسی سے ذکر کیا تو اگلے روز تمہارے

لاش گندے نالے سے ملے گی۔ سمجھ گئے!“

وہ مجھے دھمکاتے گھورتے چلے گئے اور میں تہہ خانے میں اکیلا رہ گیا۔

وہ ایک متعفن اور تنگ و تاریک تہہ خانہ تھا جس میں روشنی اور ہوا کا گزر بہت کم تھا۔ اس میں تین دن

کزارنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ مجھے اس تصور ہی سے ہول آنے لگا۔ مجھے مومنہ کی بھی فکر تھی۔ نماز فجر کے بعد میرے نہ لوٹنے سے وہ متفکر ضرور ہوگی اور جب میں شام تک واپس نہ لوٹوں گا تو خدا جانے پریشانی میں پھر وہ کیا کر بیٹھے۔ وہ پولیس کو مطلع کر سکتی تھی۔ لیکن پولیس بھی اتنی جلدی مجھ تک کہاں پہنچے گی۔ بڑے شہروں کے نامی گرامی غنڈے بد معاش اور دادا لوگ ساری بد معاشی پولیس کے زور ہی پر کرتے ہیں۔ پولیس کو ان کے اڈوں اور پاڑوں سے باقاعدہ بھاڑ ملتا ہے جس کی وجہ سے پولیس ان کی سرگرمیوں سے آنکھیں بند کئے رکھتی ہے۔ کیا کراچی، کیا ممبئی، کلکتہ، رنگون، دلی اور بنکاک تمام بڑے ایشیائی شہروں میں ایسا ہی ہوتا ہے! پولیس مجھے ہرگز نہ چھڑائے گی۔ النامومنہ کا یہ اقدام غنڈوں کو اشتعال دلانے کا باعث بنے گا۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور میں اس تہہ خانے سے نکل بھاگوں۔

میں نے ٹولتی نظروں سے تہہ خانے کے دیوار و در کا جائزہ لیا۔ یہ 8x8 فٹ کا کمرہ تھا جس میں 1x1 فٹ کا ایک چوبی روشن دان تھا جو گندے نالے کے کنارے کھلتا تھا۔ اس روشن دان سے زمین بمشکل چھ سات انچ نیچے تھے۔ میں نے اس روشن دان کو اکھیڑ ڈالنے کا فیصلہ کیا، لیکن یہ کام فوری طور پر شروع کرنا حکمت عملی کے خلاف تھا۔ اس بات کا امکان بہر حال موجود تھا کہ دونوں غنڈے ہنوز حویلی کے اندر ہی ہوں۔ روشن دان کے ساتھ زور آزمائی کی آوازیں انہیں متوجہ کر سکتی تھیں اور وہ میرے منصوبے کو خاک میں ملا سکتے تھے۔ یہ سوچ کر میں ایک کونے میں بیٹھ گیا اور درود شریف کا ورد کرنے لگا۔ درود پاک پڑھنے سے دل کو سکون اور طمانیت ملی۔

گھنٹہ بھر بعد مجھے کہیں دور سے جیپ اشارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر کسی نے پھانک کھولا جس کی چرچراہٹ صاف سنائی دی۔ اس کے بعد جیپ کہیں روانہ ہو گئی۔ تینوں غنڈے وہاں سے چلے گئے تھے۔ اب میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ پہلے میں نے اٹھ کر سیڑھیاں چڑھیں اور آہنی دروازے کو کھینچ کر دیکھا مگر مضبوط دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسے باہر سے مقفل کر دیا گیا تھا۔ سوچا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑاتا ہوں۔ دھڑ دھڑاہٹ سن کر کوئی نہ کوئی شخص خبر لینے آئے گا۔ اس وقت کوشش کروں گا کہ کسی بہانے وہ دروازہ کھول کر میرا حال دریافت کرے اور میں اسے قابو میں کر کے بھاگ نکلوں۔ مگر اس منصوبے میں یہ ریسک بہر حال موجود تھا کہ حویلی میں اور لوگ بھی موجود ہوں اور میں پکڑا جاؤں۔ ایک بار پکڑے جانے کے بعد دوبارہ بھاگ نکلنے کے امکانات بالکل مسدود ہو جاتے۔ چنانچہ یہ منصوبہ ترک کر دیا اور روشن دان سے زور آزمائی کرنے لگا۔ لکری کا فریم اور پٹ اکھاڑنے میں مجھے زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ مسئلہ یہ تھا کہ سوراخ صرف 1x1 فٹ کا تھا جس میں سے میرے ڈبل ڈول کا کڑیل جوان باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ باہر نکلنے کے لئے سوراخ کو خاطر خواہ کھلا کر نا ضروری تھا۔ میں نے پٹ کی مضبوط پھٹی کی مدد



سے اینٹوں کو کھولیں ماری تروغ میں تو کھوڑی مشقت کے بعد ایک طرف کی اینٹیں باہر نکل آئیں۔ میں خوش ہو کر جلدی جلدی اینٹیں ہٹا رہا تھا کہ یک لخت بے شمار سیاہ بچھو اینٹوں کے نیچے سے برآمد ہوئے اور مجھ پر حملہ کر دیا!

میں نے چھلانگ لگا کر خود کو ان کے زہر بھرے ڈنگ سے بچایا۔ بدحواسی میں ایک اینٹ میرے پاؤں پر گری اور میں شدید چوٹ کے احساس اور ناقابل برداشت درد سے بلبلا اٹھا۔ میں سنبھلا تو یہ دیکھ کر دہشت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ اس تہہ خانے میں بچھوؤں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی! وہ قطار در قطار روشن دان کی اکھڑی ہوئی اینٹوں سے تہہ خانے میں اتر رہے تھے اور سیلن زدہ فرش ان کی کثرت کے سبب سیاہ نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ سب یک بارگی میری طرف دوڑے تو خوف و دہشت سے میری چیخ نکل گئی.....! میں نے جان بچانے کے لئے چیختے ہوئے تہہ خانے میں ادھر ادھر دوڑ لگائی مگر جگہ کی تنگی کے پیش نظریہ تدبیر بھی بے کار گئی اور بچھو میرے جسم پر چڑھ کر مجھے ڈسنے لگے۔ اف خدایا! درد کی وہ شدت اور جلن لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ میرے رگ و پے میں جیسے دھکتے ہوئے انگارے بھر گئے تھے۔ میں بری طرح چیخ چلا رہا تھا مگر میری چیخیں تہہ خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر دم توڑ رہی تھیں۔ دور و نزدیک کوئی میری چیخیں سننے والا نہیں تھا۔ یا ممکن ہے کسی نے چیخیں سنی ہوں مگر بھورے دادا کے ڈر سے میری مدد کیلئے آنے کی جرأت نہ کی ہو۔ میں بے ہوش ہونے کے قریب تھا کہ تہہ خانے کے ملگجے اندھیرے میں مجھے کالی کے بیر شکر کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ دانت نکوستے ہوئے مجھ سے کہہ رہا تھا:

”کیوں بے! تو باز کیوں نہیں آتا؟ اس سالی چمپوں کی خاطر اپنی جان کا دشمن کیوں بنا ہوا ہے؟ یاد رکھ تو کچھ بھی کر لے پنڈت تلسی داس کی جاپ کو مکمل ہونے سے نہیں روک سکتا۔“

میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ میں نے چند منٹ پہلے جو کچھ دیکھا اور بھگتا تھا وہ سحر کاری کے سوا کچھ نہ تھا۔ کالے ایلم کا کرشمہ! گندے موٹوں پہ انحصار کرنے والا پنڈت میری قلبی کیفیات جاننے سے قاصر تھا اور اپنے تئیں مجھے اس بات کی سزا دے رہا تھا کہ میں اس کے جاپ میں رخنہ ڈالنے کے درپے تھا جبکہ اصل صورت حال کچھ اور تھی!

”سنو شنکر!“ میں نے اپنی پکی کچی قوت مجتمع کرتے ہوئے کہا ”پنڈت کو بتا دو کہ مجھے اب چمپوں سے کوئی دلچسپی نہیں..... وہ شوق سے اسے تسخیر کرے۔ یہ سب کچھ میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ جان بخشی کا طلب گار ہوں..... میرے اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہے اور میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں اسی سے مدد اور معافی کا طلب گار ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے جوش سے یہ کلمہ پڑھا:

اللہ ربی لا شریک لہ حسبن اللہ ونعم الوکیل

جو ہی میرے منہ سے یہ کلمہ نکلا سترے ایک بیج ماری اور دھویں میں میل ہو گیا۔ لمرے میں موجود سینکڑوں بچھو بھی چرمر ہو کر راکھ میں بدل گئے اور تہہ خانے میں سڑاند پھیل گئی۔ یہ منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور رب ذوالجلال کی حقانیت کے بارے میں حق الیقین ہو گیا.....!“

میں آیت الکرسی چاروں قل استغفار اور درود شریف پڑھتا ہوا روشن دان کی اینٹوں کو ہٹاتا گیا اور تھوڑی تگ و دو کے بعد باہر آ گیا..... اس کے بعد سرپٹ گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔

☆.....☆.....☆

مومنہ کا خیال تھا کہ پولیس کو مطلع کر کے ان غنڈوں اور پنڈت تلسی داس کے خلاف ایف آئی آر درج کروانی چاہیے۔ اسے ساڑھے آٹھ بجے محلے کے کچھ لڑکوں سے واردات کی غیر مصدقہ اطلاع مل گئی تھی (انہوں نے کچرے سے کاغذ چننے والے لڑے سے سنا تھا) مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی قدم اٹھاتی، میں تہہ خانے سے نکل بھاگا تھا..... اس طلسم کدے سے دور نکلتے ہی بچھو کے ڈنک کا درد زائل ہو گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے سب کچھ ایک بھیا نک خواب تھا۔

اگلے دو تین روز سفر کی تیاری میں گزرے۔ کلثوم بی بی سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ راحیلہ کو یاد کر کے روتی رہیں۔ میں نے انہیں دلاسا دیا اور کہا کہ اب مومنہ کی صورت میں انہیں خدا نے ایک اور بیٹی دے دی ہے وہ خوش ہو جائیں۔ مومنہ نے بھی بڑی سعادت دکھائی اور انہیں ماں کا درجہ دینے میں کسی بخل سے کام نہ لیا۔ مومنہ کی دلی تمنا مجھ سے ڈھکی چھپی نہ تھی، مگر میں نے اسے باور کرایا کہ فی الحال میں اس سلسلے میں کوئی بھی وعدہ کرنے سے قاصر ہوں۔ میں فوری طور پر نیویارک جا رہا ہوں اس کے بعد عمرے کا ارادہ ہے۔ خانہ خدا میں حاضری کے بعد ہی کوئی حتمی بات کر سکوں گا.....

میری بات سن کر اس نے اپنی بھگی ہوئی پلکیں اوپر اٹھائیں اور آہستگی سے کہا:

”میں تمہارے فیصلے کی منتظر رہوں گی.....“

☆.....☆.....☆

نیویارک میں چند روز مسٹر براؤن اور جولیا کی مہمان نوازی کا لطف اٹھانے کے بعد میں عازم مصر ہوا جہاں مجھے ٹورازم پر ایک سیمینار میں شرکت کرنا تھی۔ اس سہ روزہ سیمینار کے بعد میں عمرہ کی ادائیگی کے لئے حرمین شریفین جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ہوائی جہاز جب قاہرہ کے انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر اترتا تو مغرب کی سمت شفق کی سرخی پھیلی ہوئی تھی اور سرمئی شام نے اپنے پر پھیلا لئے تھے۔ قاہرہ کی شاہیں بہت خنک اور خوشگوار ہوتی ہیں۔ یہ دریائے نیل کے قرب کا اثر ہے اور حد نظر تک پھیلے ہوئے صحراؤں کی ابدی تاثیر جہاں دن گرم اور راتیں سرد ہوتی ہیں۔ سیمینار کے شرکاء کے قیام و طعام کا بندوبست قاہرہ کے مشہور فائیو اسٹار ہوٹل ”نائل ہلٹن“ میں کیا گیا



تھا۔ اسی کے ایک وسیع ہال میں سیمینار کا انعقاد ہونا تھا۔

میں نے کمرے میں پہنچ کر کچھ دیر آرام کیا۔ پھر نہا کر کپڑے بدلے اور ہوٹل کے سوئمنگ پول کا رخ کیا جہاں پول سائیڈ باربی کیو کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں خاصی رونق تھی۔ ملکی و غیر ملکی خواتین و حضرات کی ایک بڑی تعداد روایتی مصری کھانوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہاں جمع تھی۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے وہاں کے ماحول کو قدیم مصری ٹیج دینے کے لئے اہرام اور ابوالہول کے گتے کے ماڈل، سنگی مخطوطات اور انواع و اقسام کے جسمے ایتادہ کر رکھے تھے۔ سوئمنگ پول میں ایک سچی سبائی کشتی تیر رہی تھی جسے ملکہ نفرتیتی کی ناؤ کا نام دیا گیا تھا۔ اس میں باقاعدہ ایک مصری حسینہ ملکہ نفرتیتی کا روپ دھارے دو خادماؤں کے ساتھ محو استراحت تھی۔ پول کے کنارے دو سازندے قدیم مصری ساز ظنبورہ اور نفیری بجارہ تھے۔ گیت کی دھن ایسی دلنشین تھی کہ جی چاہتا تھا سازندے دھن بجاتے رہیں اور انسان سنتا رہے۔ الغرض ماحول کو عجیب سحر انگیز اور رومانوی رنگ دیا گیا تھا۔ عام حالات ہوتے تو مجھ پر اس ماحول کا یہی اثر ہوتا کہ کسی حسینہ کی زلف گرہ گیر کا وقتی اسیر ہو کر کسی گوشہء تنہائی کا رخ کرتا اور شام کو مزید رنگین، سنگین اور حسین بنا ڈالتا، مگر اب اندر کی دنیا ایسی بدلتی تھی کہ کسی ماہ رخ کی طرف نگاہ بھر کر دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔

میں نے پلیٹ اٹھا کر شرفا کی طرح قطار میں لگ کر شیف ڈشوں سے اپنی پسند کے کھانے تھوڑی تھوڑی مقدار میں پلیٹ میں ڈالے اور ایک خالی میز پر جا کر بیٹھ گیا اور بسم اللہ پڑھ کر کھانے سے لطف اندوز ہونے لگا۔ روغن زیتون اور کالی مرچ میں پکا ہوا اونٹ کا گوشت، دریائے نیل کی مچھلی کے کباب اور مصری پلاؤ اس قدر لذیذ تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں کھانے کی سیکنڈ شفٹ کے لئے اٹھنے والا تھا کہ مجھے اپنے قریب کسی خاتون کی موجودگی کا احساس ہوا اور اگلے ہی لمحے کسی نے دلکش انگریزی لہجے میں مجھ سے کہا:

”ہیلو..... ہاؤ ڈو یو ڈو؟“

میں نے نگاہ اوپر اٹھائی تو چونک گیا۔ میرے سامنے مصریات کی اسکا لرا اور حسین امریکی لڑکی ریٹا مسکرا رہی تھی!

”اوہ! ریٹا! تم!“ میں کھڑا ہو گیا۔

”کیسے ہو؟“ اس نے سوال کیا اور اپنی کھانے سے بھری ہوئی پلیٹ میز پر رکھ کر کرسی گھسیٹی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟“

”ویری فائن۔ تم کھانا لینے جا رہے تھے؟ آئی ایم سوری۔ تم کھانا لے آؤ پھر باتیں کریں گے۔“

میں دوبارہ قطار میں جا لگا اور اس بات پر غور کرنے لگا کہ انسان کی قلبی کیفیات جب بدلتی ہیں تو اس کے رویے میں کیسی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہی وہ ریٹا تھی جس کی قربت حاصل کرنے کے

لئے میں اس قدر بے چین تھا کہ زمانہء قدیم کے بابل سے اپنے زمانے میں واپس لوٹتے ہی بغداد سے سیدھا قاہرہ آنا چاہتا تھا اور اب..... جب وہ خود چل کر میرے پاس آ پہنچی تھی تو میرے دل میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی..... چپوں نے جب مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی اور مرد کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھا رہی ہے تو میرے اندر رقابت کے جذبے نے سر اٹھایا تھا مگر اب یہ حالت تھی کہ اگر وہ میرے سامنے مجھ سے ”ایکسوزمی“ کہہ کر کسی اور مرد کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلی جاتی تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوتا بلکہ میں اطمینان کی گہری سانس لیتا کہ چلو ایک ”پینجر ٹرین“ سے جان چھوٹی!

میں کھانا لے کر واپس لوٹا تو وہ بے تابی سے میرا انتظار کر رہی تھی..... میں اس کے سامنے بیٹھا تو وہ مجھ سے گزرے ہوئے ایام کی باتیں کرنے لگی۔ وہ بے تکان سوالات کر رہی تھی اور اپنی مصروفیات کے بارے میں بھی بتا رہی تھی۔ میں اخلاقاً اس کی باتوں کے مناسب جواب دیتا رہا اور اس کے روز و شب کے بارے میں ذاتی حوالوں سے قطع نظر گفتگو کرتا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ طوح آ من کا جو مجسمہ دکاندار عبداللہ کی دکان سے چوری ہوا تھا، وہ پولیس نے برآمد کر لیا ہے اور مجرم پکڑے جا چکے ہیں۔ اس ضمن میں پولیس نے انٹر پول کے ذریعے دو امریکی پروفیسروں کو بھی گرفتار کیا ہے۔ ان میں سے ایک ریٹا کا استاد بھی تھا۔

”مجھے خوشی یہ ہے کہ طوح آ من کا قیمتی مجسمہ مل گیا۔ ایسے نوادرات پوری انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہوتے ہیں اور کسی بڑے عجائب گھر میں رکھنے کی چیز ہوتے ہیں تاکہ عوام بھی اسے دیکھ سکیں، Appreciate کر سکیں۔ خدا جانے بعض خود غرض امراء کیوں انہیں اپنے ذاتی میوزیم میں قید کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ناجائز حربے آزمانے سے بھی دریغ نہیں کرتے؟“

”شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا مس ریٹا..... پھر انسان بنیادی طور پر خود غرض واقع ہوا ہے۔ دوسرے کے حقوق، خواہشات اور احساسات کا احترام کرنے والے بہت کم لوگ ہوتے ہیں.....“

ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد اس نے بے باکی سے پوچھا:

”آئی ہوپ، تم اکیلے ہی ہو..... کوئی آج کی شام تمہارا ساتھی تو نہیں؟“

”نہیں.....!“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”تھینک گاڈ.....“ وہ چپکی ”آؤ پھر پہلے ایک ڈرنک ہو جائے.....“

”نہیں شکریہ..... میرا موڈ نہیں۔“

اس نے قدرے اچھنبے سے میری طرف دیکھا۔ ایک مائل بہ کرم امریکی دوشیزہ کے لئے مرد کی طرف سے ایسا سرد مہری کا رویہ عجیب ہی تو ہوگا۔

”آئی ہوپ ایوری تھنگ سی آل رائٹ؟“ وہ جھجک کر میرے آنکھوں میں جھانکنے لگی، کچھ اس طرح کہ



اس کے لونیک (Low Neck) بلاؤز سے اس کے شباب کے پیمانے تا تک جھانک کرنے لگے۔ میں نے غصہ بھر سے کام لیتے ہوئے بائیں جانب سوئمنگ پول میں تیرتی ہوئی کشتی پر نظریں جمائیں اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا:

”چھوڑو ریٹا۔ آج ہوش میں رہ کر ماحول کی خوبصورتی اور خوش باش بے فکرے مہمانوں کے ساتھ گفتگو کا لطف اٹھاؤ۔ شراب تو روزانہ ہی پیتی ہو جو تمہیں مدہوش کر دیتی ہوگی۔“

”چلو جیسے تمہاری خوشی۔“ وہ خفیف ہو کر مسکرانے لگی ”ویسے ایک آدھ جام میں مدہوش نہیں ہوتی۔ وہ تو تمہاری قربت تھی جس نے مجھے آپ سے باہر کر دیا تھا“ وہ گزشتہ شب وصال کو یاد کرنے لگی۔

میں نے اس موضوع سے گریز کی راہ اپنائی، ورنہ وہ انگریزی بی بی تو (By Hook or Crook) مجھے گھیرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے اٹھتے ہوئے کہا:

”میں معذرت خواہ ہوں ریٹا۔۔۔۔۔ مجھے اپنے ایک کاروباری شریک سے ملنے جانا ہے۔“

”کب لوٹو گے؟ میں تمہارا انتظار کروں؟ کس کمرے میں ٹھہرے ہو۔۔۔۔۔؟“ اس نے ایک ساتھ کئی سوال کئے۔ وہ میرے رویے سے کسی قدر مایوس اور حیران تھی۔

”کل سیمینار میں ملیں گے۔۔۔۔۔“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور وہاں سے چلا آیا۔

☆.....☆.....☆

سیمینار تین روز جاری رہا، مگر ریٹا سے ملاقات نہ ہوئی۔ میں نے دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھی۔ وہ خفا ہو گئی ہوگی۔ ویسے بھی وہ عورتوں کی اس قبیل سے تعلق رکھتی تھی جو۔۔۔۔۔ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔۔۔۔۔ کے مقولے پر عمل کرتی ہیں۔

سیمینار کے شرکاء کے لئے سرکاری طور پر اہرام مصر کی سیر کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس عجائب گھر بھی لے جایا گیا جہاں فرعونوں کی مسمیاں، پیپرس اور سنگی سلوں پر لکھے ہوئے مخطوطات، تصویری زبان کے نمونے، مجسمے، ظروف، انواع و اقسام کے ہتھیار اور زیورات رکھے گئے ہیں۔ زمانہ قدیم کے مصریوں کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد عالم بالا میں ارواح کو دوبارہ ان کا دنیاوی جسم لوٹایا جاتا ہے۔ اسی سبب وہ اسے حنوط کر کے اپنے تئیں محفوظ کرتے تھے اور میوں کی شکل میں دفناتے تھے اور اس کے ساتھ ضرورت کی اشیاء، زرو جواہر وغیرہ بھی دفن کرتے تھے۔ چونکہ فرعونوں کے ساتھ قیمتی اشیاء اور زرو جواہر کا بیش بہا خزانہ مدفون ہوتا تھا اس لئے جس ہرم میں انہیں دفن کرتے وہ لٹیروں کی دست برد سے محفوظ نہ رہتا۔ اسی لوٹ مار کے تدارک کے لئے پیچیدہ ڈیزائن کے حامل اہرام بنائے جانے لگے جن میں عجیب بھول بھلیاں اور پیچیدہ راستے رکھے جاتے۔ بہر کیف فرعونوں کی میوں کا نظارہ میرے لئے مقام عبرت

ہی ثابت ہوا اور مجھے کورس کی کتابوں میں پڑھا ہوا ایک بھولا بسرا شعر یاد آنے لگا۔

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا  
مٹے نامیوں کے نشان کیسے کیسے

بطور خاص وہ فرعون جس نے پیغمبر خدا حضرت موسیٰ علیہ سلام کے سامنے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اس آیت کی عملی تفسیر بنابد ہیئت ممی کی شکل میں شیشے کے ایک شوکیس میں پڑا تھا۔

”ہم تمہاری لاش کو آئندہ زمانوں کے لئے محفوظ کر دیں گے تاکہ دیکھنے والے عبرت پکڑیں“ سیمینار اختتام پذیر ہوا تو شام کی سعودی ایئر لائن کی فلائٹ سے میں نے مکہ کا قصہ کیا، جہاں رب کے حضور حاضر ہو کر میں تجدید ایمان کرنا چاہتا اور عمرہ کی ادائیگی کرنا چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

اپنی کہانی کی اختتامی سطور لکھتے ہوئے میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں آج کراچی میں ایک کامیاب ٹورازم ایجنسی چلا رہا ہوں اور ایک باشرع و باعمل مسلمان کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میری تایا زاد کزن ناہید میری بیوی ہے اور میرے دو بچوں کی ماں ہے۔ مجھ سے بے پناہ محبت کرنے والی اس مکمل مشرقی لڑکی نے اتنے برس صرف میرے انتظار میں گزرادیئے تھے اور کئی اچھے رشتے ٹھکرا دیئے تھے۔ میں جو نیلم (چپون) کی خاطر اسے پائے حقارت سے ٹھکرا کر چلا گیا تھا، جب اس کا اخلاص، محبت، مہر و وفا اور سعادت مندی دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں، ہم مرد کتنے پاگل ہوتے ہیں۔ اپنی ہیرے جیسی لڑکیاں ٹھکرا کر رولڈ گولڈ حسیناؤں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ہماری پاکستانی لڑکیوں جیسی معصوم، پیاری اور وفادار لڑکیاں دنیا میں کہیں نہیں ملتیں۔ یہ سچ ہے۔ جنہوں نے مجھ جیسے تجربات کئے ہیں، وہی میری بات کی سچائی کی تائید کریں گے۔

مومنہ دلی میں ہے اور میری منہ بولی بہن بن چکی ہے۔ میں نے اسے اپنی مجبوری بتادی تھی کہ اپنی کزن ناہید کو بیوی بنا کر اسے اس کی وفا کا صلہ دینا چاہتا ہوں۔ گزشتہ برس خالہ کلثوم بی بی نے مومنہ کی شادی اپنے ایک رشتہ دار سے کر دی ہے جو دلی میں قالینوں کا کاروبار کرتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہی ہے اور ایک ننھی بچی کی ماں بن چکی ہے۔

میں نے چپون کے ساتھ گزرے ہوئے روز و شب بھلا دینے کی بار بار کوشش کی ہے مگر جب آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو چمکاؤں سے مشابہہ اس نشان پہ نگاہ پڑ جاتی ہے جو اس کے وصل کی شہادت بن کر میری پیشانی پر مستقل ثبت ہو کر رہ گیا ہے۔ خدا کرے میری پیشانی پر ابھرنے والے سجدوں کے نشان اس منحوس نشان پر غالب آجائیں۔

(ختم شد)